نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جلتی ہوئی لہولہان وادی کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا خوبصورت ناول

وادی لہو رنگ

طارق اسماعیل ساگر

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

نوٹ:

پیش لفظ

"وادی لہورنگ" کی حکایت خونچکاں کو بے نقاب کرنے کے لیے...... میں نے جب بھی قلم سنبھالا...... ضمیر نے دست سوال بن کر شیشہ دل پر ایسی ضرب لگائی کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ذہن سلگتے ہوئے سوالات کی آماجگاہ بن جاتا...... کوئی نادیدہ طاقت مجھ سے پوچھتی تھی...... کیا تم اپنے آئینہ دل میں کشمیر کے مکمل خدوخال دیکھ سکتے ہو؟...... تمہاری فگار انگلیوں میں اتنی سکت ہے کہ کشمیر کے سینے میں سلگتی کہانیاں صفحہ قرطاس پر بکھیر سکو؟ ...... اس کے درختوں کی ہریالیوں میں سرسراتی ہواؤں کے نوحے تمہاری سماعت کے اختیار میں ہیں؟ اور کیا تم...... مظلوموں اور نارساؤں کی آہوں اور آنسوؤں کو یکجا کر کے اپنے لیے نشان منزل تلاش کر لو گے؟

ان سوالات کے جوابات کھوجنے کے لیے جب بھی میں تاریخ کا سینہ ٹٹولتا، یہاں مجھے مصلحتوں اور وسوسوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ میں ہار کر قلم رکھ دیتا...... لیکن میری فطرت میں چھپا سپاہی مجھے کسی پل چین نہ لینے دیتا۔ وقت کی لہروں پر ہلکورے لیتا میرا ذہن تیرہ صدیاں پیچھے لوٹتا اور مجھے اٹلانٹک کے ساحلوں پر لے جاتا...... جہاں حضرت عقبہ بن نافعؓ کا لشکر رکتا ہے...... اور وہ اٹلانٹک کی سرکش موجوں کو ہوا میں اچھال کر کہتے ہیں:

"رب کعبہ کی قسم!

اگر میرے راستے میں یہ سرکش موجیں نہ آ جاتیں تو خدا کی وحدانیت کا پرچم میں یورپ کے میدانوں میں لہرا کر دم لیتا۔"

طارق بن زیاد کے وہ سوار چلے آتے جن کا امیر لشکر اپنے جہاز جلا کر اسپین کو اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روندتا ہوا فرانس کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔

میرے ذہنی افق پر خیرالدین باربروسہ کا عزم کوندنے لگتا، جس نے سمندروں کی طغیانیوں کو زیر کر کے یورپ اور افریقہ کے ساحلوں کو کھنگال ڈالا تھا...... اور آخر تاریخ کا سفر طے کرتا میرا تخیل مجھے اس برصغیر میں گھسیٹ لاتا جہاں محمد بن قاسم نے ایک مسلمان زادی کی پکار کا مول چکایا تھا...... اور جہاں سلطان محمود غزنوی پہاڑوں سے نکل کر سومنات کے غرور کو روندتا ہوا ہندوستان کے کلیجے میں اتر گیا تھا...... ان سربلندوں کے سامنے "ہر ہر مہادیو" اور "بجرنگ بلی" کے نعرے دم توڑتے دکھائی دیتے تھے۔

"وادی لہورنگ" وہی کہانی ہے۔

اپنے خون جگر سے لکھی یہ کہانی اس لیے آپ تک لے آیا ہوں کہ اب بھی اس خاکستر میں کچھ چنگاریاں سلگتی دکھائی پڑتی ہیں۔

اللہ! کوئی بھڑکتی ہوئی چنگاری شعلے کا روپ دھار لے اور ان آنکھوں کو ۔ شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو

کی تعبیر دیکھنے کو مل جائے۔

میری یہ کتاب ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز سے شائع ہو رہی ہے جس کے بعد امید ہے کہ آپ کی وہ شکایات جو آپ میری کتابوں کیلئے استعمال ہونے والے کاغذ، جزبندی اور پروف ریڈنگ سے متعلق کیا کرتے ہیں جس طرح ہر قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب معنوی ہی نہیں، صوری طور پر بھی خوبصورت دکھائی دے۔ مصنف بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق جب پیکر میں ڈھلے تو اتنی ہی خوبصورت دکھائی دے جیسا کہ اس نے سوچا اور لکھا۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ قاری اور کتاب کا رشتہ ختم ہو جائے اس کیلئے بہترین ہتھیار کاغذ کی گرانی ہے جسے ہر حکومت نے کلہاڑے کی طرح استعمال کیا ہے۔ دنیا کے جاہل ترین معاشروں میں بھی کتاب کیلئے استعمال ہونے والے کاغذ پر حکومتیں رعایت دیتی ہیں ہمارے ہاں الٹی گنگا بہتی ہے اور زمانے بھر کے ٹیکس کاغذ پر تھوپ کر اُسے اتنا مہنگا اور نایاب کر دیا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ان حالات میں جو پبلشرز کتاب خوبصورت انداز میں آپ تک پہنچاتے ہیں، بلاشبہ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز بھی ان میں شامل ہے۔ میری تمام پرانی کتابیں اسی ادارے سے ملیں گی اور جلد ہی انشاء اللہ نئی کتابیں بھی۔

آپ سے درخواست ہے کہ میری کتابیں طلب کرتے ہوئے ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز کا نام ضرور دیکھ لیا کریں تاکہ آپ تک معیاری کتاب پہنچے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

فقر کی جب سان پر چڑھتی ہے تیغ خودی
اِک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

خفیہ مشن

پندرہ مئی 1965ء کی ایک شام.......

جیپ انہوں نے گاؤں سے قریباً ایک فرلانگ دور ہی روک دی تھی۔

......سورج کا آتشیں گولہ ان کے عقب میں بہتی اس نہر کنارے لگے درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا جو ایک طرح اس گاؤں کی حد بھی تھی ......انہوں نے دس میل کچا راستہ طے کیا تھا۔ کمپنی ہیڈ کوارٹر سے ان کی روانگی اتنی اچانک تھی کہ صوبے دار حکم داد چکرا کر رہ گیا تھا۔ کیپٹن صاحب بغیر اطلاع اچانک آئے اور انہوں نے کوئی تمہید باندھے بغیر اسے جیپ تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

انہوں نے ڈرائیور کو بھی ساتھ لینا مناسب نہ سمجھا اور اس وقت تو صوبے دار حکم داد حیران ہی رہ گیا جب کیپٹن نے اسے سول کپڑے پہننے کے لئے کہا۔

''ہم لوگ آرمی کی جیپ بھی استعمال نہیں کریں گے۔'' انہوں نے کمرے کے باہر کھڑے کہا اور قبل اس کے کہ صوبیدار حکم داد ان سے سوالات کا سلسلہ شروع کرے، وہ اندر داخل ہو گئے تھے۔

صوبیدار نے رینجرز کی جیپ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی تھی۔ اب یہاں وہ پرائیویٹ جیپ حاصل کرنے سے تو رہا، احتیاطاً اس نے ٹینکی پوری بھروالی تھی کیونکہ ابھی تک اسے اگلی منزل کا علم نہیں تھا۔

صوبیدار حکم داد پچھلے دو سال سے اسی سرحدی علاقے میں مختلف مقامات پر انٹیلی جنس ڈیوٹی کر رہا تھا۔ وہ ایف آئی یو سے وابستہ تھا اور اس علاقے کے چپے چپے پر اس کی نظر تھی۔ یہاں کے مقامی بدمعاش، اسمگلر، چور، خطرناک اور بے ضرر ہر طرح کے لوگوں سے اسے آگاہی تھی......اس کی سروس کا زیادہ تر حصہ انٹیلی جنس ڈیوٹی ہی کی نذر رہا تھا۔ صوبیدار حکم داد کی جہاندیدہ نظروں نے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے پیش آنے والی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیا تھا اور اس کے تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا ہے۔

آج صبح جب وہ اگلی یونٹوں کے دورے سے واپس آیا تو کمپنی ہیڈ کوارٹر میں ایک پیغام اس کا منتظر تھا...... ''جنرل ہیڈ کوارٹرز سے اس کی خصوصی یونٹ کے ایک افسر اہم مشن پر آ رہے ہیں۔'' پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ اچانک جی ایچ کیو والوں کو کیا سوجھی؟ اشارتاً بھی کوئی پیشگی اطلاع اسے نہیں ملی تھی اور جو کیپٹن صاحب جی ایچ کیو سے آئے، وہ بھی کچھ کم پراسرار ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اگر ان کا شناختی کارڈ ان کے پاس نہ ہوتا تو صوبیدار حکم داد شاید انہیں گرفتار کر لیتا......ان کی آمد کچھ ایسی ہی تھی۔

......☆☆☆......

جیپ کے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے وہ خاصا چوکس ان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کی آدھی زندگی کپتانوں اور میجروں سے ملتے ملاتے ہی گزری تھی، لیکن اس چھریرے بدن کے سانولے رنگ والے نوجوان کیپٹن میں اسے کوئی ایسی بات بات ضرور دکھائی دی تھی جس کی وضاحت وہ کر نہ پایا۔ جب بھی اس نے ذہن پر زور دیا وہاں سے ایک ہی جواب ملا'' ہے کوئی خاص بات اس شخص میں'' اور بس۔

''خدا جانے یہ مجھے اندھیرے میں رکھ کر کہاں لے جائیں گے؟'' اس نے سوچا۔

کیپٹن اسے جیپ ہی میں انتظار کرنے کا کہہ کر وائرلیس روم میں جا گھسے۔ انتظار کی کوفت سے بچنے کیلئے اس نے کئی بار چاہا کہ سگریٹ سلگا لے، لیکن ہر دفعہ اس کا ہاتھ جیب کے نزدیک پہنچ کر واپس آ جاتا، حالانکہ وہ سول کپڑوں میں تھا اور یوں بھی اس کے فرائض کی نوعیت ایسی تھی کہ اگر وہ اپنے افسر کے سامنے سگریٹ سلگا بھی لیتا تو کوئی ایسی معیوب بات نہ ہوتی، لیکن نہ جانے کیوں وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکا۔ اس وقت بھی جب وہ بمشکل اپنا ہاتھ جیب کے اندر لے گیا تھا، اچانک اس کی نظر سامنے دروازے پر پڑی جہاں سے کیپٹن صاحب ایک اور کیپٹن کے ساتھ گپ شپ کرتے برآمد ہوئے تھے۔ بجلی کی سی پھرتی سے اس کا ہاتھ واپس اپنی جگہ پر آ گیا اور وہ چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔

''کتنی دیر سے اس علاقے میں ہو؟'' کیپٹن نے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کو روانگی کا سگنل دے دیا۔

''سر! پچھلے دو سال سے اسی علاقے کے گرد اگرد گھوم پھر رہا ہوں۔'' اس نے اپنی آواز کو حتی الوسع پرسکون بنائے رکھا۔

''ہوں!''

......ایک لمبی ''ہوں'' کیپٹن کے منہ سے خارج ہوئی۔ ''ہم نورکوٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ مجھے شیرو سے ملنا ہے۔'' انہوں نے دونوں باتیں ایک ساتھ ہی کہہ ڈالیں۔

''شیرو سے؟'' صوبیدار کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... وہ نورکوٹ اور شیرو کے نام پر یوں بدکا تھا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' اس کی حرکت کو کیپٹن صاحب نے نوٹ کیا تھا۔

''وہ تو سر............'' وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر چپ رہا۔

''کیا ہے وہ؟'' کیپٹن نے پہلی مرتبہ اس کی طرف گردن گھما کر دیکھا تھا۔

''وہ ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے جناب۔'' بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

''ونڈرفل! تو آپ نے ملاقات سے پہلے فیصلہ بھی کر لیا۔'' کیپٹن کے لہجے میں چھپے طنز کو صوبیدار حکم داد محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''جناب والا! میں نے دو تین مرتبہ کوشش کی کہ اسے کسی بھی طرح راہ راست پر لاؤں، لیکن وہ نرمی یا سختی کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے جناب۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم اسے آج تک رنگے ہاتھوں پکڑ نہیں سکے۔ بڑی مشکل سے پچھلے مہینے ہم نے خصوصی ناکے لگا کر اس کا مال پکڑ لیا جو وہ جموں سے ہانک کر لا رہا تھا...... دو چار موٹی تگڑی گائیں، لیکن وہ...... ہر بار کی طرح نکل گیا۔''

صوبیدار بولتا بولتا خود ہی چپ ہو گیا۔ اس نے دیکھا...... کیپٹن اس کی باتوں پر کان ہی نہیں دھر رہے۔ وہ تو جیپ کی ونڈ اسکرین پر نظریں

جمائے کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔

''آج کل راستوں کی کیا پوزیشن ہے؟'' انہوں نے اچانک بالکل الگ سی بات پوچھ لی۔

''ڈھلتے چاند کی راتیں ہیں جناب۔ اس کے باوجود کسی ایجنٹ نے پچھلے دس پندرہ دنوں سے اس طرف سے ''لانچ'' کرنے کی ہمت نہیں کی۔''

''کیوں؟'' کیپٹن نے بظاہر حیرت سے پوچھا۔

''کیا عرض کروں سر! یہ تو بہت اچھا علاقہ تھا۔ ہمارے لوگ اس طرف سے تالیاں بجاتے ہوئے سرحد عبور کر جاتے تھے، لیکن برسات کی وجہ سے دوسری طرف چونکہ نالے اور ندیاں طغیانی پر ہیں، اس لیے تمام مویشی چور کمبخت اس طرف آن مرے ہیں۔ شیرو ہی کو لیجئے، ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ کبھی بھول کر بھی اس طرف کا رخ کرے گا، لیکن مجھے تو یقین ہی نہیں آیا جب امریک چک کی پوسٹ سے اطلاع ملی کہ کھوجی نے وہاں سے کھرا اٹھایا ہے۔''

''کہاں تک گیا تھا کھرا؟''

''نورکوٹ کے باہر والی ندی کے پاس ختم ہو گیا۔''

''چونکہ وہ نورکوٹ والی ندی کے پاس آکر ختم ہوا، اس لیے وہ شیرو ہی کا کھرا ہوگا۔'' کیپٹن صاحب نے اس کا تمسخر ہی تو اڑایا تھا۔

''جناب والا'' صوبیدار نے محسوس کیا کہ اس کی آواز کچھ بلند ہو رہی ہے۔ فوراً اس نے خود کو نارمل کیا۔ بالآخر وہ فوجی تھا۔ ''اس علاقے کے بدمعاشوں کے کھرے یہاں کے کھوجی آنکھیں بند کر کے پہچان لیتے ہیں اور شیرو کی تو بات ہی اور ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' کیپٹن نے خاموش ہو کر نظریں دوبارہ ونڈ اسکرین پر جما دیں۔

......☆☆☆......

ندی کنارے پہنچنے تک کیپٹن صاحب نے باتوں باتوں میں اس سے اس علاقے کے چپے چپے سے متعلق معلومات حاصل کر لی تھیں۔ محفوظ راستے، رینجرز اور انڈین بارڈر سکیورٹی فورسز کے ناکے، اسپیشل ناکے، اسمگلروں اور سرحد کے آر پار چوریاں کرنے والوں کے راستے اور سرحد کے وہ مقامات جو نقل و حرکت کیلئے محفوظ تو تھے، لیکن انٹیلی جنس کی خوش قسمتی کی وجہ سے ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے تھے۔

اصل میں صوبیدار حکم داد کی کارگزاری یہی تھی کہ اس نے ایسے کتنے راستے ابھی تک تلاش کیے ہیں۔ درحقیقت وہ جانتا تھا کہ جن راستوں سے جرائم پیشہ افراد کا آنا جانا شروع ہو جائے، ان سے کسی ایجنٹ کو سرحد پار کروانا کتنا خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

''صوبیدار صاحب!'' ندی کنارے جیپ کھڑی کر کے جب وہ لوگ نیچے اترے تو کیپٹن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اچانک اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''جتنی ضرورت آج اس ملک کو شیرو جیسے بدمعاشوں کی ہے، اتنی آج سے پہلے شاید کبھی نہیں تھی۔'' کیپٹن کے لہجے نے صوبیدار حکم داد کو چونکا دیا۔ پھر ساری بات آپ ہی آپ اس کی سمجھ میں آ گئی۔

......☆☆☆......

جیپ انہوں نے ندی کے پار ہی کھڑی کر دی تھی اور اب وہ چھوٹے سے پل کو پیدل عبور کرنے کے بعد نور کوٹ کی طرف جا رہے تھے۔

......کیپٹن کی متجسس نگاہیں چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں، لیکن وہ دونوں اس پندرہ سالہ لڑکے کو نہ دیکھ سکے جو جیپ رکتے ہی بڑی تیزی سے گاؤں کی طرف پلٹا تھا اور ابھی اس کی بکریاں ندی کنارے پانی ہی پی رہی تھیں، لیکن وہ نور کوٹ پہنچ چکا تھا۔

گاؤں کے ایک کونے میں بنے ''چوپال'' میں بیٹھے شیر و اور اس کے ساتھیوں نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی۔''چارہ کر جا شیر و چاچا۔ میرا خیال ہے کرمی کو انہوں نے اقبالی کروالیا ہے۔''

......ایک سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے نے جو پستول کھولے اس کی نالی میں ایک آنکھ بند کر کے جھانک رہا تھا، درمیانی عمر کے اس آدمی کو مخاطب کیا جو حقے کی نے منہ میں لیے بظاہر ان سب سے الگ تھلگ اور سینئر نظر آ رہا تھا...... یہ شیرو تھا۔

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا چاچا کہ ٹھٹھی والوں پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔ بڑے کچے لوگ ہیں یہ۔ میرے باپ کو ٹھٹھی والوں نے مروا دیا تھا چاچا۔ وہ اکیلا تین چار پکٹوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا لیکن اس روز......'' اسی نوجوان نے پستول بند کر کے اپنی دھوتی کی ''ڈب'' میں چھپالیا۔

''کتنے آدمی تھے وہ؟'' شیرو نے اس کی بات پر کان دھرے بغیر اپنے مخبر ''عیالی'' (بھیڑ بکریاں چرانے والا) کی طرف دیکھا۔

''دو ہی نظر آئے تھے مجھے چاچا۔''

شیرو کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ عیالی کو اس کی آنکھیں اپنے بدن میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں، وہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔

''تو نے پہچانا کسی کو؟'' شیرو نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر حقے کا کش لیا تو اسے کچھ سکون نصیب ہوا۔

''ایک تو وہی سکیورٹی والا صوبیدار ہے چاچا جو پرسوں آیا تھا اور دوسرا اجنبی ہے۔ اس علاقے میں اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''کوئی ہتھیار؟''

''نہیں چاچا۔ بظاہر تو کچھ نظر نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے جا تو، جا شاباش۔'' شیرو کی بات سنتے ہی وہ لوٹ گیا۔

ڈیرے والے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق تو اب تک شیرو کو یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا، لیکن وہ یوں اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے اس کی ملاقات کو سکیورٹی والے نہیں بلکہ اس کے انتہائی قریبی رشتے دار آ رہے تھے۔

''گھوڑی تیار ہے چاچا شیرو۔'' ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکے نے اندر داخل ہوتے ہوئے اطلاع دی۔ وہ مخبر کی بات سنتے ہی باہر نکل گیا تھا۔

''اسے باندھ دے پتر۔ تم لوگ بھی جاؤ۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔'' اس نے اپنے ارد گرد بیٹھے لوگوں سے کہا۔

''پر چاچا...........'' پستول والے نوجوان نے کچھ کہنا چاہا۔

''خان محمد پتر! بڑوں کی بات میں مداخلت نہیں کیا کرتے۔'' شیرو نے اسے بڑی شفقت سے کہا۔ دوسرے ہی لمحے ڈیرہ خالی ہو چکا تھا۔

......☆☆☆......

کمرے میں صوبیدار حکم داد پہلے داخل ہوا، کیپٹن باہر کھڑا رہا۔ اس کی عقابی نظریں وہاں موجود کسی بھی ممکنہ مداخلت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''آؤ جی صوبیدار صاحب، جی آیاں نوں۔'' شیرو نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ صوبیدار نے بادل نخواستہ اس سے ہاتھ ملایا۔ اگر کیپٹن نے راستے میں اسے بریفنگ نہ کی ہوتی تو وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے پوری قوت سے شیرو کے منہ پر ٹھوکر رسید کرتا۔ حکم داد بے بسی سے صرف ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

''گرفتار کرنے آئے ہو؟'' شیرو نے اگلا سوال داغا۔

''نہیں شیرو۔ ہم تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے۔'' اس کے سوال کا جواب صوبیدار کے بجائے کیپٹن نے دیا جو صوبیدار کے بعد اندر داخل ہوا تھا۔

کیپٹن پر نظر پڑتے ہی شیرو یوں بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا جیسے طاقت ور اسپرنگ نے اسے فضا میں اچھال دیا ہو۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر کسی میکانکی عمل کے تحت اس کے بازو پھیل گئے۔

''شرفو!'' اس کے حلق سے نکلنے والی آواز کسی کربناک چیخ سے مشابہ تھی۔

''شیرو'' کیپٹن اشرف خان بانہیں پھیلا کر اس سے لپٹ گیا۔

دونوں نے اپنے اپنے جذبات پر قابو پانے کیلئے ایک دوسرے سے زیادہ ضبط کا مظاہرہ کیا تھا، پھر بھی دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

شیرو نے کیپٹن اشرف خان کو الگ کیا اور کچھ کہنا چاہا، لیکن اس کے رندھے ہوئے گلے سے بمشکل ''اشرف خان'' نکلا اور دوبارہ اس نے کیپٹن کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ صوبیدار حیرت سے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس ملاپ سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

صوبیدار نے محسوس کیا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں، لیکن کہہ نہیں پاتے۔ شیرو کے وہ ساتھی جو چند منٹ پہلے یہاں سے چلے گئے تھے اب واپس آ گئے تھے اور سبھی ''مہمانوں'' کی خدمت میں جتے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے دودھ کے گلاس رکھے ہوئے تھے، لیکن صوبیدار حکم داد واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا کہ دونوں اس دسترخوان پر موجود ہی نہیں ہیں...... وہ کسی اور ہی عالم کے مکین بنے ہوئے تھے۔

یوں بھی وہ کسی طور شیرو کے دل میں نہ جھانک سکتا تھا جس کی نظریں اشرف خان کے چہرے پر گڑی تھیں اور جس کا ذہن پونچھ کے کوچہ و بازار میں بھٹک رہا تھا۔

......اس پونچھ میں جہاں نہ کوئی کیپٹن اشرف رہتا تھا اور نہ ہی شیرو ڈکیت۔ وہاں تو دو جگری دوست قیام پذیر تھے۔

ایک جونا در خان کا بیٹا تھا...... شرفو کہلاتا اور دوسرا شیرو...... دونوں یک جان و دو قالب تھے۔

پھر...... ایک روز اس کا ساتھی اس سے بچھڑ گیا اور آج پھر اچانک وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا...... وہ کیسے یہاں آیا؟ وہ کیوں یہاں پہنچا؟...... یہی کچھ سوچتا وہ ماضی کے ان اوراق میں گم ہو گیا جہاں جہاں اس کا اور شرفو کا نام ساتھ ساتھ آتا تھا......!

اور آخر اس کی انگلیاں ٹٹولتے ٹٹولتے اس صفحہ تک آ پہنچیں جس کا عنوان 1947ء سے شروع ہوتا تھا۔

یہاں آ کر وہ رک گیا اور بکھرے ہوئے نقوش یکجا کرنے لگا۔

ماضی کے جھروکوں سے

27 اگست 1947ء کی ایک شام:

پاکستان کے قیام کو آج 13 دن ہوئے تھے۔ 3 جون 1947ء کو انگریز نے دو مملکتوں کے قیام کا جو اعلان کیا تھا، اسے عملی جامہ پہنا دیا گیا تھا۔ دولت مشترکہ کی دو آزاد اور خود مختار مملکتیں دنیا کے نقشے پر ابھری تھیں، لیکن ابھی تک دونوں میں سے کوئی مملکت بھی اپنی عملداری رائج نہیں کر سکی تھی...... نظم و نسق کا یہ عالم کہ جنگل کے قانون کا سا سماں تھا۔

40 کروڑ آبادی اور 177438 مربع میل رقبے پر پھیلے ہندوستان کی 568 ریاستیں، دونوں میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ کچھ نے فیصلہ کر لیا تھا اور کچھ ابھی سوچ رہی تھیں۔ بعض ریاستوں کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ ان کے فیصلے محض رسمی حیثیت رکھتے تھے۔ انہی میں سے ریاست جموں و کشمیر بھی تھی جس کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پچھتر فیصد مسلمان تھے، لیکن جس کی قسمت کا فیصلہ بدقسمتی سے ایک ہندو ڈوگرہ مہاراجے کو کرنا تھا جو ابھی تک گومگو کے عالم میں تھا۔

اس ریاست کو صرف اسی لیے اہمیت حاصل نہیں تھی کہ یہاں سے جو دریا پھوٹتے تھے، وہ پاکستان سے گزرتے تھے بلکہ اس کی زیادہ اہمیت اس لیے تھی کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان اور بھارت دونوں سے ملحق تھی جب کہ شمال میں اس کے اور روس کے درمیان افغانستان کا علاقہ تھا اور اس کی سرحد چین سے بھی مشترک تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں کے کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس ریاست کا الحاق کوئی نزاعی مسئلہ بن جائے گا کیوں کہ یہاں کی پچھتر فیصد آبادی مسلمان تھی اور بھارت کے ساتھ اس کا کوئی زمینی اور دریائی راستہ بھی نہیں تھا...... اس طرح اقتصادی طور پر اس کا بھارت سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔

اس حقیقت کا احساس ان انگریز بازی گروں کو بھی تھا...... اس لیے ریڈ کلف ایوارڈ نے جب دونوں ملکوں کی حد بندی کا اعلان کیا تو برصغیر کے مسلمانوں کو زبردست ذہنی دھچکا لگا۔ انہوں نے سنا کہ پاکستان سے ملحق علاقے کا وہ حصہ بھارت کو دے دیا گیا ہے جس میں سے ایک سڑک کشمیر اور بھارت کو ملاتی تھی...... یہ ایک کچا راستہ تھا جسے بعد میں پختہ کیا جا سکتا تھا۔

اس وقت تک کشمیر کا رابطہ صرف دو سڑکوں کے ذریعے دنیا سے قائم تھا اور دونوں اس علاقے میں سے گزرتی تھیں جو اصولی طور پر پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔ اب ریڈ کلف ایوارڈ کی مہربانیوں کے طفیل جموں سے کھٹوعہ تک جانے والا غیر پختہ راستہ بھارت کے حصے میں آ گیا تھا۔

کشمیر اور بھارت کے درمیان الحاق کی نیو دراصل انگریز بہادر نے ڈالی تھی اور روانگی سے پہلے اپنی فطرت کے مطابق برصغیر ہندوستان

کے لیے ایسا مسئلہ پیدا کر گیا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کی دیرینہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کیلئے کافی تھا۔

مہاراجہ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ریاست کی دونوں بڑی جماعتوں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر جیلوں میں بند تھے، اس لیے کم از کم اس مسئلے پر ریاست کے اندر کوئی شورش پیدا نہیں ہوسکتی تھی، لیکن مہاراجہ پاکستان کے ساتھ صرف معاہدہ استقرار Stanstil Agreement کر کے بظاہر چوکس، لیکن آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر جم کر بیٹھ رہا، اس بات سے بالکل بے پروا کہ یہ پہاڑ اب کسی بھی دم پھٹنے اور اسے اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔

......☆☆☆......

راولاکوٹ اور باغ کے سدھن کشمیری کہ دلیری جن کی روایت اور جان فروشی جن کے خون میں رچی بسی تھی، بڑی بے چینی سے نظریں اٹھائے مہاراجہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیڈروں نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ دال میں ضرور کالا ہے اور مہاراجہ کی نیت میں فتور آچکا ہے ورنہ اب تک وہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر چکا ہوتا۔

1832ء میں ان کے اسلاف نے آزادی کا جو نعرہ بلند کیا تھا اور 1930ء میں جس طرح باقاعدہ اسمبلی کے قیام کی جدوجہد انہوں نے کی تھی، اس کی بازگشت ابھی تک پونچھ کی پہاڑیوں میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ اس قبیلے کے متعلق راجہ کو کبھی کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ نوزائیدہ مملکت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان سے ان کی ہمدردیاں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ 23 اور 25 راگست کو باغ اور راولاکوٹ کے جلسوں میں وہ لوگ پاکستان کے ساتھ اپنی دلی ہمدردیوں کا نعرۂ مستانہ بلند کر چکے تھے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ آزادی کے متوالوں کا ہراول دستہ بن چکے تھے۔

انہوں نے باغ کے جلسہ میں پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا کر چند ہی روز پہلے مہاراجہ کو دہلا دیا تھا۔ ڈوگرہ سپاہیوں کی گولیوں سے اس راہ آزادی میں شہادت پانے کی اولین سعادت بھی انہی کو حاصل ہوئی تھی۔

جب اس قتل عام کی خبر 26 راگست کو راولاکوٹ پہنچی تو آزادی کے متوالوں کے سینوں میں ایک الاؤ دہکنے لگا۔ 28 راگست کو وہ لوگ سدھنوئی کے مقام پر اکٹھے ہوئے جہاں تمام احتیاطیں اور مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر 29 راگست 1947ء کے روز ڈوگرہ افواج سے براہ راست ٹکرانے اور علم بغاوت بلند کرنے کا فیصلہ ہوا اور یہ خبر راتوں رات سارے پونچھ میں پھیل گئی۔ طے یہ پایا کہ پونچھ کی فوجی چھاؤنی سے اس طرف آنے والے دستوں پر گھات لگا کر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ ڈوگروں کو 1832ء اور 1930ء کو بھولا سبق یاد آجائے۔

راولاکوٹ سے تقریباً چھ میل دور پونچھ کی طرف جانے والی سڑک پر دوتھان کے مقام پر موڑ آتا ہے۔ یہاں گھنا جنگل، اونچا نیچا پہاڑی سلسلہ اور ٹیکریاں کسی بھی لشکر کے لیے بہترین جائے پناہ بن سکتی تھیں۔ انڈین آرمی کے ایک سابق کیپٹن کی کمان میں نیشنل گارڈز کے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح دو سو سرفروش رات کے اندھیرے میں چپ چاپ اپنے گھروں سے نکل کر یہاں آن چھپے تھے۔ یہ نیشنل گارڈز بڑی عجلت میں ترتیب پائی تھی...... سدھن قبیلے کے سابق انڈین آرمی کے ملازمین نے انہیں جنگلوں اور پہاڑوں میں خفیہ تربیت دے کر چند ہی مہینوں میں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اب کسی بھی باقاعدہ فوج سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھے۔ ابھی تک انہوں نے اپنی اس طاقت کو خفیہ رکھا ہوا تھا، لیکن اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے ان تربیت یافتہ چھاپہ ماروں کے جوہر آزمانے کیلئے انہیں میدان کارزار میں لے آئیں...... وہ لوگ آج پہلا باقاعدہ معرکہ لڑنے جا

رہے تھے اور اسی معرکے کے نتائج پر کشمیر میں لڑی جانے والی طویل جنگ آزادی کا انحصار تھا...... یہ لوگ آج اپنے جوان خون سے جو تاریخ رقم کرنے جا رہے تھے، اسے آنے والی نسلوں کیلئے مشعل راہ بننا تھا۔

یہ ایسا مجاہدانہ فیصلہ تھا کہ تاریخ حریت پڑھنے والے دنیا بھر کے آزادی پسندوں نے ہمیشہ ان جیالوں کو خراج عقیدت پیش کیا...... ڈوگرہ افواج رائفلوں، مشین گنوں اور اسٹین گنوں سے مسلح تھی جس کا مقابلہ کرنے کے لیے ان مجاہدوں کے پاس صرف ایک ریوالور تھا جو ان کے سردار کو ایک جاپانی بریگیڈیئر نے کبھی بطور تحفہ دیا تھا۔ اس ریوالور کے علاوہ ایک پرائیویٹ رائفل بھی تھی۔ باقی سارے حریت پسند لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح مہاراجہ کی تنخواہ دار مسلح افواج اور ان کے ہمدرد مقامی غداروں کے منتظر تھے۔

جب راولاکوٹ والا دستہ یہاں پہنچا تو انہوں نے ہزاروں غیر مسلح رضا کاروں کو اس طرف آتے دیکھا جو ارد گرد کی پہاڑیوں سے امڈے چلے آ رہے تھے...... آزادی کے ان متوالوں کو ان کے مقامی کمانڈروں نے چاروں اطراف پھیلا دیا اور شمع آزادی کے ان پروانوں نے راتوں رات ہرنہ میرا سے ہجیرہ تک فوجی نقل وحمل کے لیے ندی نالوں پر بنائے ہوئے تمام پل تباہ کر ڈالے۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے اور فوج کی جنگی گزرگاہوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

............☆☆☆............

پونچھ کی پہاڑیوں کے دامن میں بنے چھوٹے سے محلے کے ایک مکان کے کمرے میں دو نو جوان ایک دوسرے سے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک جس کی عمر بیس سال تھی، وہ شیر محمد تھا اور دوسرا پندرہ سولہ سالہ اشرف خان جو عمر میں تو شیرو سے کم تھا، لیکن قد کاٹھ اور جسمانی صحت کے لحاظ سے اس سے بڑا نظر آ رہا تھا۔ شیرو آٹھویں جماعت کے بعد ہی اسکول سے بھاگ گیا تھا۔ پڑھائی اس کے بس کا روگ تھا ہی نہیں، یہ تو اس کی ماں تھی جو زبردستی اسے اسکول بھیجا کرتی تھی۔ شرفو اس کا محلے دار اور عزیز ترین دوست تھا۔ ان کی دوستی کی بنیاد شیرو کے باپ کے باغ میں پڑی تھی جہاں شرفو ایک دفعہ محلے کے شرارتی لڑکوں کے ساتھ سیب چوری کرنے آیا تھا۔

واپسی پر جب وہ اپنے گھر پہنچے تو نہ صرف یہ کہ اس کی قمیص کا پلو سیبوں سے بھرا ہوا تھا بلکہ وہ شیر محمد کی دوستی سے بھی مالا مال ہو چکا تھا۔ دونوں کی عمروں کا فرق ان کی پر خلوص محبت نے مٹا دیا تھا۔

شیر محمد کا والد 1930ء کے فسادات میں شہید ہو گیا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا جو والد کے مرنے کے ڈیڑھ دو سال بعد ہی ہیضے کی وبا میں مر گیا۔ والد سیبوں کا ایک باغ ورثے میں چھوڑ گیا تھا۔ برادری والوں نے اس کی ماں پر بڑا زور دیا کہ دوسری شادی کر لے۔ خود اس کا ایک دیور اپنے بھائی کی امانت کو سینے سے لگانے کے لیے تیار تھا، لیکن شیرو کی ماں نے ایسی چپ سادھی کہ لوگ کہتے کہتے بالآخر چپ کے ہو رہے۔

اس کی امیدوں کا مرکز اب صرف شیرو کی ذات تھی۔ اس کا خاوند اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر فروٹ کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ پونچھ سے پنجاب کی طرف مال لے جایا کرتے تھے۔ اس کی موت کے بعد اس کے بھائیوں نے اپنی بھابی اور بھتیجے کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔

شرفو کا باپ رائل آرمی کا حوالدار تھا۔ اس کا دادا مہاراجہ کی فوج میں ملازم رہا تھا۔ اس کا خاندانی پس منظر فوجی تھا۔ اس کا باپ جولائی 1947ء میں چھٹی پر آیا تو واپس نہ گیا۔ کشمیری حریت پسندوں کی نیشنل گارڈز میں اسے ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ جولائی کے بعد سے وہ روپوش ہو چکا

تھا اور پونچھ کے جنگلوں میں مجاہدین کو تربیت دے رہا تھا۔

''کشمیر یا موت'' یہ تھا وہ نعرہ جو سب سے پہلے ان لوگوں نے پونچھ کی دیواروں پر لکھا ہوا دیکھا۔ یہ نعرہ کشمیریوں کا مقدر بن چکا تھا۔ انہوں نے آزاد کشمیر کے لیے ''باوقار موت'' کی شرط کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا...... پونچھ کے گردونواح میں حریت پسندوں کی خفیہ تربیت بڑی تیزی سے جاری تھی۔ شیرو اور شرفو دونوں کو حوالدار صاحب نے رائفل چلانا سکھا دیا تھا۔

دن کو یا رات کے پچھلے پہر جب بھی ڈوگرہ فوج کے سپاہی ان کے محلوں پر بھگوڑے فوجیوں کی تلاش میں چھاپے مارتے، اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ ان لوگوں نے ایسا نظام ترتیب دے لیا تھا کہ مقامی ہندو آبادی اور غداروں کی مخبری کے باوجود وہ ''اپنے آدمیوں'' کو گرفتاری سے محفوظ رکھتے تھے۔

ابھی تک...... ان دونوں سے مقامی چھاؤنی اور تھانوں میں موجود پولیس کی نفری کی جاسوسی کا کام ہی لیا جا رہا تھا۔ ایک روز انہیں راولا کوٹ کی طرف بڑھنے اور ہجیرہ کے مقام پر مورچہ بند ہو کر گھات لگانے کا حکم ملا۔

ہجیرہ دوتھان سے آگے پونچھ اور راولا کوٹ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں ڈوگرہ فوج نے اپنا کیمپ جما رکھا تھا اور ہجیرہ کے گرد اگرد موجود ''باغیوں'' کی سرکوبی کے لیے عموماً یہیں سے فوجی دستے روانہ کیے جاتے تھے۔ دوتھان پر مورچہ بند نیشنل گارڈز کے کمانڈر نے جو اس علاقے میں دور دور تک پھیلے ہوئے مجاہدین کی کمان کر رہے تھے، حسین خان کو یہ مشن دے کر روانہ کیا تھا کہ وہ پونچھ کی طرف سے آنے والے مجاہدوں کے ساتھ مل کر ہجیرہ کے ڈوگرہ کیمپ کو گھیرے میں لے رکھیں اور جب ڈوگرے گھات میں آئیں تو وہ انہیں تباہ کر دیں۔

رات کا دوسرا پہر تھا جب حسین خان اپنے تین جانبازوں کے ساتھ شہر سے باہر والی پہاڑی پر کھڑا دوتھان کی طرف سے کسی نئے پیغام کا منتظر تھا کہ ایک مجاہد بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا۔

''پونچھ والی سڑک کی طرف سے دو نوجوانوں کے چوری چھپے اس طرف بڑھنے کی اطلاع ملی ہے۔'' اس نے بتایا۔

حسین خان سوچ میں پڑ گیا۔ ''پونچھ سے جن مجاہدوں کو آنا تھا وہ تو کبھی کے آ چکے تھے۔ یہ دونوں کون ہو سکتے ہیں؟'' اس نے سوچا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے جواب طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''ڈوگروں کے جاسوس۔'' ایک ساتھی نے لب کشائی کی۔

''لیکن ابھی ہم صرف اندازہ ہی قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی حتمی رائے نہیں۔'' کمانڈر حسین خان بولا۔ ''یوں بھی ہم ان پر فائر کر کے کوئی مصیبت مول لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تم لوگ ان پر نظر رکھو۔ اگر کوئی لشکران کے تعاقب میں ہے تو انہیں راستے ہی میں روک دو، ورنہ یہاں تک آنے دو۔''

اس کا پیغام سنتے ہی نو وارد دوبارہ اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا۔

............☆☆☆............

شرفو اور شیرو صبح سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔

......روانگی کے وقت شیر محمد کی ماں کا جو حال ہوا تھا، اس کا احساس دونوں کو تھا۔ اس بے چاری نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن جس طرح دل پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے بیٹے کو رخصت کیا تھا، وہ کچھ وہی جانتی تھی۔ اسی طرح ایک روز اس کا شوہر بھی رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی اسی آگ کی نذر کر دے جس کے شعلوں نے اس کے خاوند کو نگل لیا تھا، لیکن اسے رخصت کے وقت اپنے خاوند سے کیا ہوا قول ابھی تک یاد تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے یہ کل کی بات ہو۔

''فاطمہ!'' اس کے مجازی خدا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ''میں جس مشن پر جا رہا ہوں، وہاں سے واپسی کے امکانات بہت کم ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ میری لاش بھی تمہارے حوالے کریں گے یا نہیں؟ لیکن یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ اس سعادت سے محروم رہنا میری بدقسمتی ہوگی۔ فاطمہ! میں دیکھ رہا ہوں ایک وقت آنے والا ہے جب میرے شیرو اور کمالے کو بھی اسی طرح چپ چاپ رات کے اندھیرے میں تم سے رخصت مانگنا ہوگی کیوں کہ ہم نے تو اس لمبی جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ ابھی جانے کتنی نسلوں کی قربانی دینے کے بعد ہم ان گل پوش وادیوں میں آزادی کی صبح طلوع ہوتے دیکھیں گے...... اس وقت ممکن ہے، میں یہاں موجود نہ ہوں، لیکن انہیں رخصت کرتے ہوئے دل میں کوئی ملال نہ لانا۔ اگر تم نے میرے کسی بیٹے کو شہادت کی راہ پر گامزن ہونے سے روکا تو روزِ قیامت میں خدا کی عدالت میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا سرتاج! کبھی نہیں۔''

اس نے اپنا قول بھلایا نہیں تھا۔ کمالے کی موت نے اسے آدھ موا کر دیا تھا۔ خاوند کی شہادت کا زخم جو اس کے کلیجے میں لگا تھا، اس کی حیثیت کا صحیح احساس اسے کمالے کے مرنے کے بعد ہی ہوا تھا۔ لے دے کر اس کے پاس اب صرف شیرو کے علاوہ تھا ہی کیا۔ اس کا دل پھٹ گیا لیکن خاوند کی روح کو شرمسار کرنا اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ اسے اپنی شادی سے اپنے سہاگ کی شہادت تک کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔

اس کا کلیجہ تو کٹ رہا تھا، لیکن اس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے بیٹے سے کہا تھا۔ ''بیٹا! اس راستے پر نکلے ہو تو یہ مت بھولنا کہ تم کس باپ کے بیٹے ہو۔ میدان جنگ میں اگر میری یاد نے تمہیں بزدل بنا دیا تو میں تمہیں اپنی دھاریں نہیں بخشوں گی۔ ہم سدھن ہیں بیٹا۔ مادر وطن کے لیے مر جانا ہی ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے۔''

............☆☆☆............

اصولاً انہیں رات کے پہلے پہر تک ہجیرہ پہنچ جانا چاہیے تھا، لیکن معمول کے تقریباً سبھی راستوں پر ڈوگرہ فوجی گھوم رہے تھے۔ انہیں ہجیرہ پہنچنے تک کئی مرتبہ اصل راستے کو چھوڑ کر اس کے متبادل لمبے اور پیچ دار راستوں پر سفر کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ وہ ریوالور اور گولیاں تھیں جو شیرو نے اپنے لباس میں چھپا رکھی تھیں جبکہ اشرف خان کے پاس صرف ایک کلہاڑی اور ایک لمبا شکاری چاقو تھا۔

وہاں سب کا یہی حال تھا۔ ابھی چند روز پہلے ڈوگرہ مہاراجہ نے بڑی مکاری اور چالاکی سے مقامی غداروں کے ذریعے ان کی پرائیویٹ رائفلیں چھین لی تھیں اور یہ حملہ اصل میں ڈوگرہ فوجیوں سے اسلحہ چھیننے کے لیے ہی کیا جا رہا تھا، تاکہ وہ انہی کے خلاف استعمال میں لایا جا سکے۔

''ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے۔'' اشرف خان نے چلتے چلتے شیر محمد کو مخاطب کیا۔

''ہاں! میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ خدا جانے اب وہ لوگ کہاں ہوں گے؟''

''ہجیرہ آ گیا ہے مگر ابھی تک ہمارا رابطہ ان لوگوں سے کیوں نہیں ہو سکا؟''

ابھی اس نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ اچانک شرفو کے منہ سے نکلا۔ ''وہ دیکھو!''

اس نے اپنے سامنے والی پہاڑی کی ڈھلان سے چپکے کچھ سائے رینگتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ اس سے پہلے کہ شیرو اس سمت دیکھ سکے جس طرف شرفو نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ انہیں اپنے دائیں بائیں سے اچانک ہینڈز اپ کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے دائیں اور بائیں اور آگے پیچھے حریت پسندوں کا گھیرا مکمل ہو چکا تھا۔ پانچ چھ مجاہدوں نے جو سر اور منہ پر کپڑا باندھے اس اندھیرے کا حصہ بنے ہوئے تھے، انہیں گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی رائفل یا پستول نہیں تھا۔ وہ سب ہی کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔

''کون ہو تم؟'' ان میں سے ایک کی گرجدار آواز سنائی دی۔

''میں حوالدار نادر خان کا بیٹا ہوں اور یہ میرا ساتھی شیر محمد۔ ہم لوگ پونچھ سے ہجیرہ جا رہے ہیں۔ ہمیں حسین خان کی کمان میں پہنچنا ہے۔'' شرفو نے نوواردوں کو پہچان لیا تھا۔

حوالدار نادر خان کا نام سنتے ہی ان کے عقب سے ایک مجاہد آگے آیا۔ اس نے چاند کی روشنی میں جھک کر اشرف خان کا چہرہ دیکھا۔

''یہ تو حوالدار صاحب کا بیٹا ہے۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ سب دھیمے پڑ گئے۔

............☆☆☆............

علی الصبح کیپٹن حسین خان، شیر محمد اور تین دیگر مجاہدوں کے ساتھ پونچھ کے مدار پور والے پل کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے جھولنے والا یہ پل توڑ کر اس طرف سے ڈوگرہ فوج کی ممکنہ پیش قدمی روکنے کے لیے پیش بندی کرنی تھی۔

ابھی یہ لوگ ہجیرہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ قریبی دیہات سے کچھ ہندو اور دو تین مسلمان دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے۔ انہوں نے آتے ہی شور بپا کر دیا۔

''باغ میں ڈوگرہ فوج کا پورا بریگیڈ اترا ہے۔ اس نے وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔'' کیپٹن حسین خان ان کی چال میں آ گیا۔ اس نے مدار پور کی طرف جانے کی بجائے لوٹ آنا ہی مناسب جانا اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

یہ لوگ بھاگم بھاگ دوتھان پہنچے اور وہاں کے کماندار کو باغ میں ڈوگرہ فوج کی آمد سے مطلع کیا، لیکن یہاں آ کر انہیں اطلاع ملی کہ یہ افواہ غداروں اور ہندوؤں کے ذریعے اس لیے پھیلائی گئی تھی کہ ڈوگرہ فوج کے وہاں پہنچنے تک مجاہدین کوئی کارروائی نہ کریں۔

............☆☆☆............

اب ان کے لیے صرف دوتھان ہی ایک ایسی جگہ رہ گئی تھی جہاں وہ ڈوگرہ دستوں پر گھات لگا سکتے تھے۔ باقاعدہ فوج کو دست بدست لڑائی کی پوزیشن میں لانا کوئی آسان کام نہیں تھا...... وہ لوگ پیدل مارچ کرتی ہوئی فوج پر تو گھات لگا سکتے تھے، لیکن فوجی ترتیب سے آگے بڑھتی ہوئی ڈوگرہ فوج پر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کے ساتھ حملہ کرنا قطعاً ناممکن تھا۔

پہلا معرکہ

30 اگست 1947ء کے تاریخی لمحات:

ڈوگرہ فوج کی ایک کمپنی ہجیرہ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

......اور اسی طرح کی ایک دوسری کمپنی کے باغ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھنے کی بھی اطلاعات ملیں۔ ان دونوں کمپنیوں کا ملاپ راولا کوٹ پر ہونا تھا جہاں کشمیری مجاہدین جذبہ جہاد سے سرشار ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور لاٹھیاں پکڑے آزادی کشمیر کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

ان کے گرداگرد پھیلی پہاڑیاں پچھلی ڈیڑھ صدی سے ان کے سربفلک ارادوں اور کوہ شکن ولولوں کی گواہی دیتی آرہی تھیں، لیکن......آج ان پر جو سرشاری کی کیفیت طاری تھی، چشم فلک نے اس سے پہلے اس کا نظارہ کب کیا تھا۔

دن کے تقریباً چار بجے کا عمل تھا جب ان لوگوں کو ڈوگرہ فوج کی پلٹن اس طرف آتی دکھائی دی، لیکن توقعات کے بالکل برعکس وہ لوگ مارچ کرتے ہوئے نہیں بلکہ جنگی حالت میں فارمیشن بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ سیکشنز سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں پر پھیل کر پوزیشنیں سنبھال چکی تھیں اور ان کی قائم کردہ پکٹوں کے زیر سایہ باقی جوان ایڈوانس کر رہے تھے۔

اب صورتحال یہ تھی کہ اوپر کی "پکٹوں" کا ایڈوانس ہو رہا تھا اور نیچے سے باقی ماندہ پیدل نفری ان کے زیر سایہ گزر رہی تھی۔ یہ صورتحال خاصی پریشان کن تھی۔ اس کمپنی پر حملہ کرنے کے لیے پہلے "پکٹوں" کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ جبکہ مجاہدین کے پاس نہ تو کوئی مشین گن اور نہ اسٹین گن، وہ بے چارے تو لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔

حسین خان دونوں آنکھوں پر ہتھیلیوں کا کٹورا بنائے بڑی بے بسی سے ایڈوانس کرتی فوج کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسے صرف ایک فکر پریشان کیے ہوئے تھی "اگر آج کامیاب گھات نہ لگی تو حریت پسندوں کا مورال اس بری طرح گرے گا کہ پھر شاید وہ اس شدت سے آزادی کا نعرہ بلند کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکیں۔"

شیر محمد بھی ریوالور ہاتھ میں لیے بڑے بے بسی سے گزرتی ہوئی اس ڈوگرہ فوج کا نظارہ کر رہا تھا......اسے اپنے کمانداروں پر طیش آنے لگا تھا کہ آخر وہ لوگ حملہ کرنے کا حکم کیوں نہیں دے رہے؟ ایک مرتبہ تو اس نے شدت غضب سے مٹھیاں بھینچ کر انہیں پتھر پر مارا بھی تھا۔

مرکزی کماندار کی ذہنی اور جذباتی حالت بھی یہی تھی۔ وہ انڈین آرمی کے سابقہ کیپٹن تھے۔ انہیں علم تھا کہ آج یہاں ہر شخص سر ہتھیلی پر رکھ کر آیا تھا، لیکن اپنے نہتے ساتھیوں کو اس الاؤ کی نذر کرنے سے پہلے انہیں کئی بار سوچنا پڑا۔

اور آخر وہ مبارک ساعت بھی آ گئی جب کماندار کے پستول نے شعلہ اگلا اور ایڈوانس کرتی ڈوگرہ فوج کا ایک جوان الٹ کر پرے جا گرا،

پھر یکے بعد دیگرے پانچ مزید ڈوگرے ٹھنڈے پڑ گئے......اس کے ساتھ ہی مجاہدین آزادی کے فلک شگاف نعروں سے فضا دہل اٹھی۔

ڈوگرہ فوج کو اس گھات کی اطلاع تو تھی، اسی لیے وہ جنگی فارمیشن میں آگے بڑھ رہے تھے، لیکن ابھی تک انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ حملہ آور کس مقام پر حملہ کرنے والے ہیں۔ مجاہدین نے پیدل فوج پر بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے جو انہوں نے پہلے ہی سے تیار کر رکھے تھے۔ ان کے ولولہ انگیز نعروں اور پتھروں کی بوچھاڑ نے ایک مرتبہ تو ڈوگرہ فوج کے قدم اکھاڑ دیئے۔

ہراول دستے کے پیدل جوان جو آگے آگے چل رہے تھے، پہلے ہی حملے میں ڈھیر ہو گئے، لیکن دن کی روشنی ہونے کی وجہ سے "پکٹوں" نے مجاہدین کی پوزیشن نوٹ کر لی تھی......انہوں نے اپنی مشین گنوں کا رخ اس طرف موڑ دیا۔

مجاہدین کے ہاتھ فوراً رک گئے اور وہ اس ناگہانی آفت کے لیے پہلے سے تیار کردہ محفوظ آڑوں میں جا چھپے......انہوں نے پچھلے دو دنوں میں بڑے بڑے پتھروں کو اس ترتیب سے اپنے گرداگرد پھیلا رکھا تھا کہ انہیں ایک طرح سے بنکروں کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ لوگ ان بنکروں میں سر دیئے دشمن کی فائرنگ سے کافی حد تک محفوظ تو ہو گئے......مگر بے بسی سے دشمن کی اندھا دھند فائرنگ کے دھماکے سن رہے تھے۔

..........☆☆☆..........

حسین خان اور شیر محمد ایک دوسرے کے تعاقب میں رینگتے پہاڑی کی ڈھلان سے قریباً چپکے ہوئے اس سمت بڑھ رہے تھے۔

......دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک ریوالور تھا جن کی حیثیت ان دونوں مشین گنوں کے سامنے پلاسٹک کے کھلونوں سے زیادہ ہرگز نہ تھی جن پر وہ قبضہ کرنے جا رہے تھے......وہ لوگ سامنے والی پہاڑی پر ڈوگروں کی بنی ہوئی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع پکٹوں سے آگ اگلتی مشین گنوں کو خاموش کرنے کا عزم لے کر نکلے تھے۔ ایک دوسرے کے تعاقب میں رینگتے وہ اس پہاڑی کے عین نیچے آ گئے تھے جہاں یہ پکٹیں قائم تھیں۔ اب اگر وہ یہاں سے واپس بھی جانا چاہتے تو ممکن نہیں تھا کیوں کہ اب تک ان کا دشمن کی نظروں سے بچے رہنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

حسین خان کو اگر فکر تھی تو اس بات کی شیر محمد کی زندگی کا یہ پہلا باقاعدہ معرکہ ہے۔ اس کی نشانہ بازی پر اسے مکمل اعتماد تھا، لیکن اپنی آدھی فوجی زندگی بیرکوں اور لڑائی کے میدانوں کی بھینٹ چڑھا دینے والا حسین خان سوچ رہا تھا کہ اس نے شیر محمد کو اپنے ساتھ آنے کی اجازت دے کر اچھا نہیں کیا۔ مقابلے پر مجرموں کا کوئی منتشر گروہ نہیں بلکہ مہاراجہ کشمیر کی تربیت یافتہ فوج تھی۔

حسین خان ایک عجیب سی خلش محسوس کر رہا تھا، لیکن اس نے یہ فیصلہ بادل نخواستہ ہی کیا تھا۔ اگر وہ اسے اجازت نہ دیتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ شیرو خود ہی اس طرف روانہ ہو جاتا۔ حسین خان اس کے مرحوم والد کا دوست تھا۔ اس نے شیرو کے والد کا مکمل پرتو اس کے بیٹے میں دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح ایک روز وہ دونوں ڈوگرہ فوج سے نہتے ٹکرا گئے تھے۔ اس کا دوست سب سے آگے ہونے کی وجہ سے فوراً ہی مرتبہ شہادت سے سرفراز ہو گیا تھا جب کہ حسین خان کسی نہ کسی طرح بچ کر آ گیا تھا۔

آج اس کے مرحوم دوست کا بیٹا اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھے اس کے سامنے موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا، لیکن حسین خان نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ وہ آج اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کو خود سے آگے نہ نکلنے دے گا۔ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے شیر محمد کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے

رکنے کا اشارہ کیا۔

''میں دائیں طرف سے چکر کاٹ کر سامنے والی پکٹ پر پیچھے سے حملہ کروں گا۔تم دوسری پکٹ والوں کو نشانے پر رکھنا۔''اس کا جواب سنے بغیر حسین خان نے''اللہ بیلی'' کہا اور تیزی سے دائیں طرف رینگ گیا۔

شیر و کو علم تھا کہ اگر وہ یہیں رکا رہا تو حسین خان کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اگر وہ دائیں پکٹ والے دونوں ڈوگرہ سپاہیوں کو نشانہ بنا بھی لیتا تو اس کے سنبھلنے یا مشین گن پر قابض ہونے سے پہلے ہی بائیں پکٹ پر موجود سپاہی اسے نشانہ بنا لیتے۔

جیسے ہی حسین خان سامنے والا موڑ مڑا۔شیرو کہنیوں کے بل تیزی سے دائیں طرف گھسٹنے لگا۔اس کی نظر بائیں پوسٹ پر تھی اور اندازے سے وہ وہاں لگی مشین گن سے فائرنگ کرتے دونوں سپاہیوں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ ان کے عین پیچھے پہنچ کر اچانک نمودار ہوتا۔اس نے ایسی جگہ نشانے کے لیے منتخب کر لی تھی جہاں سے وہ اچانک ان دونوں کو مار لیتا...... شیرو جانتا تھا کہ اسے حسین خان سے پہلے اپنی منتخب جگہ پر پہنچ جانا چاہیے ورنہ اس کے مارے جانے کا خطرہ موجود رہے گا۔اس کی کہنیاں چھل رہی تھیں اور خراشوں سے خون نکلنے لگا تھا،لیکن وہ پہاڑی کے دامن سے چپکا اپنی انتہائی رفتار سے پکٹ کی طرف رینگ رہا تھا۔

مجاہدین کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔انہوں نے ڈوگروں پر پتھروں کی بارش تیز کر دی تھی۔ان کی مقدور بھر کوشش تھی کہ دونوں کا کام مکمل ہونے سے پہلے وہ دشمن کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہیں۔ان کی امیدیں ان دونوں ہی سے وابستہ تھیں۔

شیر محمد کی سانس پھول چکی تھی،لیکن وہ اپنے مقصد میں بہر حال کامیاب رہا۔وہ حسین خان سے پہلے اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا اور ابھی وہ بمشکل پستول سیدھی کر کے دونوں ڈوگرہ سپاہیوں کو نشانے پر لے ہی رہا تھا کہ اسے یکے بعد دیگرے چار فائروں کی آواز سنائی دی...... حسین خان نے دونوں ڈوگروں کو پلٹنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی دوسری پکٹ والے اس طرف متوجہ ہوئے،لیکن ان کے سنبھلنے سے پہلے شیر محمد بہترین نشانہ بازی کا ثبوت دے چکا تھا۔دونوں پکٹوں کے گرد اگرد چھپے مجاہدین نعرے مارتے ہوئے اس طرف بڑھے۔حسین خان نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر شیرو کو سینے سے چمٹا لیا،اگر وہ پیچھے رہ جاتا تو آج حسین خان کی زندگی کا آخری دن ہوتا۔

دو مشین گنیں ہاتھ آنے سے مجاہدین کی کایا ہی پلٹ گئی۔ڈوگروں نے پیچھے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا اور وہ ایک دوسرے کو کورنگ فائر دیتے ہوئے پسپا ہونے لگے۔حریت پسندوں کے لیے ان پر جھپٹ پڑنے کا مرحلہ ابھی بہت دور تھا۔ان کے پاس اسلحہ کی کمی کھل کر حملہ کرنے میں حائل تھی۔

مشین گن کی پکٹوں سے جو فائر آ رہا تھا اس سے کچھ فوجی تو مارے گئے،لیکن باقی ہوشیار ہو کر فائرنگ کرتے پہاڑیوں کی اوٹ میں پسپا ہونے لگے۔

رات ڈھلنے تک معرکہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔مجاہدین اپنے زخمی ساتھیوں،لاشوں اور دشمن سے چھینے ہوئے اسلحہ سمیت پہاڑیوں میں غائب ہو چکے تھے۔

............☆☆☆............

شیرو اور شرفو پونچھ کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اس مرتبہ بھی ان کے پاس وہی ہتھیار تھے۔ شیرو کے پاس پستول اور اشرف خان کے پاس صرف کلہاڑی۔ پونچھ میں مجاہدین کے ہمدردوں کی گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ مہاراجہ کے تنخواہ دار ٹاؤٹ جن میں ہندوؤں اور سکھوں سے زیادہ تعداد بدقسمتی سے ان غدار مسلمانوں کی تھی جو محض چند ٹکوں اور ناپائیدار عہدوں کے حصول کے لیے اپنی بے غیرتی کے ہاتھوں فروخت ہو چکے تھے۔

......اگرچہ انہوں نے اپنی روانگی کو خفیہ رکھا تھا، لیکن کچھ بعید نہ تھا کہ مخبروں نے یہ خبر پولیس یا فوج کو پہنچا دی ہو۔ شہر کو آنے والے راستوں کی ناکہ بندی ہو چکی تھی اور مقامی مخبروں کی مدد سے پولیس نے ہر گھر کے غائب افراد کی فہرست تیار کر لی تھی...... اس بات کی تحقیق بھی کر لی گئی تھی کہ ان میں سے کتنے افراد ''ذاتی کام'' کے لیے دوسرے شہروں میں گئے ہیں۔

دونوں دوست چھپتے چھپاتے کسی نہ کسی طرح اب اس سڑک کے نزدیک پہنچ گئے تھے جو گھوم کر پونچھ میں داخل ہوتی تھی۔ شام کا ملگجا اندھیرا پہاڑیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا تھا جب اچانک آگے چلتا ہوا شرفو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے شیرو کو رکنے کے لیے کہا، لیکن اپنے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور شیرو بجائے رکنے کے اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے شرفو کے کندھے پر سے آگے کی سمت جھک کر کچھ دیکھنا چاہا۔

''شش!'' اشرف خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے لے آیا۔

''کیا بات ہے؟'' شیرو نے دبی دبی زبان میں اس سے ہاتھ چھڑواتے ہوئے پوچھا۔

''آگے فوجی ہیں۔ میں نے انہیں سامنے درختوں کی اوٹ میں پوزیشن لیتے ہوئے دیکھا ہے۔'' شرفو نے تیز سرگوشی کی۔

''فوجی کی اولاد ہو نا۔ تمہیں تو بے چارے گڈریے بھی فوجی نظر آتے ہیں۔'' شیرو نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

اس نے شرفو کو وہیں دبکے رہنے کو کہا اور خود بندر کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھ کر سامنے کا نظارہ کرنا چاہا، لیکن...... ابھی بمشکل وہ تنے پر ذرا نمایاں ہی ہوا تھا کہ گولی اس کے سر کے بالوں کو چھوٹ کر درخت کے اندر دھنس گئی۔ اس کے ہاتھوں سے تنا چھوٹ گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

چند منٹ کے لیے تو وہ بوکھلا کر ہی رہ گیا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب پہاڑیاں ''ہتھیار پھینک دو، سامنے آ جاؤ'' کی للکار سے گونجنے لگیں۔

ایک لمحے کے لیے شیرو کے سامنے ماں کی پرچھائیاں لہرائیں جو جانے کتنے ارمان دل میں بسائے کواڑوں سے لگی کھڑی تھی۔ پھر اس کی نظر اپنے نوجوان دوست شرفو پر پڑی۔ چند لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو رہا۔

''شرفو!'' اس نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنے جگری یار کو مخاطب کیا۔ ''تم واپس دوتھان کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں پناہ مل جائے گی۔ حالات نارمل ہوتے ہی لوٹ آنا۔ میں انہیں روکتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر اس نے چاہا کہ آگے بڑھ جائے، لیکن شرفو نے اس کا بازو تھام لیا۔

''نہیں شیرو! نہیں۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے قریباً شیرو کو اپنی طرف گھسیٹا۔

شیر محمد نے جھٹکا دے کر اسے خود سے الگ کیا۔ ''طاقت ور ہونا مجھ سے، اسی لیے اپنا حکم مجھ پر ٹھونس رہے ہو۔'' میٹرک کے طالب علم نے چاہا کہ جذباتی فضا پیدا کر کے شیرو کو اس ارادے سے باز رکھے۔

شیرو نے ایک لمحے کو رک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے عقب میں گولی چلنے کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دوست کے ماتھے کا بوسہ لیا "اللہ بیلی" کہہ کر اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اشرف خان اس کے پیچھے "شیرو شیرو" ہی چلاتا رہ گیا اور اس کا جگری یار، اس کا بڑا بھائی اسے ایک لمبے عرصے کے لیے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

......اسے ایک ساتھ کئی رائفلیں فائر ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر یکے بعد دیگرے اس نے چار پانچ فائر پستول کے بھی سنے۔ بادل نخواستہ وہ اپنے دوست سے الگ ہو کر پلٹنے لگا۔

شیرو جانتا تھا اگر وہ یہیں رکا رہا تو اس کا دوست کبھی اکیلا واپس نہیں جائے گا۔ اس نے ٹیکریوں کی آڑ میں کچھ ڈوگرہ فوجیوں کو اس سمت ایڈوانس کرتے دیکھ لیا تھا۔ ان لوگوں کے پاس رائفلیں تھیں اور تعداد میں وہ چالیس پچاس سے کم نہیں تھے۔

وہ سمجھ گیا کہ مقابلہ فضول ہے۔ جلد یا بدیر وہ لوگ اسے گھیر کر پکڑ لیں گے یا مار ڈالیں گے۔ وہ اس پستول سے ان لوگوں کا کچھ بگاڑنے سے تو رہا کیوں کہ وہ ہشیار، منظم اور آڑ میں تھے، لیکن ایک کام وہ ضرور کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو گھنٹہ آدھ گھنٹہ الجھائے رکھے۔ اس طرح اس کے دوست کو بحفاظت نکل جانے کا موقع میسر آ جاتا۔

اسے علم تھا کہ یہاں سے صرف چار پانچ میل دور حریت پسند جنگل میں چھپے ہوئے ہیں......اور اگر کسی طرح اس کا دوست وہاں تک پہنچ جائے تو وہ محفوظ ہو سکتا تھا۔

اسی خیال کے پیش نظر اس نے اندازے سے سامنے کی سمت چار فائر وقفے وقفے سے کر دیئے تھے۔ اس کا فائدہ شرفو کو فوراً پہنچا۔ ڈوگروں کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ لوگ مسلح ہوں گے۔ ان کی اطلاعات کے مطابق تو پورے پونچھ شہر میں ایک بھی مجاہد کے پاس رائفل یا پستول نہیں تھا، جب سامنے سے گولیاں آئیں تو وہ رکنے پر مجبور ہو گئے۔

انہیں احساس تھا کہ پہاڑیوں کا فائدہ دونوں فریقوں کو یکساں حاصل ہے۔ شیرو کے آڑ میں ہونے کی وجہ سے جب تک وہ اسے گھیر کر گرفتار کرتے، وہ ان کے دو تین ساتھیوں کو چاٹ جاتا۔ میجر رام سنگھ نے بڑی سختی سے انہیں ہدایت کی تھی "وہ تخریب کاروں کو زندہ گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کریں۔"

میجر رام سنگھ کو مہاراجہ نے خاص طور سے اس علاقے میں تازہ دم فوج اور بے شمار اسلحے کے ساتھ سدھنوں کی سرکوبی کو بھیجا تھا۔

......مقامی غداروں کا ایک ٹولہ گھر کے بھیدیوں کی شکل میں پہلے ہی یہاں موجود تھا جو سرکاری حکام کو خبریں پہنچا رہا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے ان کا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔ ورنہ حریت پسندوں کا مقامی نظام جاسوسی اتنا بھرپور اور مکمل تھا کہ ان میں سے کسی کو گرفتار کرنا مہاراجہ کے تنخواہ دار سپاہیوں کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

شیر محمد کے پاس بمشکل پچیس تیس راؤنڈ باقی بچے تھے جو اس نے پوزیشن بدل بدل کر اس طرح فائر کیے کہ دشمن تعداد کے دھوکے کا شکار ہو جائے۔ وہ کبھی باقاعدہ فوجی تو رہا نہیں تھا، لیکن حوالدار کی محض چند ماہ کی جان توڑ محنت نے اس میں ایک گوریلے کی سی چستی، چالاکی اور دلیری پیدا کر دی تھی۔ اس کا نشانہ بچپن ہی سے بڑا اسچا تھا۔

اپنے دوستوں کے ساتھ شرط بد کر وہ ان کے بتائے ہوئے سیب پر اپنی غلیل سے نشانہ لگایا کرتا تھا۔ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنا، اترنا، پہاڑیوں کی چڑھائیاں، اترائیاں اور ندی نالوں کو تیر کر عبور کرنا اس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ شاید اس لیے وہ کبھی بندھ کر نہ بیٹھ سکا اور آٹھ جماعتیں بھی ماں کی ضد کے پیش نظر ہی پڑھی تھیں۔

آج اپنی یاری کی لج پالنے کے لیے وہ اپنے سارے ہی جوہر آزمانے پر تلا ہوا تھا۔ پون گھنٹے تک اس نے فوج کے اس گروپ کو چکر دیئے رکھا، بالآخر ایک ایک کر کے اس کے راؤنڈ بھی ختم ہو گئے۔ اس دوران میں فوجیوں کو بھی اس کے اکیلے ہونے کا احساس ہو گیا تھا اور اب وہ خود کو لعنت ملامت کرتے اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

شیر محمد نے آخری مرتبہ بڑی حسرت سے پستول کی طرف دیکھا جو اس نے چند ماہ پہلے ایک قبائلی سے خریدا تھا جو اس علاقے میں سیبوں کی خرید و فروخت کیلئے آیا تھا۔ اس نے کافی تعداد میں پستول کے راؤنڈز بھی اسے دے دیئے تھے۔ کوئی غیبی طاقت اسے پچھلے دو تین سال سے یہ بات بتا رہی تھی کہ ایک روز اسے اسلحہ لے کر ان پہاڑیوں کی آزادی کے لیے ان کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔

اور آج! وہ بڑی حسرت سے اپنے خالی پستول کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جیتے جی اپنا اسلحہ دشمن کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے بڑے دکھی دل سے پستول کو چوما اور اپنے دائیں سمت ڈھلان سے نیچے پھینک دیا۔ سینکڑوں فٹ گہرائی پر بہنے والے ندی کے پر شور اور تیز رفتار پانی میں اس کے گرنے کا نظارہ کرنے کی تاب بھی اس میں نہ تھی۔

اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہا۔ اکا دکا گولیاں ابھی تک فائر ہو رہی تھیں۔ ابھی بمشکل تین چار منٹ ہی گزرے تھے جب اس کے عقب سے ''ہینڈز اپ'' کی آواز گونجی۔ پیچھے گھوم کر دیکھنے سے پہلے اس کی نظر ان ڈوگرہ سپاہیوں پر بھی پڑ چکی تھی جو سامنے والی پہاڑی کی اوٹ سے اچانک نکل کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ سب رائفلیں تانے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آگے پیچھے اور دائیں بائیں چاروں اطراف ڈوگرہ فوجیوں کی لہو رنگ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لیے تھے۔

............☆☆☆............

سورج اس کے سامنے والی پہاڑی کے پیچھے غروب ہو چلا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ڈوبتے سورج کی جو سرخ روشنیاں اس کے سامنے والی پہاڑی کی چوٹی پر ناچ رہی تھیں، وہ اونچی ہوتی ہوئی بالآخر غائب ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیئے تھے۔

''اسلحہ کہاں ہے؟'' شیرو کو باندھنے سے فراغت پاتے ہی ایک صوبے دار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کون سا اسلحہ؟'' اس نے حیرت سے پوچھنے کی ایکٹنگ کرنا چاہی۔

''بتاؤ اسے کون سا اسلحہ!'' اسی صوبے دار نے اپنے سامنے کھڑے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''اے لو مہاراج جی۔ ابھی بتاتے ہیں۔'' ایک ہٹے کٹے سکھ حوالدار نے جس کے چہرے پر سوائے بالوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، اپنی رائفل کو الٹا کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا...... اس کے ساتھ اس نے رائفل کا بٹ پوری قوت سے شیرو کے پیٹ میں مارا۔ ضرب کی شدت سے وہ دہرا ہو گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے ''ہائے'' نکل گئی۔ وہ آگے کی سمت جھکا، لیکن حوالدار کی زوردار ٹھوکر نے جو اس کے سینے پر لگی تھی، اسے واپس الٹ دیا۔ اس کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی پیچھے کھڑے سپاہی نے اپنی گن کا بٹ اس کی کمر میں مارا۔ شیرو کو یوں لگا جیسے اس کا جسم دو ٹکڑے ہو گیا ہو۔ وہ بے دم سا ہو کر زمین پر گر پڑا۔ کمر کے پیچھے بندھے ہاتھوں کی وجہ سے اس کا توازن بھی برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ زمین پر گرے ہوئے شیرو کو سپاہیوں نے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کی کربناک چیخوں سے پہاڑیاں گونجنے لگی تھیں، لیکن وہ لوگ جیسے دوتھان والے حملے کی پسپائی کا ذمہ دار اسی کو جان رہے تھے۔

جب چار پانچ منٹ تک وہ اس پر زور آزمائی کر چکے اور چلاتے چلاتے شیرو کا گلا بھی سوکھ گیا تو وہی صوبے دار آگے بڑھا۔ اس نے زمین پر تڑپتے ہوئے شیرو کو بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار کر اپنا سوال دہرایا ''اسلحہ کہاں ہے؟''

شیرو کے منہ سے خون آنے لگا تھا۔ اس نے اپنے قریب زمین پر تھوکا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اسے اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ راہ آزادی میں جان سے گزر جانے والے کا بیٹا تھا۔ حریت اور آزادی کے لیے شہادت پا جانے کی آرزو اس کو ورثے میں ملی تھی۔ اس کی ماں نے دم رخصت اس سے کہا تھا ''بیٹا اگر پیٹھ دکھائی تو میں دودھ کی دھاریں نہیں بخشوں گی۔'' اسے اپنی بزدلی پر طیش اور خود سے شرم آنے لگی تھی۔

''بزدلو!'' شیرو کو اپنی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ ''اگر اسلحہ موجود ہوتا تو تم اس طرح مجھ نہتے کو باندھ کر کہیں لے جا سکتے تھے؟'' وہ جوش غضب سے کانپنے لگا تھا۔

''بڑا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے مہاراج جی۔ آپ ذرا ایک طرف ہٹ جائیں میں دیکھتا ہوں اسے۔'' ایک اور سکھ حوالدار نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

اس نے رائفل ایک طرف رکھی اور دونوں ہاتھوں سے دوہتھڑ بنا کر اس کے سینے میں مارا، لیکن یہ دیکھ کر تو اس کا خون کھول اٹھا کہ شیر محمد اپنی جگہ مضبوطی سے قدم جمائے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا ہے۔ شیرو کے گرداگرد کھڑے سپاہیوں کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی، جس نے سکھ حوالدار کا پارہ آسمان پر چڑھا دیا اور اس نے غصے سے کھولتے ہوئے شیرو کی پسلیوں میں مکے مارنے شروع کر دیے، لیکن وہ ابھی تین چار مکے ہی مار پایا تھا کہ شیرو نے غصے سے تلملاتے ہوئے اپنی لات اس کی طرف گھما دی جو آگے کی سمت جھکے ہوئے حوالدار کے پیٹ میں اتنی زور سے لگی کہ وہ اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔

اس کی اس حالت پر اس کے ساتھیوں نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ سکھ حوالدار کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے دیوانہ وار جھپٹ کر اپنی رائفل اٹھائی اور سنگین سیدھی کر کے شیرو کے پیٹ میں مارنا چاہی کہ اچانک ایک گونجدار آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

اس کا کمانڈنگ افسر ایک طرف سے اچانک نمودار ہوا تھا۔ وہ ان سب کو گھور گھور کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''اسے چوکی لے چلو'' اس نے اپنے جوانوں کو ہونٹ چباتے ہوئے حکم دیا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف لوٹ گیا۔

شیرو

شیرو کو ہوش آیا تو وہ تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ بے تحاشا اور ظالمانہ مار پیٹ سے اس کے جسم کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔

......شیرو کو اپنے منہ میں کڑواہٹ کا احساس ہو رہا تھا اور حلق میں ایک عجیب سی تلخی رچی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر گردو پیش کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے اور وہ اکیلا ایک کوٹھڑی کے فرش پر پڑا تھا جس کی چھت خاصی اونچی تھی۔ ایک روشندان سے جو چھت سے بمشکل ایک ڈیڑھ فٹ نیچے بنا تھا اور جسے لوہے کی سلاخوں سے بند کیا گیا تھا۔ روشنی کی کرنیں کوٹھڑی میں آ رہی تھیں جو اس بات کا اعلان تھا کہ......صبح ہوگئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کل رات سے اب تک بے ہوش رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جائے، لیکن جیسے ہی اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہا، ایک کراہ اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی اور وہ ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ پسلیوں میں لگنے والی ٹھوکروں نے اس کا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بنا دیا تھا۔

آخر کسی نہ کسی طرح وہ دیوار کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس سے ٹیک لگا لی......ابھی تک کوئی سنتری وہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ بمشکل اس نے تھوک نگلا اور اسی سوچ میں تھا کہ کسی کو آواز دے کر پانی طلب کرے یا خاموش رہے کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی......اس کی آنکھیں حوالات کی سلاخوں پر جم گئیں۔

آنے والا کوئی مسلمان سپاہی تھا۔ اس نے شیرو کو ہوش میں آتے دیکھا تو سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ شیرو اندازہ نہ کر سکا کہ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی ہے یا نفرت۔ اسے شیرو پر رحم آ رہا ہے یا غصہ۔ بس وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے اسے ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔

اس کا دل چاہا کہ اس سے پانی مانگ لے، لیکن اس کی غیرت نے دشمن کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے احتراز برتا۔ نو وارد نے جب دیکھا کہ وہ کچھ بولتا ہی نہیں، نہ ہی اس سے نظریں ملا رہا ہے تو وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ پہلے شاید اس نے لوٹ جانے اور افسران کو رپورٹ کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ واپس مڑا اور سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''کسی شے کی ضرورت ہے؟'' اس نے اپنا منہ دروازے کی سلاخوں سے لگا کر اس سے دریافت کیا۔ شیرو نے اس کے بلانے پر چونک کر اس کی طرف دیکھا اور چند ثانئے دیکھتے رہنے کے بعد نظریں جھکا لیں۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے شیرو نے اسے جواب دینے کے قابل جانا ہی نہیں۔ کسی بے نام سے جذبے کے تابع ہو کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''اگر پانی مل جائے تو......''

......اسے فوراً شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سنتری کوئی بات کہے سنے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بمشکل دو تین منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنی جگہ سے ہلا تو جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے ضبط کیا اور اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حلق میں انڈیلا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کھل گیا۔ یہ الگ بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔'' سنتری نے پانی انڈیلتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

''کاش تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیری ماں کے بطن سے ہوا ہوتا۔ تب تم ایسی کوئی بات مجھے نہ کہتے۔'' شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

جب وہ لوٹا ہاتھ میں پکڑے واپس جا رہا تھا تو اس کا ضمیر اس پر ملامت کر رہا تھا۔ سنتری کی روانگی کے بمشکل تین چار منٹ بعد ہی شیر محمد کی کوٹھڑی کے سامنے تقریباً سبھی ملازمین ہجوم کیے کھڑے تھے، پھر اپنے انسپکٹر کو آتے دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ انسپکٹر مسلمان تھا، لیکن اس کے ہمراہ سول کپڑوں میں ملبوس ایک آرمی آفیسر بھی تھا جس کی شکل پر ہی لکھا ہوا تھا کہ وہ کسی بری گھڑی کی پیدائش ہے۔

میجر رام سنگھ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے کھا جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ شیرو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں براہ راست میجر رام سنگھ کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ایک بیس سالہ لونڈا اسے یوں گھور کر دیکھے، ایسا وقت زندگی میں رام سنگھ پر پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اگر دونوں کے درمیان سلاخیں حائل نہ ہوتیں تو وہ شیرو کی آنکھیں نکال دیتا۔

اس کے چہرے سے چھلکتے غیض و غضب کو انسپکٹر میر نے محسوس کر لیا تھا، جسے شہ کا مصاحب ہونے پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا۔ وہ آگے بڑھا اور منہ میں آئی ہوئی تمام گالیاں اسے دے کر شیرو کو حکم دیا کہ وہ میجر سے نظریں جھکا کر بات کرے۔

''میں تمہاری طرح نہ تو مادرِ کشمیر کا کوئی بے غیرت نطفہ ہوں نہ ہی مہاراجہ کا تنخواہ دار کتا۔'' شیرو نے غصے سے کھولتے ہوئے اسے جواب دیا۔

انسپکٹر میر نے اسے جواب میں بے شمار مغلظات سے نوازا اور اپنے سنتریوں کو اسے باندھ کر لانے کا حکم دے کر غصے میں کھولتا ہوا اس کمرے کی طرف چل دیا جو کشمیری حریت پسندوں کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔

میجر رام سنگھ اس کے ساتھ قدم ملا کر چلا آ رہا تھا۔ دونوں اس کمرے میں پہنچنے تک شیرو کو گالیاں بکتے آئے تھے۔ وہ اس کی بوٹیاں نوچ لینے پر تلے ہوئے تھے۔

کمرے میں پہنچنے تک ایک شیطانی منصوبہ میجر رام سنگھ کے ذہن میں آ چکا تھا اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ناچنے لگی تھی۔ انسپکٹر میر اس کے موڈ کی اچانک تبدیلی پر حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

............☆☆☆............

شیرو کے ہاتھ ہتھکڑی سے باندھ کر اسے گھسیٹتے ہوئے وہ لوگ میجر رام سنگھ کے سامنے لائے تھے کیوں کہ اس نے اپنے قدموں پر چل کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دونوں اس پر وحشیوں کی طرح پل پڑے۔ انسپکٹر میر وفاداری کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ کر رہا تھا۔ اگر رام سنگھ شیرو کو دو گالیاں دیتا تو انسپکٹر میر اسے دس گالیاں دیتا۔ اگر رام سنگھ اسے ایک ٹھوکر مارتا تو وہ اسے چار ٹھوکریں رسید کرتا۔

رات سے وہ بھوکا پیاسا یہ اذیت برداشت کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ ادھ موا ہو کر گر پڑا۔ اس پر بے ہوشی طاری تھی۔

''لے جاؤ اسے۔ کہیں کمبخت مر ہی نہ جائے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ اگلوانا ہے۔ اسے کھانا کھلاؤ۔ میں شام کے بعد آؤں گا۔'' اس نے انہی سنتریوں کو حکم دیا جو اسے یہاں لائے تھے اور وہ لوگ شیرو کو ڈنڈا ڈولی کرتے واپس لے گئے۔

بڑا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے کمبخت۔'' انسپکٹر میر نے اپنی پگڑی سر پر جماتے ہوئے میجر رام سنگھ سے کہا۔

جواب میں رام سنگھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''میر صاحب! یہ طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرے گا۔ میرے ذہن میں ایک علاج آیا ہے اس کا۔ میرے آدمی کام کر رہے ہیں جیسے ہی مجھے مطلوبہ اطلاع مل گئی، پھر دیکھنا میرے ہاتھ، ایسے مجاہدین تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔'' اس نے خاصے طنز سے کہا۔

شیرو کو ہوش آیا تو وہی سنتری اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا رواں رواں فریادی تھا، لیکن اس نے اب اس اذیت کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اسے صرف ایک ہی فکر پریشان کر رہی تھی کہ اس کی ماں اور اس کا دوست شرفو کس حال میں ہیں؟

اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہی سنتری ایک طرف چل دیا۔ اس کی واپسی دو آدمیوں کے ساتھ ہوئی جو اس کے لیے کھانا اور قہوہ لیے چلے آ رہے تھے۔

''میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ لے جاؤ۔ غدارو! بے شرمو!'' اس نے آنے والوں کو دیکھتے ہی جوش غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا۔

''یہاں رکھ دو اور چلے جاؤ۔'' اسی سنتری نے آنے والوں سے کہا۔

وہ لوگ سامان خورد و نوش وہیں رکھ کر چلے گئے۔ اب وہاں سنتری اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سنتری نے اسے اپنی طرف مخاطب کیا اور شیرو نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''میرا نام سجاول ہے بیٹا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں شیرو کو مخاطب کیا۔ ''اگر میری زبان پر اعتبار کر سکتے ہو تو جان لو کہ میں تمہارا

ساتھی ہوں۔''

شیرو نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس نے کوئی بڑی عجیب سی بات کہہ دی۔

''ٹھیک ہے تمہاری زبان پر اعتبار کرنے میں تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنے کسی ٹھکانے کا انکشاف کر دوں اور تمہیں مہاراجہ کی خدمت کرنے کا ایک سنہری موقع مل جائے۔'' شیرو نے بڑے طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''تم اس وقت جو جی چاہے کہہ لو بیٹا، مگر ایک بات یاد رکھو۔ وقت بہت کم ہے۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے اس کی وفاداری کا ثبوت ہی مانگتے رہے تو ممکن ہے رام سنگھ اپنے گھناؤنے منصوبے پر عمل کر گزرے۔ فی الوقت صرف کھانا کھاؤ جو تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ باقی باتیں شام کو ہوں گی۔ میری ڈیوٹی اب ختم ہونے والی ہے۔ کسی نہ کسی طرح آج کا گشت بھی کاٹ لو، کل قدرت یقیناً کوئی بہتر سبب پیدا کر دے گی۔'' شیرو نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ سجاول نے اس کی توجہ اس سمت آتے قدموں کی آواز کی طرف مبذول کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے گالیاں دے دے کر کھانا کھانے کا حکم دینے لگا۔

☆☆☆

میجر رام سنگھ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ آ ہی گیا۔ ایک کشمیری پنڈت اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اسے نمسکار کر رہا تھا۔

''ہاں لالہ جی؟'' میجر رام نے بے چینی سے پوچھا۔

''مہاراج جی! اس کا تو کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔'' پنڈت گھگھیایا۔

''کیا مطلب؟'' رام سنگھ کو اچانک جھٹکا لگا۔

''میں نے ایک ایک گھر پر اپنے مخبر لگا رکھے ہیں مائی باپ لیکن وہ بڑھیا تو یوں غائب ہوئی جیسے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔''

''پنڈت مہاویر پرشاد!'' میجر رام سنگھ نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ''نہ تو میں دودھ پیتا بچہ ہوں نہ تم۔ دماغ کو حاضر رکھ کر بات کرو پنڈت جی۔ پونچھ کوئی لاکھوں کی آبادی کا شہر نہیں کہ یہاں سے کسی کے غائب ہونے کا پتہ نہ چلے۔ مجھے شیرو کی ماں آج شام تک ہر صورت میں چاہیے ورنہ......'' اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''میں اپنی مقدور بھر کوشش کر رہا ہوں مائی باپ۔ آپ دھیرج رکھیے۔ جائے گی کہاں؟'' پنڈت نے بڑی مکاری سے دانت نکالے، لیکن اس کا چہرہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ جب رام سنگھ نے اچانک اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہاری باتیں نہیں، شیرو کی ماں چاہیے۔ اسے کہیں سے بھی پیدا کرو، کہیں سے بھی۔ دفع ہو جاؤ۔''

''جاتا ہوں مہاراج، جاتا ہوں۔ درگائی، ہے درگائی۔''

اور پنڈت مہاویر پرشاد باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عقل کے اندھے میجر کو کیسے سمجھائے کہ شیرو کی گرفتاری کے فوراً

بعد ہی اس کی ماں گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ شاید اس نے اپنے انجام کا اندازہ لگالیا ہوگا یا اسے حسین خان کے آدمیوں نے یہاں سے کسی محفوظ مقام پر منتقل کردیا ہو۔

پنڈت مہاویر پرشاد کے باہر جاتے ہی میجر رام سنگھ نے میز پر رکھی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور ایک سنتری اندر داخل ہوا۔

''لے آؤ اسے۔'' اس نے سنتری کے ایڑیاں بجاتے ہی حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے شیر محمد اس کے سامنے موجود تھا۔ میجر رام سنگھ اس کی ماں کو ترپ کا پتہ بنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی پراسرار گمشدگی نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اب وہ اپنی تمام ناکامیوں کا بدلہ اسی سے لینا چاہتا تھا۔

اس کے اشارے پر ایک سپاہی نے ہتھکڑی کا دوسرا سرا وہاں دیوار ہی میں گڑی ایک مضبوط سلاخ میں پھنسا کر تالا لگادیا۔

''حسین خان کہاں ہے؟'' اس نے بید ہاتھ میں پکڑے اسے سرد آنکھوں سے گھورا۔

''تمہارے سامنے کھڑا ہے۔'' شیر محمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم لوگ اس طرح نہیں ماننے والے۔'' رام سنگھ نے اپنے دانت پیسے۔

''یہاں کا ہر آزادی پسند حسین خان ہے۔ تم کس حسین خان کی بات کر رہے ہو؟'' شیرو نے اس کا تمسخر اڑایا۔ اس کو اپنی بات کا جواب بازو پر پڑنے والے زوردار بید کی شکل میں ملا جو سنسناتا ہوا اس کے گوشت میں اتر گیا تھا۔

''کہاں ہے حسین خان......؟'' رام سنگھ جوش غیظ وغضب میں چلاتے ہوئے اس پر بید برسانے لگا۔

اس کی ہر ضرب شیرو کو اپنی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی، لیکن اس نے اذیت سے فرار کی راہ یہ جانی کہ بجائے فریاد کناں ہونے کے رام سنگھ کو گالیاں دینے لگا۔ اس کی ہر گالی رام سنگھ کے غضب میں کئی گنا اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اس کو مارتے مارتے اب بے بس گدھوں کی طرح ہانپنے لگا تھا۔ اس کے بازو شل ہوگئے تھے۔ شیرو کے بدن پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ اس کے قریباً سارے جسم سے خون جاری تھا، لیکن وہ اسی طرح رام سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

رام سنگھ بے بس ہوکر ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہوگیا جو وہاں ایک کونے میں رکھی تھی، وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

''بس بزدل!'' شیرو کی آواز میں رعد کڑک رہی تھی۔

جواب میں رام سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور اندر آنے والے سنتری کو کچھ اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے دو لاٹھی بردار سنتری وہاں موجود تھے۔

''مارو اسے!'' رام سنگھ نے ہانپتے ہانپتے اس کی طرف اشارہ کیا۔

جواب میں شیر محمد کا زوردار قہقہہ اسے پاگل ہی تو کر گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ بھی اٹھ کر ان مار پیٹ کرنے والوں میں شامل ہو جائے، لیکن وہ بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ دونوں لاٹھی بردار اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے...... آدھ گھنٹے تک اذیت برداشت کرنے کے بعد وہ بالآخر بے ہوش ہوگیا۔

اس کے بے ہوش جسم کو پاؤں کی ٹھوکریں مار کر میجر رام سنگھ نے حکم دیا: ''اسے اس کی کوٹھڑی میں پھینک آؤ۔'' اس نے بڑے بڑے مجرموں کے کس بل نکال دیئے تھے۔ کشمیر بھر کے انٹروگیشن سینٹرز میں وہ قصائی کے نام سے پہچانا جاتا تھا، لیکن اس 20 سال کے نوجوان کشمیری نے اسے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

شام کے بعد پنڈت مہاویر پرشاد پھر اس کے سامنے حاضر ہوا۔ پنڈت پچھلے دس سال سے سرکاری مخبر کے فرائض انجام دے رہا تھا...... اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا اور قبل اس کے کہ میجر رام سنگھ اس سے کچھ دریافت کرے، نہایت مکاری سے ایک آنکھ دباتے ہوئے اس نے رام سنگھ کو مخاطب کیا: ''مہاراج بڑھیا تو نہیں ملی، ایک اور شے ہاتھ آئی ہے۔ مائی باپ شیر دتو کیا اس کے باپ کی قبر سے اس کی ہڈیاں بھی بولنے لگیں گی۔''

''کیا؟ کون ہے وہ؟'' رام سنگھ نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا۔

''زہراں!'' پنڈت نے بڑی بے شرمی سے آنکھ اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔

''لیکن اس کا تو......'' رام سنگھ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ پنڈت مہاویر پرشاد کی رگ رگ سے واقف تھا۔

............☆☆☆............

تقسیم ہند سے چند ہفتے پہلے جب قائداعظم ؒ مری میں قیام فرما تھے، ایک وفد نے ان سے ملاقات کی۔ اس وفد میں موجود بیشتر لوگ مسلم لیگ سے متعلق تھے، لیکن ان میں ایک مسلمان فوجی افسر بھی شامل تھا جو ''آرمڈ فورسز پارٹیشن سب کمیٹی'' کا ممبر ہونے کی وجہ سے کچھ خدشات کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے قائداعظم ؒ کو بتایا کہ مہاراجہ کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے گریز برت رہا ہے۔ اس نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ آزادی ہند کی تحریک کا ہیرو شیخ محمد عبداللہ جو تصور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے، دراصل مہاراجہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

قائداعظم ؒ نے اس مستقبل کے جرنیل (طارق) کو تشفی دی اور فرمایا کہ دو افراد کا فیصلہ کبھی ساری قوم کا فیصلہ نہیں کہلاتا۔ نظریہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کے دل میں بھی گھر کر چکا ہے۔ شیخ عبداللہ کی مخالفت کے باوجود کشمیری غیور مسلمان پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ ڈالیں گے۔

لیکن ستمبر 1947ء ہی میں مری پہنچنے والے کشمیری مہاجرین کی تباہ حالی چلا چلا کر اس جرنیل کے خدشات کی تصدیق کر رہی تھی۔ ان لوگوں کی زبانی علم ہوا کہ مہاراجہ کی ستم رانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ اس کی فوج اور مسلح غیر مسلموں نے کشمیری مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وہ لوگ بے دریغ قتل عام اور لوٹ مار میں جتے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان گھبرا کر ریاست سے بھاگ جائیں اور انہیں اپنے گھناؤنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔

یہ بڑی سنگین اور روح فرسا خبر تھی۔ حکومت اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی۔ نہ صرف کشمیری مسلمانوں بلکہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کے تحفظ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کشمیر کو بھارت کی جھولی میں نہ گرنے دیا جائے۔ ہر ذی شعور یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اگر بھارتی افواج نے کشمیر کی سرحدوں پر ڈیرے ڈال دیئے تو راولپنڈی سے لاہور تک 180 میل لمبی سڑک ان کے براہ راست حملوں کی زد میں آ کر بالکل غیر محفوظ ہو جائے گی۔ اس رابطہ

لائن کے دفاع کے لیے فوج کا ایک بڑا حصہ مختص ہو جاتا اور لاہور فرنٹ کمزور پڑ جاتا۔ جس کے بعد بھارت کے لیے ہماری رابطہ لائن توڑ کر لاہور، سیالکوٹ، جہلم اور گجرات کو پاکستانی افواج کے جی ایچ کیو راولپنڈی سے کاٹ دینا چنداں مشکل نہ رہتا۔

ہزارہ اور مری محاذ سے دو سو میل دور تھے، لیکن کشمیر میں بھارتی فوج کے آجانے سے وہ فوراً جنگ کی لپیٹ میں آجاتے۔ امن اور جنگ دونوں صورتوں میں یہ حالات ہمارے سر پر خطرے کی تلوار بن کر لٹک رہے تھے۔

ہماری زراعت کا دارومدار بھی ان دریاؤں پر تھا جو کشمیر سے نکلتے تھے۔ مرالہ ہیڈ ورکس سرحد کے صرف ایک میل اندر اور منگلا ہیڈ ورکس کشمیر میں واقع تھے۔ دوسری طرف خود کشمیر کی اقتصادیات بھی پاکستان سے وابستہ تھی۔ کوہالہ، مظفر آباد کی تجارتی شاہراہ کشمیر کی وہ واحد شاہراہ تھی جو سارا سال کھلی رہتی تھی اور یہ مظفر آباد سے کوہالہ کے راستے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔ دیودار اور چیل کی لکڑی جو ریاست کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، دریائے جہلم کے راستے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔

یہ ثبوت تھے اس بات کے کہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق صرف ''خواہش'' نہیں بلکہ ایک لازمی ضرورت اور پاکستان کی سالمیت کا بھرپور تقاضا بھی ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت پاکستان سے الحاق کی حامی تھی۔ ان پاکستان دوست کشمیریوں کو جب جبراً بے گھر اور بے وطن کیا جانے لگا اور کشمیر سے بھارت کے ''جبری الحاق'' کی راہیں استوار ہونے لگیں تو دردمند پاکستانیوں کے دل دہل گئے۔

............☆☆☆............

کشمیر میں جنگ آزادی اور مہاراجہ سے نجات کا جو شعلہ بھڑکا تھا، اس کی تپش کو قائم رکھنا ازحد ضروری تھا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ پاکستانی افواج آگے بڑھیں اور اپنا جائز اور قانونی حق حاصل کر کے رہیں، لیکن قباحت یہ تھی کہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف انگریز تھا اور کافی اعلیٰ افسران بھی انگریز ہی تھے، جن سے کسی مدد کی توقع دیوانے کا خواب تھی۔

اس سلسلے میں پاکستانی افواج کے جو محبِ وطن افسران جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک کی حفاظت اور کشمیر کی آزادی کے لیے تل گئے تھے، ان کی کمانڈ راسی ''فورسز پارٹیشن کمیٹی'' کے ممبر کے حصے میں آئی، جس نے تقسیم ملک سے پہلے ہی قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ تھے سابق میجر جنرل اکبر خان جو بعد میں طارق بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کشمیر کی جنگ آزادی میں جنرل طارق کے نام سے مشہور ہوئے۔

مسلم لیگ کے سرکردہ رکن اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے معتمد ساتھی میاں افتخار الدین مرحوم کو قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیری رہنماؤں سے مل کر جنگ آزادی سے پیدا شدہ صورت حال اور اس کو دی جانے والی ممکنہ امداد کے لیے جائزہ لینے سری نگر روانہ فرمایا تھا۔ میاں افتخار الدین نے بعد میں جنرل طارق سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی عملی پلان فوراً تیار کریں، لیکن ان پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح تھی بلکہ کہہ بھی دی گئی کہ اپنے پلان کی تیاری کے وقت وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ جو بھی کارروائی ہوگی، غیر سرکاری سطح پر ہوگی۔ پاکستانی فوج یا اس کے افسران کے اس میں عملاً حصہ لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

............☆☆☆............

یہی تھے وہ غیر واضح، ناکافی اور مبہم حقائق جن کی روشنی میں طارق بن زیاد ؒ کا سپاہی جنرل طارق (میجر جنرل اکبر خان) مسلم کانفرنس کشمیر کے لیڈر سردار ابراہیم سے ملنے جا رہے تھے جو کشمیری حریت پسندوں کے لیے امداد حاصل کرنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔

جنرل طارق کو حریت پسندوں نے بتایا کہ فی الوقت پانچ سو رائفلیں مل جائیں تو وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے پہلے سے جاری شدہ تحریک آزادی کشمیر کو خاصی تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ انہی کی زبانی جنرل طارق کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ حریت پسند جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے بے چینی سے کسی مدد کے منتظر ہیں۔ وہ تمام سابقہ انڈین آرمی کے تربیت یافتہ فوجی ہیں اور ان کے حرکت میں آتے ہی جنگ آزادی کا نقشہ پلٹ جائے گا۔

جنرل طارق کے خیال کے مطابق انہوں نے بہت کم رائفلیں مانگی تھیں۔ کشمیر میں بغاوت کو سنبھالا دینے کے لیے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اسلحہ درکار تھا، لیکن سوال اس بات کا نہیں تھا کہ اسلحے کی کتنی مقدار درکار ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ لوگ کتنا اسلحہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جنرل صاحب ان دنوں جنرل ہیڈ کوارٹر میں جنگی اسلحہ اور ساز و سامان کے ڈائریکٹر تھے اور اس ناطے سے یہ بات ان کے علم میں تھی کہ پاکستانی فوج کے پاس کتنا اسلحہ ہے؟ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستانی فوج کے حصے کا ایمونیشن ابھی تک انڈیا میں پڑا تھا۔ اگر یہ سارا اسلحہ پاکستان میں بھی ہوتا تو وہ اسے کشمیر میں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کمانڈر انچیف کو اعتماد میں لینا ضروری تھا اور انگریز کمانڈر انچیف کے کانوں تک اگر ایسی کوئی اڑتی ہوئی خبر بھی پہنچ جاتی تو کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی بگڑ کر رہ جاتا کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان آرمی کو کچھ نہ کرنے دیتا بلکہ اپنے خصوصی روابط کے پیش نظر بھارت کے کمانڈر انچیف کو بھی جو انگریز تھا، مطلع کر کے پہلے سے پیش بندی کی ہدایت کر دیتا۔

تو پھر کیا کیا جائے......؟

اسلحہ کہاں سے اور کیسے حاصل ہو......؟

اس سلسلے میں قدرت نے دو راستے خود بخود پیدا کر دیئے۔ جنرل ہیڈ کوارٹر میں پولیس کے لیے چار ہزار رائفلوں کی منظوری ہو چکی تھی، لیکن ابھی تک پولیس نے اس کی ڈیمانڈ نہیں کی تھی۔ جنرل طارق کا پلان یہ تھا کہ وہ یہ چار ہزار پولیس کو جاری کروا کے پھر پولیس سے حاصل کر لیں۔

دوسری طرف آرڈیننس ڈپو کے کرنل اعظم خانزادہ آگے بڑھے۔ ان کی نظر میں آرمی ایمونیشن کا ایک ایسا سٹاک موجود تھا جسے ضائع کرنے اور سمندر میں پھینک دینے کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ کرنل خانزادہ نے وعدہ کیا کہ وہ کاغذوں میں یہ اسلحہ سمندر میں پھینک دیں گے۔ کارروائی مکمل ہوتے ہی یہ اسلحہ بھی مجاہدین کو دے دیا جائے گا۔''

مری کے ایک مکان کو یہ تاریخی شرف حاصل ہے کہ وہاں بیٹھ کر وہ منصوبہ تیار کیا گیا جو آزاد کشمیر کی فتح پر منتج ہوا۔ اس روز شام کے بعد جنرل طارق اور دوسرے حریت پسند اپنے محدود ذرائع اور وسائل کی کمیابی کے باوجود ایک منصوبہ ترتیب دیئے بیٹھے تھے۔

............☆☆☆............

مہاراجہ کی فوج نو ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں دو ہزار مسلمان تھے۔ اس منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی کہ یہ دو ہزار مسلمان سپاہی کشمیر میں بغاوت پھیلتے ہی مہاراجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ہتھیاروں سمیت مجاہدین سے آملیں گے۔ کم از کم ان سے یہ امید

ضرور تھی کہ وہ اس "بغاوت کی سرکوبی" کے دوران خود کو بے اثر بنائے رکھیں گے اور ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں سے آن ملیں گے۔

بہر حال ان کے نکل آنے سے مہاراجہ کی فوج کی نفری سات ہزار رہ جاتی اور کشمیر جیسے پہاڑی علاقے کی حفاظت کے لیے یہ نفری نہ ہونے کے برابر تھی۔ سب سے بڑا خطرہ بھارتی مداخلت کا تھا کیوں کہ مہاراجہ ریاست کو خطرے میں دیکھتے ہی بھارت سے مدد طلب کر سکتا تھا۔

یہ اجلاس اس صورت حال پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ ممکنہ بھارتی مداخلت کو کیسے روکا جائے۔ اس سلسلے میں بحث و تمحیص کے بعد بالآخر طے پایا کہ ان تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی جائے جہاں سے غیر ملکی فوجوں کو داخل ہونا تھا۔

ایک راستہ تو کٹھوعہ سے جموں تک کا تھا جہاں گوریلا دستہ اچھی بھلی فوج کے لیے بھی دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ یہ صورت حال بھی صرف ڈیڑھ دو ماہ تک رہتی، اس کے بعد بارشوں سے یہ راستہ کیچڑ اور پانی کی وجہ سے تقریباً بند ہو جاتا ہے۔ پھر دسمبر کے مہینے میں درہ بانہال پر شدید برف باری سے یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا تھا۔

اس راستے کو مستقل روکے رکھنے کے امکانات تو کم تھے، لیکن ڈیڑھ دو ماہ بھی اگر یہ راستہ رکا رہتا تو مجاہدین کو تیاری اور ضرب لگانے کا خاصا وقت مل جاتا۔

مدد کا دوسرا اور اہم طریقہ فضائی تھا۔ کشمیر میں ان دنوں صرف ایک سری نگر کا ہوائی اڈہ ایسا تھا جہاں فوج اتاری جا سکتی تھی، لیکن یہ اڈہ شہر سے دور تھا اور چھاتہ بردار فوج کی فوری حفاظت کے انتظامات بہت ہی کم رہ جاتے تھے۔ جنرل طارق کا خیال تھا کہ اگر دو سو مسلح آدمی بھی ہوائی اڈے کے گرد اگر دبیٹھ جائیں تو وہ دشمن فوج کے نہ صرف جہازوں کو اترتے وقت زبردست نقصان پہنچائیں گے بلکہ دشمن فوج کو اترتے وقت ہی اتنا نقصان پہنچا دیں گے کہ اس کے لیے شہر میں داخل ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

اس اجلاس نے ممکنہ طور پر حاصل ہونے والی چار ہزار رائفلوں کو اس طرح تقسیم کیا کہ ایک ہزار تو جموں کٹھوعہ روڈ بند کرنے کے لیے، دو سو سری نگر ہوائی اڈے کے لیے، باقی دو ہزار آٹھ سو رائفلیں پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ والے علاقوں میں بانٹ دی جائیں گی۔ اسی سلسلہ میں ایک اور پلان بھی زیر بحث آیا جس کی رو سے سابقہ انڈین نیشنل آرمی کے لوگوں کو جو پاکستان میں موجود تھے، ایک فوجی افسر کی کمان میں پنجاب کے سرحدی علاقوں سے کشمیر میں داخل کیا جائے اور دوسرا گروپ میجر خورشید انور کی کمان میں کشمیر کی طرف سے داخل ہو جائے۔

..............☆☆☆..............

شیرو لیٹے لیٹے اچانک چونک پڑا۔ بات ہی ایسی تھی۔ نقاہت تھی یا مسلسل بیداری کہ اسے مدہوشی یا شاید نیند نے آلیا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا جب اس کے سینے اور دیوار کے درمیان کنکر میں لپٹا کاغذ کا ٹکڑا آن گرا۔ ہڑبڑا کر اس نے آنکھ کھولی اور دھڑکتے دل سے وہ کاغذ کا پرزہ اسی طرح اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا۔

پہلے اس نے اپنی دھڑکنوں کو نارمل کیا، پھر کوٹھڑی کے دروازے میں لگی سلاخوں سے اپنا چہرہ لگا کر سامنے اور دائیں بائیں حد نظر تک نگاہ دوڑائی۔ وہاں کسی سنتری کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ شیرو کو اس لمحے تحیر کی ایسی کیفیت نے آن لیا کہ اسے اپنے زخموں سے اٹھنے والی ٹیسوں کا

احساس تک نہ رہا۔ اس نے بڑی بے تابی سے کاغذ کا وہ پرزہ کھول کر پڑھا۔

حسین خان نے لکھا تھا:

"آج یا کل رات فرار کے لیے تیار رہنا۔ روشن دان کی سلاخیں گل چکی ہیں۔ ہم اسی راستے سے قسمت آزمائی کریں گے۔"

شیرو نے دو تین مرتبہ اسے پڑھا، پھر اسے پرزے پرزے کر کے کوٹھڑی کے ایک کونے میں بنے اس فلش نما گڑھے میں پھینک دیئے جہاں غلاظت جمع ہو کر باہر نکلتی تھی۔ ابھی تک وہ کوشش کے باوجود اپنے اعصاب کو سکون نہیں دے پایا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھی اس کے لیے اس حد تک بھی جا سکتے ہیں۔

ابھی تک اس نے فرار کے امکانات پر غور نہیں کیا تھا یا شاید اسے اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کیوں کہ انسپکٹر میر صاحب اور میجر رام سنگھ اسے صرف کچھ دیر ہی کے لیے چھوڑتے تھے، جتنی دیر تک کے لیے اس کا جسم اگلی اذیتیں برداشت کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔

صبح ہو چکی تھی، لیکن اسے کسی نے ابھی تک بیدار نہیں کیا تھا ورنہ تو علی الصبح ہی وہ لوگ اس پر مشق ستم جاری کر دیتے تھے۔ اس احساس نے کہ اس کے ساتھیوں نے اسے بھلایا نہیں اور وہ اس کے اغواء یا فرار کے لیے کوشاں ہیں، شیرو کے حوصلوں کو مہمیز لگا دی۔ میجر رام سنگھ نے جس بری طرح اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا، اس کے بعد اگر دو تین مرتبہ اور اسے رام سنگھ کے سامنے پیش ہونا پڑتا تو شاید وہ حوصلہ ہار جاتا۔

اب اسے مار پیٹ سے کچھ مہلت نصیب ہوئی تو بے اختیار اس کا ذہن اپنی ماں کی طرف پلٹا۔ ماں ایسی مہربان ہستی کے ساتھ ہی اسے زہراں بھی یاد آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وسوسوں کے زہریلے ناگ اس کے دل و دماغ کو ڈسنے لگے۔ نہ جانے کیوں اس نے ایک مفروضہ اپنے ذہن میں قائم کر کے اس پر سوچنا اور پریشان ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سوچا اگر ان لوگوں کو زہراں سے اس کی نسبت کا علم ہو گیا تو کمینہ دشمن نہ جانے کیا کر گزرے۔

میجر رام سنگھ یا انسپکٹر میر کس حد تک گر سکتے ہیں، اس بات کا اندازہ اسے ہو چکا تھا اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ اس کے ہم وطن جب ضمیر فروشی پر اتر آئیں تو وہ کس حد تک جا سکتے ہیں۔ مادر وطن کے انہی بے غیرتوں کے سبب وہ ابھی تک ڈوگرہ فوج کے ظلم و ستم کی چکی میں پستے آ رہے تھے ورنہ وہاں تو غیر مسلموں اور خصوصاً ڈوگرہ فوجیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اگر اس کے کشمیری جانباز ایک دفعہ جمعیت کی صورت دشمن کے خلاف ڈٹ جاتے تو جس طرح ان کے اسلاف نے 1931ء میں شعلہ آزادی کی لو اپنے لہو سے بڑھا دی تھی، پھر کبھی یہ مشعل بجھنے نہ پاتی۔

یہ انہیں ملت فروشوں کا دم قدم تھا کہ آج لاکھوں غیور اور جیسور کشمیریوں کو چند ہزار ڈوگروں نے انسانوں سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ کشمیر کے جس کونے سے بھی کوئی چنگاری سلگتی، یہ غدار ملت فروش وہیں حق نمک ادا کرنے پر تل جاتے اور وہ کام جو شاید مہاراجہ کے تنخواہ دار درندے برسوں میں انجام نہ دے پاتے، ان ننگ قوم ضمیر فروشوں کی مدد سے چند دنوں میں انجام پا جاتا۔

محض چند ٹکوں کے لالچ میں اگر کسی گھر کے بھیدی نے زہراں اور اس کی نسبت کی لنکا ڈھا دی تو کیا ہوگا؟ زہریلے ناگوں کی طرح یہ پریشان کن سوچیں اس کے ذہن میں پھن پھیلانے لگیں۔

زہراں

معمول کے مطابق آج بھی زہراں اپنے باپ کا کھانا لے کر آئی تھی۔ وہ دوپہر کو کھانا لے آتی اور شام ڈھلتے ہی واپس چلی جاتی۔ اس دوران وہ پھل توڑنے یا درختوں کے گرداگرد اگی گھاس پھوس کی صفائی میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

آج جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو نہ جانے کیوں ایک بے نام سے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چلتے چلتے ایک دفعہ تو اس کے جی میں آئی کہ وہ واپس اپنے باپ کے باغ میں چلی جائے، لیکن کچھ سوچ کر اس نے اس فیصلے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے اپنی بزدلی پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ پچھلے دس سال سے اس کا یہی معمول تھا۔ پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ ایک روز جب اس کی ماں رات کو نماز پڑھنے کے بعد اس پر پھونکیں مار کر سوئی تو دوبارہ کبھی نہ اٹھی۔

آٹھ دس دن تک تو اس نے ماں کا سوگ منایا، پھر ننھی زہراں نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کا باپ روزانہ دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھائے اور پھر تین چار میل کا پہاڑی راستہ طے کر کے واپس جائے۔ اس نے اپنے باپ سے ایک روز کہہ ہی دیا۔ ''لالہ تم دوپہر کو نہ آیا کرو، کل سے میں تمہارے لیے کھانا لے آیا کروں گی۔''

باپ نے بڑی عجیب سی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''لمبا فاصلہ ہے اور...... پھر گھر پر بھی تو کسی کو ہونا چاہیے؟''

''بے بے جو ہے لالہ۔'' ننھی زہراں نے باپ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا جس کی آنکھیں کسی بھی لمحے چھلک جانے کو تیار بہ تیار تھیں۔

پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا ان کے یہاں۔ ان کی بے بے ہی گھر رہا کرتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی روٹی لے کر جایا کرتی تھیں اور دو تین گھنٹے باغ میں گزار کر واپس آ جاتی تھیں۔

لالہ نے اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے آنسو دیکھ کر ننھی زہراں رونا ہی نہ شروع کر دے، وہاں سے اٹھ جانے ہی میں مصلحت جانی اور جلدی جلدی دو چار نوالے زہر مار کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

اگلے روز جب وہ دوپہر کو گھر کی طرف آ رہا تھا تو اپنے باغ سے بمشکل ڈیڑھ فرلانگ دور واقع اس پہاڑی موڑ پر جہاں گڈریے درختوں سے ٹیک لگا کر ''ماہیا'' گایا کرتے تھے، اسے دور سے ننھی زہراں آتی دکھائی دی جس نے اپنے سر پر ماں کی طرح کپڑے کا ''اینوں'' بنا کر رکھا ہوا تھا اور اس پر بڑے سلیقے سے کھانے کے برتن سجائے ہوئے تھے۔

......ایک پرسوز سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔ دور سے آتی زہرں بالکل ماں کا عکس نظر آتی تھی۔ بچوں کی شکلیں عموماً اپنے ماں باپ ہی سے ملتی ہیں، لیکن جس حد تک زہراں اپنی ماں سے مماثلت رکھتی تھی، اس پر کبھی کبھی خود لالہ بھی حیرت زدہ رہ جاتا۔

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی لاڈلی کے سر سے برتن اتار کر زمین پر رکھے اور اسے اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔ بے اختیار اس کے دونوں گالوں پر آنسوؤں کے قطرے بہہ نکلے، لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ ''ابھی تو چھوٹی ہے بیٹی۔'' اس نے رندھے ہوئے گلے سے زہراں کو مخاطب کیا۔ ''اکیلی تھک جایا کرے گی۔''

''نہیں لالہ۔'' ننھی زہراں نے بڑی خوداعتمادی سے جواب دیا۔ ''میں تھکنے والی نہیں ہوں۔''

لالہ اسے باغ میں لے آیا اور شام تک اسے ساتھ ہی رکھا۔ شام کو وہ گھر لوٹے تو پریشان حال بے بے نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یوں تو شام کو دونوں باپ بیٹی اکٹھے ہی گھر واپس جایا کرتے تھے، لیکن جب درختوں پر پھل پکنے کے دن آتے تو لالہ ہفتے میں ایک آدھ دن ہی گھر آیا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کا زیادہ وقت دن کو پرندے اڑانے اور رات کو جنگلی جانوروں سے پھلوں کی حفاظت ہی میں گزر جاتا۔ زہراں ان دنوں اکیلی شام کو گھر لوٹا کرتی تھی۔



وہ بھی پھلوں کی تیاری کے دن تھے۔ اس کا باپ تو وہیں رہ گیا اور وہ خراماں خراماں گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

......سورج کا سرخ آتشیں گولہ اس کی داہنی سمت آنے والے پہاڑی سلسلے کی اوٹ میں نیچے ہی نیچے ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیاں لہورنگ ہونے لگی تھیں۔ اسے ڈوبتے سورج کا منظر بہت پسند تھا اور اکثر وہ کافی دیر تک کسی جگہ رک کر اس منظر سے دل بہلایا کرتی تھی۔ پہاڑی والے موڑ کے نزدیک بہتے جھرنے کے پاس دستِ قدرت نے جو بڑے بڑے سفید اور سیاہ رنگ کے پتھر بڑی نفاست سے سجا رکھے تھے، وہ گرمیوں کے دنوں میں ننگے پاؤں پتھروں پر سے پھسلتے پانی پر مضبوطی سے پاؤں جما کر بیٹھ جاتی۔ اکثر اس کی پنڈلیاں تک بے خبری میں پانی کی پھوار سے بھیگ جاتیں، لیکن وہ جھاگ اڑاتے پانی اور ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں ایسی غرق ہوتی کہ اپنے تن بدن کا اسے ہوش ہی نہ رہتا۔

ایک روز یوں ہی بیٹھے بیٹھے جب اس نے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں تو اچانک کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ زہراں ہڑبڑا کر اٹھی اور جب اپنے سامنے اس نے شیرو کو دیکھا تو گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس سے پہلے اس نے شیرو کا نام ہی سنا تھا یا بچپن کی وہ دھندلی سی یادیں تھیں جن کے سہارے اس نے گھبرو شیرو کا ایک سراپا اپنے ذہن میں سجا رکھا تھا۔ ''شیرو اس کے تصورات سے بھی بڑھ کر جوان اور خوبرو ہوگا۔'' جھرنے کی ساری گنگناہٹ اس کے بدن میں در آئی تھی۔

وہ لوگ تو پہاڑی کے پرلی طرف والے محلے میں بستے تھے جبکہ اس کا چچازاد...... شیرو، بازار والے محلے میں رہتا تھا...... ان دونوں کو مقامی رسوم کے مطابق پیدائش کے فوراً بعد ہی ایک دوسرے سے منسوب کر دیا گیا تھا اور جیسے جیسے زہراں کا شعور بیدار ہوتا گیا، ایک حجاب سا اس میں پیدا ہونے لگا...... لڑکپن ہی میں اس نے شیرو سے پردہ کرنا شروع کر دیا تھا اور آج جب وہ اچانک اس کے سامنے آیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنے حواس بحال کرے؟ تاہم اس نے بمشکل کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''چچا سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں تم نظر آ گئیں، سوچا تمہیں بھی دیکھتا چلوں کیسی لگتی ہو اب؟'' شیرو نے جرأت کا مظاہرہ کیا۔

زہراں نے جواب میں صرف ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا پھر کچھ کہے بغیر نظریں جھکا لیں، لیکن گونگے جذبوں کی زبان نے شیرو کے کانوں میں سرگوشی کی...... ''ہاں تو کیسی لگتی ہوں؟''

''میرے تصورات سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہو تم زہراں۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''جی......'' زہراں کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

اس دفعہ تو شیرو بھی گھبرا گیا۔ کسی نادیدہ طاقت نے بے اختیار اس کے جذبات کی ترجمانی اس کی زبان سے کروا دی تھی۔ اس کا یہ فعل قطعاً غیر ارادی تھا۔ پھر جیسے وہ مطمئن سا ہو گیا...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بات کہہ کر اس نے اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ ''ہاں زہراں۔'' اس نے سنبھالا لیا۔ ''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم......'' وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

پہاڑی کی اوٹ سے گڈریا اور بھیڑیں اکٹھی نمودار ہوئی تھیں۔ شیرو کو امید تھی کہ زہراں بھی کچھ کہے گی، لیکن وہ خاموشی سے دوپٹے کے پلو کو انگلی کے گرد مروڑتی رہی۔ البتہ دو تین مرتبہ اس نے زمین پر گڑی اپنی نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جیسے شیرو کے کہے الفاظ کی صداقت کو کریدنے کی کوشش کر رہی ہو اور وہاں سے جواب میں ''حق حق'' کی صدائیں سن کر پھر نظریں جھکا لیں۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' شیرو نے ڈھلان اترتی بھیڑوں اور رکھوالے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ زہراں کے سینے میں اس کی روانگی کے اعلان سے ایک ہوک سی اٹھی۔ بھیڑوں کے تعاقب میں آتا گڈریا نمایاں ہونے لگا تھا۔ جب شیرو نے روانگی کے لیے پہلا قدم اٹھایا، زہراں کا ہاتھ بے اختیار روکنے کے سے انداز میں اس کی سمت اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔

''پھر آؤں گا۔'' اس کے آگے کی سمت بڑھے ہاتھ کی لرزش نے شیرو کے اعصاب پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اس نے پلٹ کر بمشکل یہی ایک فقرہ کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس راستے کی طرف گھوم گیا جس پر چل کر زہراں یہاں آئی تھی۔

جانے والا تو چلا گیا لیکن زہراں کو ایک خوبصورت درد ہمیشہ کے لیے بخش گیا۔ یہ عجیب سرور بخش درد تھا جس کی لذت اس کی جان لیے جاتی تھی۔ جب تک بھیڑیں اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس جھرنے پر زہراں کے گرد دست قدرت کے بکھرے پتھروں پر نہ پھیل گئیں۔ وہ ٹکٹکی لگائے اس راستے کو گھورتی رہی جو چند فرلانگ کے بعد گھوم کر اس کے لالہ کے باغ تک جا پہنچتا تھا۔ پھر اس نے اپنی بے قابو دھڑکنوں کو سمیٹا اور ایک سرشاری کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جھرنے سے گھر تک کا فاصلہ اس نے شیرو کے تصورات کی نذر کر دیا۔

☆☆☆

اس کے بعد تو زہراں کا معمول ہو گیا کہ وہ اکثر یہاں سے گزرتے ہوئے ''کسی'' نہ آنے والے کی منتظر رہتی۔ دو ماہ اس اندوہناک انتظار میں بیت گئے، لیکن شیرو نہ آیا۔ پھر ایک روز وہ اس دن کی طرح اچانک ایک پہاڑی موڑ سے نمودار ہو کر اس کی راہوں میں آن کھڑا ہوا۔

اس دن شیرو کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں نمکین پانی لہریں مارنے لگا اور...... اس کے گالوں سے پھسلتے آبدار موتیوں کو دیکھ کر شیرو کے دل پر بھی ایک گھونسہ سا لگا۔

''کیا بات ہے زہراں؟'' اس نے پہلی ملاقات کی طرح آج بھی بے اختیار آگے بڑھ کر زہراں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ اظہار ہمدردی تھا یا اعجاز مسیحائی کہ زہراں بلک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ ''آئے کیوں نہیں ......اس دن کے بعد سے؟'' وہ سسک پڑی۔

''ارے پگلی کہیں کی، بات ہی ایسی ہوگئی تھی۔ وہی تو تمہیں بتانے آیا ہوں۔'' اس نے زہراں کی کمر پر تھپکی دے کر کہا۔

''کیا بات تھی......؟'' زہراں یک لخت جیسے نیند سے بیدار ہوگئی۔ اس احساس نے کہ وہ بے اختیار شیرو کے سینے سے لگ گئی تھی، اس کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھادی...... حجاب اور احساس ناکردہ گناہ نے اس کے کانوں کی لوئیں تک سرخ کردی تھیں۔

''آؤ زہراں، وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' شیرو نے بڑے سنجیدہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

شیرو کے لہجے کی سنجیدگی اور اس کی اس طرح پر اسرار آمد نے زہراں کو چونکا دیا۔ وہ متجسس سی اس سمت اس کے تعاقب میں بڑھ گئی، جہاں وہ اس گزرگاہ پر آنے جانے والوں کی نظروں سے بالکل چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔ شیرو اسے یہاں تک لے تو آیا تھا، لیکن یہ بات اسے بھی پریشان کرنے لگی تھی کہ آخر زہراں کو وہ سب کچھ کہہ بھی پائے گا جو کچھ کہنے کے لیے اسے یہاں لایا ہے۔ کیا اس کا معصوم دل یہ صدمہ سہہ بھی سکے گا؟

وہ تو ایک مرتبہ مل کر دوبارہ نہ ملنے پر بلکنے لگی تھی۔ شیرو کو کچھ نہ سوجھتا تھا کہ آخر زہراں کو وہ کیسے مطمئن کر پائے گا۔ اس کا اس دنیا میں لالہ، بے بے اور شیرو کے سوا اور ہے ہی کون؟ دو تین ماہ بعد جب وہ لوگ پھلوں کی ایک فصل سے فارغ ہوجاتے تو لالہ دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتا۔ اب جو اچانک وہ اسے ایک لمبی جدائی کے سانحے سے دوچار کرنے آیا ہے تو کیونکر وہ اس حادثہ جانکاہ سے سنبھل سکے گی؟ پھر ایک مضبوط ارادے نے، ایک قوی خیال نے جیسے اس کے خیالات کی ڈولتی ناؤ کو کنارہ دکھا دیا۔

اس نے سوچا وہ کوہساروں کی بیٹی سے مخاطب ہے۔ وہ......اس نسل کا نمائندہ ہے جس کو حالات نے مادر کشمیر کو غیروں کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرنے کی سعادت نصیب کی ہے......وہ کشمیر کو ڈوگرہ فوج سے آزاد کروانے جا رہا ہے......وہ اپنے شہید باپ کے نقش پا پر چلنے جا رہا ہے۔ اس کا مشن بہت عظیم تھا۔ اتنا عظیم کہ جس کے لیے ایک زہراں تو کیا، اگر ایسی ایک لاکھ زہراں بھی قربان ہوجائیں تو سودا مہنگا نہیں۔ وہ اپنی قوم کو، اپنے آنے والے لوگوں کو ایک محفوظ مستقبل اور ایک آزاد کشمیر دینے جا رہا تھا۔

وہ آزادی کے راستے کا مسافر تھا۔ اسے ابھی ایسے کئی سنگ میل پاٹنے تھے۔ ابھی تو قربانیوں کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہوا تھا۔ ابھی تو طبل جنگ پر پہلی ضرب پڑی تھی۔ نہ معلوم اس جیسے کتنے شیرو اپنی زہراں کی نذر آزادی کا گزاریں گے؟

بقاء کی یہ جنگ جس کا آغاز اس کے بزرگوں نے آج سے کئی سال پہلے کر دیا تھا۔ ان کے راستے پر پہلا بھرپور قدم بڑھانے والوں میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس جیسے ہزاروں سعادت منداس جنگ کے ہراول دستے میں شامل تھے۔

''زہراں'' اس نے اپنے اردگرد پھیلے پہاڑوں کی مضبوطی کو اپنے لہجے میں سمیٹ کر اپنی منگیتر کو مخاطب کیا۔ ''میں آج جس مشن پر جا رہا ہوں، وہ نہ تو میرے لیے کوئی نئی بات ہے نہ تمہارے لیے۔ پچھلے دو ماہ میں نے ٹریننگ ہی میں گزارے ہیں اور کل سے ہمارا جہاد باقاعدہ شروع ہو جائے گا اور اگر میں اس راستے میں مارا جاؤں تو خود کو خوش نصیب جانوں گا۔ میں تم پر کوئی قدغن نہیں لگانا چاہتا۔ ایک درخواست ضرور ہے کہ میری

ماں اس دنیا میں اکیلی ہے، اگر میں لمبی مدت کے لیے مصروف ہو جاؤں تو کبھی کبھی اس کی خبر لے لیا کرنا۔''

......اور وہ حوصلہ جو اس نے گفتگو کے آغاز میں باندھا تھا، اب زہراں کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں میں پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ شیرو کے لفظ نشتر بن کر اس کے دل میں اتر رہے تھے......اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

......لیکن بعد میں اسے اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا۔ وہ راہ آزادی کے ایک مجاہد کی منگیتر تھی۔ اس نے سوچا: ''مسلمانوں کی بیٹیاں اپنے خاوندوں کو اس طرح تو رخصت نہیں کیا کرتیں۔ اس کے آباء و اجداد نے سکھوں، انگریزوں اور ڈوگروں کے خلاف اپنا جہاد کبھی منسوخ نہیں کیا تھا اور اس کا محبوب بھی اپنے اسلاف کی تقلید کر رہا تھا۔ اس نے بڑے پر عزم لہجے میں شیرو کو مخاطب کیا۔ ''شیرو میں تمہاری آبرومندانہ واپسی کا انتظار کروں گی۔ فی امان اللہ۔''

اس نے اچانک ہی وہاں سے اٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہیں اس کے محبوب کے پائے ثبات میں اس کی موجودگی یا اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو لغزش پیدا نہ کر دیں۔

''خدا حافظ زہراں۔'' اپنی پشت سے اسے شیرو کی آواز سنائی دی، لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا اور چلتی چلی گئی۔

............☆☆☆............

یہ اس کی اور شیرو کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد سے اسے شیرو کی کوئی خبر نہ ملی۔

......اور آج اس نے اپنے والد سے جب بار بار اپنی چچی کے ہاں جانے پر اصرار کیا تو ادھیڑ عمر لالے کے ماتھے پر پڑی تیوریاں کچھ گہری سی ہو گئیں۔ اسے یہ تو علم تھا کہ شیرو بجیرہ کی طرف نکل گیا ہے، لیکن پچھلے ایک ہفتے بھر سے انہیں شیرو کی کوئی خبر نہیں ملی تھی، حالانکہ اس معرکے میں حصہ لینے والے لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں میں خیریت کی اطلاع بھیج چکے تھے۔ حیرت تو اس بات پر تھی کہ شیرو کے لنگوٹیے دوست شرفو کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہ ملی تھی۔ پچھل تین چار روز سے اس کا جانا شیرو کی ماں کی طرف بھی نہیں ہوا تھا۔ اب جو زہراں نے اسے یاد دلایا تو وہ جیسے گہری نیند سے چونک اٹھا۔

''میں رات کو گھر جلدی آؤں گا بیٹی۔ پھر تمہاری چاچی کی طرف چلیں گے۔'' اس نے زہراں کو مطمئن کر کے واپس گھر بھیج دیا۔

اپنی دانست میں لالہ نے زہراں کو مطمئن کر دیا تھا، لیکن اسے جو ایک بےکلی سی لگ گئی تھی وہ کسی طور کم نہ ہوئی۔ یہی کچھ سوچتی وہ جھرنے سے اٹھی اور کھوئی کھوئی سی اپنے گھر کو چل دی۔ اسے بےچینی سے رات کا انتظار تھا تاکہ لالہ کے ساتھ جا کر اپنی چاچی کی خبر لے۔

گھر سے یہاں تک کا فاصلہ وہ بڑی آسانی سے اور بھاگتی کودتی طے کیا کرتی تھی، لیکن آج اسے نہ جانے کیوں اپنا ہر قدم من من بھر کا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تھکی تھکی سی اپنے وجود کو اپنے گھر کی سمت گھسیٹ رہی تھی، جب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس نے اپنے ہمسائے لالہ مہاویر پرشاد کو اس طرف آتے دیکھا۔

مہاویر کی لڑکی کملا اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ ان کے مکان سے تیسرا مکان مہاویر پرشاد کا تھا۔ محلے میں اور بھی بہت سے ہندوؤں کے

مکان تھے۔ سب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ لالہ مہاویر کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اکثر لوگ تو اسے دیکھ کر دور ہی سے کنی کترا کر نکل جایا کرتے تھے۔

پہلے پہل تو زہراں کو یہ بات عجیب سی لگی کیونکہ لالہ مہاویر پرشاد اسے اپنی بیٹی کی طرح پیار کیا کرتا تھا۔ وہ جب کبھی سری نگر جاتا، واپسی پر اپنی بیٹی کملا کے ساتھ اس کے لیے بھی ضرور کوئی تحفہ لے کر آتا تھا۔ اکثر کوئی کھلونا یا ہاتھ سے بنی ہوئی کوئی چیز۔ ایک مرتبہ جب اس نے اپنے لالہ سے پوچھا کہ لوگ آخر اس سے ملنا کیوں پسند نہیں کرتے تو اس نے زہراں کو اس کا سبب مہاویر پرشاد کی پولیس سے دوستی بتایا تھا۔

"یہ کوئی بری بات تو نہیں لالہ۔" زہراں نے کمال معصومیت سے کہا تھا۔

"ابھی تم بچی ہو، ان معاملات کو نہیں سمجھو گی۔" اس کے لالہ نے اپنی بیٹی کے ممکنہ سوالات کی بوچھاڑ سے پناہ چاہی۔

تب زہراں واقعی بچی تھی، لیکن جلد ہی اسے اس بات کی سمجھ بھی آ گئی جب ایک روز ان کے پچھواڑے رہنے والے کرم سنگھ کی پتنی نے بین کر کے سارا محلہ اکٹھا کر لیا۔ وہ چلا چلا کر لوگوں کو بتا رہی تھی کہ مہاویر نے پولیس کی مدد سے اس کی لڑکی کو غائب کروا دیا ہے کیونکہ اس نے مہاویر پرشاد کی ہوس کا نشانہ بننے سے انکار کر دیا تھا۔

سارا محلہ اسے گالیاں دے رہا تھا، لیکن کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ لوگ جانتے تھے کہ اس کے تعلقات مقامی انتظامیہ سے ہی نہیں بلکہ سری نگر میں دربار تک اس کی رسائی ہے۔ اس لیے کوئی اس کے منہ لگنا پسند نہ کرتا تھا۔ زہراں کو یہ بھی اچھی طرح یاد آنے لگا تھا کہ جب ایک مسلمان نوجوان نے کسی بات پر طیش کھا کر اس کی پٹائی کر دی تھی تو لالہ مہاویر پرشاد نے اس کے سارے خاندان کا وہ برا حشر کروایا تھا کہ لوگوں نے کانوں میں انگلیاں لگا لیں تھیں۔

چاہے وہ کچھ بھی تھا، زہراں کو بہر حال کبھی اس سے خوف نہ آیا۔ اس کی وجہ شاید اس کی اور کملا کی دوستی تھی، لیکن اس روز جب اس نے مہاویر پرشاد کو دیکھا تو ایک بے نام سے خوف نے اس کے ذہن کو ڈس لیا۔ اسے یوں لگا جیسے مہاویر کی شکل میں کوئی بہت بڑی مصیبت اس کی طرف بڑھنے والی ہے۔

"کیسی ہو بیٹی؟" اس نے زہراں کو دیکھتے ہی کمال مکاری سے اپنی بتیسی کھولی۔ "میں تمہاری ہی طرف جا رہا تھا۔"

سنسنی کی ایک تیز لہر زہراں کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی...... لالہ مہاویر پرشاد کے عقب میں ٹیلوں سے اس نے ڈوگرہ فوجیوں کو برآمد ہوتے دیکھا۔

نوواردوں کی تعداد تین تھی۔ یہ غالباً وہی فوجی تھے جو آج کل کافی تعداد میں چھاؤنی میں آئے ہوئے تھے اور مقامی مسلمان آبادی پر دہشت طاری کرنے کے لیے خواہ مخواہ شہر میں گشت کر رہے تھے۔

اس کا حلق ایک دم سوکھ گیا تھا۔ خوف سے اسے اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکی۔ لالہ مہاویر پرشاد کا چہرہ شیطان کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹنے کی حد تک کھل گئیں۔ تینوں فوجی اس شیطان کے چیلے چانٹے دکھائی

دیئے جن کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ وہ سب ہوسناک اور کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

''سرکار نے تمہیں بلایا تھا۔ میں نے کہا تم ڈر نہ جاؤ۔ اس لیے ان لوگوں کے ساتھ آ گیا ہوں۔'' اسے شیطان کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی سنائی دی۔

زہراں نے چیخنا چاہا، لیکن اس کا نطق تو جیسے تھا ہی نہیں اور جو ذرا سی دھیمی سی آواز اس کے حلق سے نکلی وہ بھی لالہ مہاویر پرشاد کے قہقہے میں دب کر رہ گئی۔

''لے چلو حوالدار جی۔'' اس نے لالہ جی کی دھاڑ سنی۔

تینوں بھیڑیے اس کی سمت بڑھے۔ اس لمحے نہ جانے کہاں سے اس کے جسم میں گمشدہ طاقت لوٹ آئی۔

وہ دیوانہ وار واپس بھاگی، لیکن بمشکل چند قدم ہی اس نے اٹھائے تھے کہ مہاویر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے لپک کر زہراں کا بازو پکڑ لیا۔

چاروں شیطان اس کی بے بسی اور ڈراؤنی چیخوں پر قہقہے لگاتے ہوئے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے لالہ مہاویر پرشاد کا منہ نوچ لیا، لیکن وہ شیطان تو اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے اپنے منہ نوچ جانے کی پروا تھی ہی کب۔ وہ تو اس انعام کے نشے میں سرشار تھا جو اسے میجر رام سنگھ کی طرف سے ملنے والا تھا۔

رفتہ رفتہ زہراں کی مدافعت دم توڑنے لگی۔ اس کی چیخوں کی بازگشت ختم ہونے لگی اور پہاڑیوں پر پھر وہی پراسرار سا سکوت طاری ہو گیا۔

......ایک ڈوگرہ فوجی نے بے ہوش زہراں کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ لوگ اسے اس جیپ تک لے آئے جو راستے کے ایک طرف اسی مقصد کے لیے کھڑی کی گئی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ جیپ پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

............☆☆☆............

لالہ گھر پہنچا تو یہ بری خبر اس کی منتظر تھی کہ زہراں ابھی تک نہیں آئی۔ بوڑھی بے بے پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلتی پھر رہی تھی۔

''ممکن ہے وہ اپنی چاچی کی طرف گئی ہو؟'' لالہ کے ڈوبتے ذہن نے تنکے کا سہارا تلاش کیا۔

''ہاں ہے تو ضد کی پکی۔ اگر اس نے تم سے کہا ہے تو شاید ادھر ہی چلی گئی ہو۔'' بے بے نے بھی خوش فہمی میں پناہ چاہی۔

''لیکن میں نے اسے انتظار کرنے کو کہا تھا، اسے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا'' لالہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''یہاں بیٹھے باتیں ہی بناتے رہو گے یا جاؤ گے بھی اس طرف؟'' بے بے نے زچ ہو کر کہا۔

''جاتا ہوں۔''

لالہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ شیرو کے گھر کی طرف تھا۔

......سارے راستے اس کا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔ اسے وادی میں اٹھنے والے طوفان کی خبر تھی۔ ہر کشمیری اس کی طرح اس بات کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ آزادی کی وہ دبی دبی چنگاریاں جو ان کے اسلاف نے سلگائی تھیں، وہ بھڑک کر اب شعلوں کا روپ دھار چکی ہیں۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ اب کسی بھی لمحے یہاں کوئی طوفان آیا کہ آیا۔ آج جو زہراں اس طرح اچانک گھر نہیں پہنچی تو اس کا ذہن فوراً اس طرف گیا تھا کہ وہ صرف زہراں کا باپ ہی نہیں، ایک باشعور کشمیری بھی تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے دشمن کس حد تک جا سکتا ہے۔

''اگر خدانخواستہ شیروان لوگوں کے ہتھے زندہ چڑھ چکا ہے اور انہیں شیرو اور زہراں کے رشتے کا بھی علم ہے تو......؟'' اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔

اپنی بھابی کے گھر وہ ایک مدہوشی اور بے خبری کے عالم میں پہنچا تھا۔ اسے بھروسہ تھا کہ زہراں یقیناً اندر موجود ہوگی اور اس کی آہٹ پہچانتے ہی ''لالہ لالہ'' کہتی بانہیں پھیلائے اس کی سمت لپکے گی لیکن یہ کیا؟

اس کے دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی جب کوئی باہر نہ نکلا تو وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا گھسا...... سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ لالہ نے دیوانہ وار گھر کے تینوں کمروں میں دیکھا، لیکن وہاں تو کسی کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے دو تین آوازیں بھی اپنی بھابی اور زہراں کو دیں، لیکن اس کی آوازیں خالی کمروں کی دیواروں سے ٹکرا کر شور پیدا کرنے کے سوا اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

''شاید اس کی چاچی اسے چھوڑنے کے لیے اس کے گھر کی طرف چلی گئی ہو؟'' لالہ نے اپنی بے لگام سوچوں کو تھامنا چاہا۔

پھر اس نے جانے کیسے ہمت کر کے ہمسائے کا دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے ایک عورت کے نکلنے پر اس نے شیرو کی ماں کے متعلق دریافت کیا، لیکن اندر سے نکلنے والی عورت نے اس کے دو تین روز پہلے چلے جانے کی خبر دی۔

''کچھ بتایا تو ہوگا اس نے؟'' لالہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

''کچھ بھی تو نہیں۔ بہت جلدی میں تھی۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی اسے لینے آیا تھا۔ کوئی رشتے دار بتا رہی تھی اپنا۔ جاتے جاتے صرف اتنا کہہ گئی کہ کل تک لوٹ آؤں گی۔''

''کیسی شکل تھی اس کی؟'' لالہ نے بے بسی سے پوچھا اور جواب میں عورت نے اشاروں اور باتوں کی مدد سے جو شکل اسے سمجھائی، اس کے متعلق نہ اس نے کبھی سنا نہ اسے کبھی دیکھا تھا۔ اب اس کی پریشانی حیرت اور پھر گھبراہٹ میں بدلنے لگی تھی۔ ''زہراں اچانک کہاں غائب ہوگئی؟ شیرو کی ماں کس کے ساتھ گئی ہے؟''

''مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے بھائی جی۔'' اس عورت نے سہمی سہمی سی آواز میں کہا: ''شیرو گرفتار ہو چکا ہے نا۔ صبح پولیس والے بھی آئے تھے۔''

اس کے بعد اس میں کچھ کہنے سننے کی تاب نہ رہی۔

......وہ پاگلوں کی طرح اپنے واقف کاروں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا، لیکن زہراں اور اس کی چاچی یہاں کہیں ہوتے تو پتہ چلے۔ کسی نے انہیں کہیں آتے جاتے بھی تو نہیں دیکھا تھا۔

رات گئے جب وہ شکستہ دل، لڑکھڑاتے قدموں سے گھر پہنچا تو بے بے کو اس نے وہیں دروازے کی دہلیز پر بیٹھے پایا جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

زہراں کی اچانک گمشدگی بوڑھی عورت کے حواس پر بجلی بن کر گری۔ لالہ نے محلے کی دو تین عورتوں کو مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ سب نے مل کر اس کے تلوؤں کی مالش کی تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا، لیکن وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک سے اپنی زہراں کا پتہ پوچھنے لگی۔

............☆☆☆............

حسین خان کا چہرہ غصے اور قہر سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ریاست علی اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی صفائی میں آخر کیا کہے۔

''ریاست علی!'' حسین خان کی آواز میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ''تم...... تمہیں کیا ہو گیا تھا ریاست علی۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ ......'' حسین خان کی بات نامکمل رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ اپنے بے قابو غصے پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

''کاش...... کاش میرے پاس رائفل ہوتی۔ میں بہت دور تھا حسین خان...... بہت دور۔ اگر وہاں سے فائر کرتا بھی تو سوائے اس کے کہ وہ لوگ مزید ہوشیار ہو جاتے اور گھیر گھار کر مجھے مار ڈالتے اور کچھ نہ ہوتا۔ اس طرح شاید تم لوگوں تک یہ اطلاع بھی نہ پہنچ پاتی۔''

''ٹھیک کہتے ہو ریاست علی! شاید میرا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حسین خان نے بے بسی اور غصے سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھی بھینچ لیں۔

''ہاں! ہاں! ! ایک دفعہ پھر مجھے ساری بات بتاؤ۔'' حسین خان خود کو نارمل کرنے کے لیے حتی المقدور کوشاں تھا۔

''میں اچانک اس طرف جا نکلا۔'' ریاست علی نے ایک لمبی سانس لی...... ''لالہ مہاویر پرشاد کو میں نے بہت دور سے پہچان لیا تھا...... اس کی اس طرف آمد ہی میرے نزدیک مشکوک تھی، لیکن میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ اتنے خطرناک ارادے سے یہاں آئے گا؟ تین سپاہی تو اس کے ساتھ تھے جبکہ آٹھ دس کسی ممکنہ مداخلت کے پیش نظر پہاڑیوں پر مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔ حسین خان! خدا ہی بہتر جانتا ہے میں نے کس طرح خود پر قابو پایا۔ سچی بات تو یہ ہے میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں مار ڈالوں یا مر جاؤں، لیکن میں نے بہر حال خود پر قابو رکھا۔ اگر کسی کو وہاں میری موجودگی کا ذرا شک بھی گزرتا تو وہ لوگ مجھے گھیر کر مار ڈالتے اور پھر شاید......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''خدا کی قسم اسے اس جرم کی اتنی بھیانک سزا بھگتنا ہو گی کہ پونچھ کی پہاڑیاں بھی اس کے بدترین حشر سے پناہ مانگیں گی۔ رات کا انتظار کرو دوستو! آج کی رات فیصلہ کن ہو گی۔ بخدا ہم اسے ہرگز مہلت نہ دیں گے۔'' حسین خان کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

وہ لوگ پونچھ سے قریباً چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع اس گھنے جنگل میں گزشتہ چالیس گھنٹوں سے قیام پذیر تھے...... اشرف خان نے وہاں پہنچ کر انہیں شیرو کی گرفتاری کی اطلاع دی تھی۔ اس نے ایک درخت پر چڑھ کر اور چھپ کر یہ سارا منظر دیکھا تھا۔

...... حسین خان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ ان کا ایک جیالا سپاہی اس طرح دشمن کے ہتھے چڑھ کر اذیت کا نشانہ بنا رہے۔ وہ لوگ اسے رہا کرانے کا عزم لے کر آئے تھے اور اشرف خان نے تب سے اب تک آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے دوست نے یہ عظیم الشان قربانی

صرف اسے بچانے کے لیے دی ہے اور وہ اب تک اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اس احساس نے اسے خاصا پریشان کر رکھا تھا کہ اب اچانک زہراں کے اغوا کی خبر بھی انہیں مل گئی۔ شیرو کی ماں کے غائب ہونے کی اطلاع بھی وہاں پہنچ چکی تھی، لیکن کسی مصلحت کے پیش نظر یہ خبر ابھی تک حسین خان اور اس کے دو تین ساتھیوں تک ہی محدود تھی۔

حسین خان نے سختی سے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ شیرو کی ماں کی گمشدگی کا علم اشرف خان کو نہ ہونے پائے۔ اسے اپنے اس مخبر کا بے چینی سے انتظار تھا جو اس بات کی خبر لاتا کہ شیرو کی ماں تھانے میں موجود ہے یا میجر رام سنگھ اسے اپنے خصوصی تفتیشی مرکز پر لے گیا ہے؟

خدا خدا کر کے دوپہر کے بعد نصیب کی آمد ہوئی۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے اس نے بڑا محفوظ اور اجاڑ راستہ اپنایا تھا اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا۔ ہر طرح مطمئن ہو کر اور کافی دیر پہاڑیوں میں خواہ مخواہ ادھر ادھر چکرانے کے بعد آخر وہ ان کے محفوظ ٹھکانے تک آ پہنچا تھا۔

نصیب کو حسین خان نے دور ہی سے آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑی بے قراری سے پہاڑی ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر تیزی سے اس راستے پر چلنے لگا جس سے گزر کر نصیب کو اس تک پہنچنا تھا۔

نصیب جب ایک پہاڑی موڑ گھوما تو اس نے حسین خان کو اپنا منتظر پایا۔

''کیا خبر لائے؟'' اس نے چھوٹتے ہی بڑی بے چینی سے پوچھا۔

''حیرت ہے۔'' نصیب نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

''پہیلیاں نہ بجھواؤ نصیب۔'' حسین خان نے سخت اضطراب کا مظاہرہ کیا۔

''شیرو کی ماں پولیس یا فوج کے کسی تفتیشی مرکز میں نہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں حسین خان۔ نہ تو پولیس اس تک پہنچ سکی اور نہ ہی فوج بلکہ میجر رام سنگھ تو پاگلوں کی طرح اس کی بو سونگھتا پھر رہا ہے۔''

''لیکن وہ گئی کہاں؟'' حسین خان نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں خود حیران ہوں۔ اس کے ہمسایوں سے علم ہوا کہ کوئی درمیانی عمر کا آدمی اسے آ کر لے گیا تھا، شاید اس کا کوئی رشتے دار تھا۔'' نصیب بولا۔

''لیکن لالہ نے تو ایسے کسی بھی رشتے دار کی موجودگی سے انکار کیا ہے۔'' حسین خان نے اس کی بات کاٹ دی۔

''حیرت تو اس بات کی ہے کہ اس نے کسی جبر کے بغیر اس اجنبی کی بات مان لی۔ نہ تو اس کے گھر میں تشدد یا ہنگامے کا کوئی ثبوت ملا ہے نہ ہی اس کے ہمسایوں کی زبانی ایسی کسی بات کا علم ہوا...... وہ بڑے اطمینان سے اپنے گھر سے رخصت ہوئی اور ہمسایوں کو خود اس نے بتایا کہ اپنے کسی

رشتہ دار کے ساتھ وہ کسی دوسرے شہر جا رہی ہے۔''

''کون ہو سکتا ہے وہ؟'' حسین خان نے کسی گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''ایک بات تو ثابت ہے حسین خان۔'' نصیب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو کوئی بھی تھا دشمن نہیں تھا، دوست تھا اور اس نے مصلحت اسی میں جانی کہ کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہونے دے۔''

''لیکن وہ کم از کم ہمیں تو آگاہ کر دیتا، آخر ہم اس کے......''

''حسین خان! کیسی بات کرتے ہو تم؟ ممکن ہے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا ہو۔ ہمارے لیے یہ اطمینان ہی کیا کافی نہیں کہ شیرو کی ماں بہر حال محفوظ ہاتھوں میں ہے۔'' نصیب نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اگر تمہاری بات مان لی جائے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ضرور کوئی سرکاری ملازم تھا اور زیادہ اغلب یہی ہے کہ وہ پولیس کا کوئی ملازم ہے۔ کوئی ایسا ملازم جو ہمارے لئے اپنے دل میں ہمدردی رکھتا ہے اور جسے علم تھا کہ میجر رام سنگھ شیرو کی زبان کھلوانے کے لیے ضرور اس کی ماں کو گرفتار کر کے اس کے سامنے لائے گا۔'' حسین خان بولا۔

دونوں اب اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ حسین خان نے اس سے کہا تھا...... ''وہ فی الحال اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھے۔'' وہ اب بھی محتاط رہنا چاہتا تھا۔ حسین خان منجھا ہوا اور جہاں دیدہ سپاہی تھا۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں کئی مرتبہ موت کے منہ سے بچا تھا۔

...... حسین خان بخوبی جانتا تھا کہ حالیہ قائم شدہ اس مختصر سی فوج میں جس کا وہ کمانڈر ہے، کئی جذباتی اور جوشیلے جوان موجود ہیں...... اس نے زہراں کی گمشدگی کے بعد بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں قابو میں رکھا ہوا تھا اور اگر انہیں شیرو کی ماں کے اغواء کی خبر بھی مل جاتی تو وہ یقیناً اس کے کنٹرول سے باہر ہو کر کوئی ایسی انتقامی کارروائی کر گزرتے جو ان سب کو مروا ڈالتی۔

اس نے اس فوج کی تنظیم بڑی جان سوزی سے کی تھی اور ابتدائی مراحل ہی میں وہ اگر کسی ٹوٹ پھوٹ یا ہنگامے کا شکار ہو جائے؟ یہ سوچ ہی اس کے لیے جان لیوا تھی۔

............☆☆☆............

اکتوبر 1947ء کی ایک شام:

جنرل طارق کا خفیہ ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں قائم ہو چکا تھا۔ ابھی تک وہ سردار ابراہیم کے ساتھ مل کر صرف حالات کا جائزہ لیتے رہے تھے اور مجاہدین کی ممکنہ کارروائیوں کے لیے اسلحہ جمع کرنے کی فکر میں تھے۔ ایک روز اچانک انہیں پیغام ملا کہ وہ فوراً لاہور سیکرٹریٹ پہنچیں جہاں ایک ہنگامی اجلاس اس سلسلے میں بلایا گیا ہے۔

اس دوران سویلین اعلیٰ حکام کے اصرار پر جنرل طارق نے ''کشمیر کے اندر مسلح بغاوت'' کے عنوان سے ایک منصوبہ تیار کر کے پیش کر دیا تھا اور اب وہ بڑی بے چینی سے اپنے اس کاغذی منصوبے پر سول حکام کے ردعمل کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر روز ان کے ہیڈ کوارٹر میں کوہالہ سے گزر کر

مری اور راولپنڈی پہنچنے والے کشمیری مجاہدین کے ذریعے مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کی تازہ ترین اطلاعات جمع ہو رہی تھیں۔ ٹھنڈے مزاج اور فولادی ارادوں کا مالک یہ جرنیل بڑی خاموشی سے فی الوقت اپنے وسائل اکٹھے کرنے پر اپنی ساری توجہ صرف کیے ہوئے تھا۔ جنرل طارق کی مقدور بھر کوشش تھی کہ وہ اپنی پراسرار سرگرمیوں کا انکشاف فرنگی افسران پر نہ ہونے دے۔ اسی لیے اس کے ہیڈ کوارٹر میں خاصی رازداری برتی جا رہی تھی۔

راولپنڈی سے لاہور تک کا سفر بھی اس نے بڑی خاموشی سے اور سرکاری کاغذات میں ''ایک سرکاری کام کے لیے'' کیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی وہ سیدھا سیکرٹریٹ گیا جہاں ایک اجلاس میں اس مسئلے پر گرما گرم بحث جاری تھی۔ میاں افتخار الدین (مرحوم) اپنا ہنگامی دورہ سری نگر مکمل کر کے واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے فوراً وہاں کے حالات اور ممکنہ اقدامات کے متعلق اپنی رائے کے ساتھ ایک رپورٹ پیش کی جو جنرل طارق کے پیش کردہ پلان کے ساتھ ہی زیر بحث تھی۔

یہ اجلاس سردار شوکت حیات کی سرکردگی میں جاری تھا۔ جنرل کے لیے باعث اطمینان بات یہ تھی کہ ان کے تیار کردہ پلان کی نقلیں حاضرین کے ہاتھوں میں موجود تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے اسے جستہ جستہ پڑھا بھی ہے۔ یہاں جنرل طارق کے پیش کردہ منصوبے پر تو کسی نے زیادہ بحث نہ کی۔ ایک اور تجویز بالاتفاق طے پا گئی جس کے مندرجات کچھ اس طرح تھے۔

سابقہ انڈین نیشنل آرمی کے جوانوں کو میجر زمان کیانی کی قیادت میں مسلح کر کے پنجاب کی سرحد سے کشمیر میں داخل کر دیا جائے تاکہ یہ لوگ فوراً وہاں پھیل کر کارروائیاں شروع کر دیں۔

راولپنڈی کے شمال کا سیکٹر میجر خورشید انور سنبھالیں گے۔ یہاں سے وہ لوگ قبائلی پٹھانوں کے ذریعے مجاہدانہ کارروائیوں کا آغاز کریں گے۔

اس طرح اس جنگ کو دو سیکٹروں میں پھیلا دیا گیا تھا اور دونوں کی مشترکہ کمان سردار شوکت حیات نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

جنرل طارق کے لیے یہ امر باعث مسرت تھا کہ ان کی ساعی بہرحال رنگ لائی اور کشمیر میں مسلح بغاوت کر کے مجاہدین کی مدد کرنے اور کشمیر کو ڈوگرہ اور بھارتی سامراج سے محفوظ رکھنے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ انہوں نے اس منصوبے کو اپنے منصوبے سے مربوط کر کے ایک شاندار پلان تیار کر لیا۔ یہیں ان کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ پنجاب پولیس کے لیے چار ہزار رائفلیں جاری کرنے اور ان سے لے کر مجاہدین کو دینے کے انتظامات بھی مکمل ہو گئے ہیں۔

اسی شام جنرل طارق ابھی اپنے ساتھیوں کو تازہ منصوبہ بریف کر ہی رہے تھے کہ سرکاری ہرکارے نے انہیں وزیراعظم سے فوری ملاقات کا پیغام پہنچایا۔

تھوڑی دیر بعد ہی چیدہ چیدہ ملکی رہنماؤں اور اس منصوبے میں بھرپور حصہ لینے والے سویلین حکام کے ساتھ جو وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم کے ساتھ جنرل طارق کے منتظر تھے، جنرل نے گفتگو شروع کی۔ جنرل نے محسوس کیا کہ یہاں مخلصانہ گرمجوشی تو موجود ہے، لیکن عملی اقدامات کے متعلق ان لوگوں کا رویہ بڑا سرد تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہ وہ حکومت پاکستان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ جنرل نے اس بات کی خاصی یقین دہانی کروائی کہ وہ نہ صرف اپنے تیار کردہ منصوبے کے مطابق خدمات انجام دیں گے بلکہ اس کے علاوہ بھی انہیں جو حکم دیا جائے گا، اس کی تعمیل کریں گے۔

کانفرنس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی میجر خورشید انور کا بازو پکڑ کر انہیں ایک طرف لے گئے۔

''جنرل!'' انہوں نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں سردار شوکت حیات کی کوئی بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

میجر خورشید انور کی اس بات نے جنرل طارق کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس منصوبے میں انہیں بڑا اہم اور کسی حد تک مرکزی کردار ادا کرنا تھا اور انہوں نے ابتدائی لمحات ہی میں جب کہ ابھی منصوبہ زیر غور ہی تھا، بداعتمادی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ جنرل نے چاہا کہ انہیں سمجھائیں لیکن ان کے سخت رویے کے سامنے انہوں نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی اختیار کر لی۔

تھوڑی دیر بعد ہی سردار شوکت حیات بھی انہیں ایک طرف لے گئے۔ انہوں نے بلا کسی تمہید کے جنرل سے کہا کہ انہیں میجر خورشید انور پر اعتماد نہیں۔

جنرل گڑبڑا کر رہ گئے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابتدا ہی میں ان کے ساتھیوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے بعد میں پیش آنے والی قباحتوں سے بچنے کی سبیل کی اور سردار شوکت حیات سے کہا کہ وہ وزیر اعظم سے کہہ کر میجر خورشید انور کو اس منصوبے سے الگ کر لیں۔

''یہی تو مصیبت ہے جنرل کہ میں وزیر اعظم سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' شوکت حیات نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں؟''

''اس لیے کہ خورشید انور اسی کا مقرر کردہ ہے۔''

جنرل نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ اگلی کوئی بات کہے سنے بغیر ان سے ہاتھ ملا کر واپس چلے آئے۔

............☆☆☆............

لالہ مہاویر پرشاد بھی ان کے ساتھ ہی آیا تھا، لیکن اس کی خصوصی ہدایت پر وہ لوگ جیپ کو بڑے محفوظ راستوں سے گزار کر لائے تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے دی تھی...... یہ لوگ میجر رام سنگھ کے خصوصی دستے سے تعلق رکھتے تھے اور ایسے کئی ''کارنامے'' وہ اس سے پہلے بھی انجام دے چکے تھے۔ لالہ مہاویر پرشاد سے ان کی آشنائی کوئی نئی بات نہیں تھی، اس لیے لالہ مہاویر کو انہیں سمجھانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

تھانے کے ایک کونے میں بنے اس خاص کمرے کے عین سامنے جا کر انہوں نے جیپ روک دی...... یہ کمرہ تھانے کی عمارت میں ضرور موجود تھا، لیکن بالکل الگ تھلگ۔ اتنا علیحدہ کہ وہاں ہونے والی نقل و حرکت تھانے کے کسی دوسرے حصے میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

یہ کمرہ پچھلے پانچ سال سے خصوصی تفتیش کا مرکز تھا۔ میجر رام سنگھ جیسے تین فوجی افسر اس سے پہلے یہاں کے انچارج رہ چکے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی چھ ماہ سے زیادہ نہ رک سکا۔ میجر رام سنگھ البتہ پچھلے تین سال سے یہاں اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھا۔ یہی حال انسپکٹر میر کا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کر رہے تھے، لیکن میجر رام سنگھ کو اس کے متعلق کبھی خوش فہمی بھی نہیں رہی تھی۔

یہ حقیقت جاننے کے باوجود کہ انسپکٹر میر صرف نام کا ہی مسلمان ہے، میجر رام سنگھ اس امکان کو ہمیشہ مدنظر رکھتا تھا کہ کبھی بھی، کسی بھی مرحلے پر اس میں چھپا مسلمان بیدار ہوسکتا ہے۔ اس نے کمال مکاری سے انسپکٹر کو زیادہ ''حساس معاملات'' سے الگ تھلگ رکھا ہوا تھا اور کبھی اسے اس بات کا احساس تک نہیں ہونے دیا تھا۔

آج بھی انسپکٹر میر گشت پر تھا اور تھانے میں موجود زیادہ تر مسلمان سپاہی بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ جو باقی تین چار مسلمان سپاہی یہاں موجود تھے، انہیں ''پہرے'' پر کھڑا کیا گیا تھا جہاں سے ان کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تفتیشی کمرے کے اردگرد دو دو پہریدار ہی سے ڈوگرہ فوجی بظاہر نارمل موڈ میں کھڑے نظر آرہے تھے، لیکن ان کی ترتیب میں ایک تنظیم اور احتیاط نمایاں تھی۔

گزشتہ کئی ماہ سے فوج کی ایک آدھ کمپنی حفاظتی اقدامات کے لیے تھانے کے گرداگرد موجود رہتی تھی...... انہوں نے یہاں خیمے گاڑ کر باقاعدہ ایک فوجی چوکی قائم کر لی تھی اور ان میں سے اکثر سپاہی رات کو تھانے کے اس حصے میں بنے برآمدوں میں سویا کرتے تھے۔ اس طرف پولیس کا آنا جانا بہت کم ہوتا تھا۔

یوں بھی اب حالات ایسے تھے کہ وہ لوگ ایک دوسرے کے معاملات سے بچ کر ہی رہنا چاہتے تھے۔

............☆☆☆............

لالہ مہاویر پرشاد کی پراسرار آمد کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن کئی روز بعد فوجیوں نے اسے اتنی خوبصورت بے ہوش لڑکی کے ہمراہ دیکھا تو وہ حیرت زدہ ضرور ہوئے۔

......زہراں کو مہاویر کی موجودگی میں ڈوگرہ سپاہی اٹھا کر اندر لے آئے۔ پھر انہوں نے مہاویر کے اشارے پر ہی اسے ایک کونے میں رکھی چارپائی پر لٹا دیا۔ مہاویر کو یہ سوچ ستا رہی تھی کہ میجر رام سنگھ آخر کہاں غائب ہوگیا؟

میجر رام سنگھ کی آمد تک اسے بہرحال یہاں رکنا تھا۔ کم از کم وہ رام سنگھ کو اپنی زبان سے اپنا کارنامہ تو سنا دیتا اور داد پاتا۔ اس نے کوئی معمولی کارنامہ تو انجام نہیں دیا تھا...... میجر رام سنگھ کی ایک بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی اور اب دنیا کی کوئی طاقت شیرو کی زبان بند نہیں رکھ سکتی تھی...... زہراں اس کی غیرت تھی اور وہ اپنی غیرت کو کبھی آزادی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔

ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا لالہ مہاویر پرشاد باہر آگیا۔ اس نے پہلے تو چاہا کہ زہراں کو ہوش میں لے آئے، پھر اس نے زہراں کا بے ہوش رہنا ہی بہتر جانا اور وہ دروازہ بند کر کے باہر برآمدے میں آ بیٹھا تھا۔ لالہ مہاویر پرشاد کوئی معمولی قسم کا ٹاؤٹ نہیں تھا۔ راج دربار سے اس کے خصوصی روابط کا سب کو علم تھا۔ یہاں آنے والے افسران اس لیے بھی اس کی دوستی کے محتاج تھے کہ وہ کہیں مہاراجہ سے ان کی شکایت کر کے چھٹی نہ کروا دے۔ میجر رام سنگھ کی البتہ اور بات تھی۔

رام سنگھ سکھ تھا۔ اس کا باپ عیسائیت سے سکھ مذہب میں داخل ہوا اور سری نگر میں مہاراجہ کے محل میں ملازم تھا۔ رام سنگھ ہوبہو اپنے باپ

کی نقل تھا۔اس کا باپ بھی جوڑ توڑ کا ماہر اور سازشی ذہن رکھتا تھا۔ مسلم دشمنی وراثت میں اسے ملی تھی اور اس کی ترقی کا باعث بھی اسلام دشمنی تھا۔اس کی تعلیم وتربیت میں مہاراجہ نے خصوصی دلچسپی لی تھی اور ایک دومرتبہ جب اس نے سختی سے مسلمانوں کی بغاوتوں کو کچلا تو اسے خصوصی اختیارات کے ساتھ میجر کا عہدہ دے دیا گیا تھا۔

لالہ مہاویر توقع سے کچھ وقت پہلے ہی آ گیا تھا۔ دوسری طرف میجر رام سنگھ بھی اپنے معاملات میں کچھ زیادہ ہی الجھ گیا تھا۔وہ ایک خصوصی پیغام ملنے پر چھاؤنی کی طرف گیا تھا۔ بھیرہ اور دولتان سے مجاہدین کی صف بندیوں اور فوجی دستوں پر حملوں کی خبر نے اسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔

میجر رام سنگھ نے اپنی زیرنگرانی ان دونوں مقامات پر دوفوجی کمپنیاں روانہ کی تھیں۔اس نے اس مقصد کے لیے خصوصی فوجیوں کا اہتمام کیا تھا اور اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جانے والوں میں کوئی مسلمان فوجی نہ ہو۔

ان سب معاملات سے نمٹ کر وہ تھانے کی طرف جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔اس دوران اس نے ایک مرتبہ ٹیلی فون پر مہاویر پرشاد سے بات کر کے اسے شاباش دی تھی۔ مہاویر نے زیادہ دیر رکنا اپنے لیے خطرناک جانا۔تھانے میں مسلمان سپاہی بھی موجود تھے اور پھر زہراں کا اغواء کوئی معمولی بات نہ تھی۔فوراً اس پر شک کیا جاتا جس کے بعد کوئی بھی صورت حال پیدا ہوسکتی تھی۔اس نے سورج غروب ہونے کے قریباً گھنٹہ بھر بعد میجر رام سنگھ سے رابطہ قائم کیا اور وہاں سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

''ٹھیک ہے لالہ جی۔'' میجر رام سنگھ نے بڑے مخمور لہجے میں کہا۔''یوں بھی رات کو تمہارا وہاں کیا کام؟'' اس کے ساتھ ہی اس کا زوردار قہقہہ گونجا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

روانگی سے پہلے مہاویر نے وہاں موجود سپاہیوں کے انچارج صوبے دار کو سختی سے ہدایت کر دی کہ کوئی شخص کمرے کے نزدیک بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کرے۔وہ جس طرح چپ چاپ آیا تھا، اسی طرح وہاں سے واپس روانہ ہوگیا۔

............☆☆☆............

سجاول خان کی ڈیوٹی ختم ہوچکی تھی......!

اور وہ اپنی رائفل اسلحہ خانے میں جمع کروانے اس طرف آیا تھا۔اسلحہ خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے جب فوجیوں والے احاطے کی سمت نظر دوڑائی تو ایک جیپ میں اس نے لالہ مہاویر پرشاد کو برآمد ہوتے دیکھا جس کے پیچھے ایک سپاہی نے اپنے کندھے پر بے ہوش زہراں کو لاد رکھا تھا۔

......زہراں کی شکل پر نظر پڑتے ہی ایک سنسناہٹ سی اس کے بدن میں دوڑ گئی:''یہ لوگ اس حد تک بھی گر سکتے ہیں؟'' اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن......مہاویر جیسے شیطان کو وہاں دیکھ کر اسے تعجب بھی نہ ہوا۔سجاول نے وہاں رک کر خود پر کسی کو شک کرنے کا موقع نہ دیا اور وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

اپنی رائفل جمع کرواتے وقت اس نے کوئی ایسی غیر معمولی حرکت نہ کی جس کی بناء پر بعد میں بھی کوئی اس پر شک کر سکتا۔اب اسے گھر لوٹ جانا تھا۔اس کی ڈیوٹی کل شام کے بعد شروع ہونی تھی۔

......اور جب وہ اپنی بیرک کی طرف بڑھ رہا تھا تو سازش کی تمام کڑیاں اس کے ذہن نے ملا کر سامنے رکھ دی تھیں۔

انسپکٹر میر اور اس کے ساتھ تھانے کے زیادہ تر مسلمان سپاہیوں کی گشت پر روانگی جہاں انہیں ساری رات پٹرولنگ کرنا تھی، یہاں تھانے میں موجود چاروں مسلمان سپاہیوں میں سے دو کو تو اس کے ساتھ ہی ڈیوٹی سے آف ہو جانا تھا اور تیسرے کی ڈیوٹی حوالات کی طرف تھی، جہاں تک یہاں گزرنے والی کسی ''قیامت'' کی اطلاع کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

غصے سے اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ...... ابھی جائے اور اسی رائفل کی گولی سے اس شیطان مہاویر کا بھیجا اڑا کر رکھ دے، لیکن اس طرح سوائے مرنے کے وہ اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا...... اس نے اپنی سوچ کا رخ بدلا اور اب وہ صرف اس بات پر غور کر رہا تھا کہ کس طرح وہ زہراں کو یہاں سے اغوا کر کے کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جائے اور...... کسی کو اس پر شک بھی نہ ہو۔

میجر رام سنگھ کی اچانک وہاں سے غیر موجودگی کو اس نے غیبی امداد جانا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا، اس کی آمد سے پہلے کر گزرنا تھا۔ ایک مرتبہ اگر اس شیطان کی رسائی زہراں تک ہو گئی تو...... وہ لرز کر رہ گیا۔ اس کے آگے کچھ سوچنا بھی اس کے لیے اذیت ناک تھا۔

اسلحہ خانے کے ایک کونے میں کھڑے حوالدار رام دیال کو اس نے گہری نظروں سے اپنا جائزہ لیتے دیکھا، شاید وہ اس بات کا اطمینان کر رہا تھا کہ سجاول نے کہیں اس طرف دیکھا تو نہیں، پھر مطمئن ہو کر رام دیال نے گردن جھکا لی۔

''آؤ میاں تاش کی ایک بازی لگ جائے۔ میری ڈیوٹی بھی ختم ہو رہی ہے۔'' رام دیال نے اس کو کریدنے کے سے انداز میں پوچھا۔

''مجھے ذرا باغ تک جانا ہے، بڑا ضروری کام تھا حوالدار جی۔ میں تو آج چھٹی کرنے والا تھا، لیکن میر صاحب نے ایمرجنسی کی وجہ سے درخواست قبول نہیں کی...... میں نے سوچا چلو شام کو چلا جاؤں گا۔ خواہ مخواہ کیوں معمولی سی بات کے لیے افسروں کی منتیں کرتا پھروں۔'' سجاول خان نے اسے مطمئن کر دیا۔

بیرک کی طرف جاتے ہوئے جہاں اس کے سویلین کپڑے رکھے ہوئے تھے، سجاول خان زہراں کی نجات کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ پھر جیسے ایک نتیجے پر پہنچ کر اس نے مطمئن ہو کر گردن جھکا دی۔

............☆☆☆............

بیرک میں پہنچ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ اس دوران اس کی بذلہ سنجی برقرار رہی...... وہ اپنے ساتھیوں میں ہنس مکھ مشہور تھا اور کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اس نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے وہاں موجود اپنے ساتھیوں کو حسب سابق دو لطیفے سنا دیے۔

تھانے کی ڈیوڑھی سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ڈیوٹی پر موجود سنتری پر بھی دو تین فقرے کس دیے۔ ڈیوٹی سے باہر نکلنے کے بعد اس کا رخ بظاہر اس راستے کی طرف تھا جو شہر کو جاتا تھا، لیکن بمشکل پندرہ بیس قدم ہی چلنے کے بعد اس نے مڑ کر سنتری کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کی طرف منہ کیے بیڑی سلگا رہا تھا۔ سنتری کو اس طرف سے غافل پاتے ہی سجاول خان اپنی داہنی سمت گھوم گیا۔

اس کا رخ تھانے کی بیرونی دیوار کے باہر نیم دائرے میں لگے ان گھنے پیڑوں کی طرف تھا جس کے ایک طرف فوجیوں کے خیمے ایک

قطار کی صورت میں لگے ہوئے تھے۔ اس کا رخ ان خیموں کی پشت کی طرف تھا۔

......ڈھلتے چاند کی تاریخیں تھیں۔ خیموں کے باہر لٹکتے پیٹرومیکس کی محدود روشنیاں صرف ان کے سامنے والے علاقے کو روشن کیے ہوئے تھیں۔ پچھلی طرف اندھیرا تھا، لیکن اتنا زیادہ گہرا بھی نہیں کہ وہ بالکل ہی غیر محتاط ہو جاتا۔ اس نے سمت تو وہی اختیار کی تھی جدھر فوجیوں کے خیموں کی پشت تھی لیکن خود کو خیموں سے بہت دور رکھا۔ یہ بات اس کے علم میں تھی کہ یہاں پہرہ نہیں ہوتا...... رات کو نو دس بجے سے صبح چار پانچ بجے تک دو تین سنتری ضرور پہرے پر رہا کرتے تھے، لیکن وہ معمول کا پہرہ تھا۔

''آج میجر رام سنگھ نے انہیں خصوصی اقدامات کی ہدایت نہ کر دی ہو؟'' اس نے سوچا، مگر پھر اس نے خود ہی اس امکان کو رد کر دیا کیوں کہ یہ بات اچانک ہی اس کے ذہن میں آئی تھی کہ رام سنگھ کوئی حرکت کیوں کرنے لگا، جس سے کسی غیر معمولی بات کا شک گزرے۔

سجاول نے اب خیموں والا حصہ عبور کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس نالے کے کنارے کھڑا تھا جو تھانے کی عمارت کے بالکل ساتھ ہو کر گزرتا تھا۔ تھانے کی ساری گندگی اسی نالے میں گرتی تھی اور کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی اس نالے میں کبھی اترے گا بھی۔

اس نے کندھے پر دھرے کپڑے سے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا کہ سوائے اس کی آنکھوں کے باقی منہ چھپا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنی شلوار کو لنگوٹ کی طرح کس کر باندھ لیا اور نالے کے کنارے کنارے جہاں کہیں تھوڑی بہت خشکی میسر تھی، بڑی مضبوطی سے پاؤں رکھتے ہوئے تھانے کی دیوار کی طرف سرکنے لگا۔

......کہیں کہیں تو پانی اس کی کمر تک آجاتا۔ بدبو اور تعفن سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا، لیکن اس راستے میں پیش آنے والی دشواریوں کا اندازہ کرنے کے بعد ہی اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ قریباً بیس منٹ کی جان توڑ جدوجہد کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آیا۔ وہ اس کمرے کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا جہاں زہراں کو رکھا گیا تھا...... کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ڈھلان نما خشک جگہ چھت سے مٹی، پتھر اور گندگی وغیرہ پھینک کر بنا دی گئی تھی۔

سجاول خان اس خشک ڈھلان پر کھڑا اپنی بے ترتیب سانسوں اور دھڑکنوں پر قابو پا رہا تھا۔

......ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے سر اور منہ کے گرد اگرد لپیٹے کپڑے کو کھول کر دوبارہ مضبوطی سے باندھ لیا تھا۔ اس کی نظریں بڑی بے تابی سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ واپسی کے لیے بالآخر ایک راستہ اس نے اپنی آنکھوں اور ذہن کی مدد سے ترتیب دے لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی کمر سے بندھا شکاری چاقو کھولا۔ سجاول کا دل گواہی دے رہا تھا کہ چونے گارے سے بنی عمارت میں وہ اس کے ذریعے باآسانی سیندھ (نقب) لگا سکے گا۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے ٹٹول ٹٹول کر دیوار میں بالآخر ایک جگہ منتخب کر کے اس پر قسمت آزمائی شروع کر دی۔

............☆☆☆............

زہراں کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ وہ ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جہاں وہ موجود تھی۔ اس نے حرکت کرنا چاہی تو یوں لگا جیسے اس کا جسم بے حس ہو کر رہ گیا ہے...... خوف کے مارے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اسے ہلنا جلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سا خوف اس کے لاشعور میں گھس آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے کوئی حرکت کی تو نہ جانے کیا قیامت گزر جائے۔

......اس کا حلق دہشت سے خشک ہو رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا اور اسے تمام واقعات دہشت ناک مناظر کی طرح یاد آنے لگے۔ وہ شاید چلاتی چلاتی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بغیر آواز پیدا کیے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل کی دھڑکنیں دماغ میں دھمک پیدا کر رہی تھیں۔ کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا، کھڑکیاں البتہ تین چار ضرور تھیں، لیکن وہ دیواروں میں اتنی اونچی جڑی ہوئی تھیں کہ اس کے ہاتھ کا وہاں تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں، لیکن نہ جانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ اس نے اٹھ کر چلنے اور کمرے کا بھرپور جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔ اپنی بے ترتیب سانسوں اور بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالا اور کسی نہ کسی طرح اس دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے دروازے کو بہت آہستگی سے بغیر آواز پیدا کیے ہلایا...... دروازہ باہر سے بند تھا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ باہر کا منظر اسے بے ہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے بلبوں کی روشنی میں ڈوگرہ فوجیوں کے خوفناک چہرے دیکھے اور ان کے قہقہے سنے تو سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

......بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ لاچار سی دوبارہ اسی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی جہاں اسے ہوش آیا تھا۔ کمرے میں لٹکے بلب نے سارا کمرہ روشن کیا ہوا تھا۔

اس نے اپنی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اسے اس بات کا ادراک ہو چکا تھا کہ اس کی غم خواری یا دلداری کرنے کیلئے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ایک خدا کی ذات تھی جو کوئی معجزہ دکھاتی اور اسے اس ذلت آمیز موت سے نجات دلا دیتی۔

......اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ ڈوگروں کی قید میں ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اس کے ذہن میں آگئی کہ شیرو بھی گرفتار ہو چکا ہے اور اس کی گرفتاری بھی شیرو کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ یہ ڈوگرے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اس کے متعلق وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھی۔ لالہ مہاویر پرشاد کے ذریعے اس کا اغواء ہی اسے سب کچھ سمجھا دینے کے لیے کافی تھا۔

کشمیر کی بیٹی نے بیٹھے بیٹھے ایک عزم کیا...... اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

......اس لمحے اسے اپنی تمام کھوئی ہوئی توانائیاں جسم میں لوٹتی محسوس ہوئیں۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا...... کہ وہ کسی بھی ذلت سے ہمکنار ہونے سے پہلے خود ہی ایک آبرومندانہ موت کو گلے لگا لے گی۔ اس کا ذہن اس لمحے صرف ایک ہی بات پر مرکوز تھا، وہ مرنے کے لیے اس کمرے میں موت کا سامان تلاش کر رہی تھی۔

"چارپائی کی رسی (ادوائن)......!" اس نے سوچا اور وہ چارپائی ادھیڑنے کو لپکی۔

عین اسی لمحے جب وہ رسی کی پہلی گرہ کھول رہی تھی، اس نے اپنی پشت پر ایک ہلکی سی آواز سنی اور تھرا کر رہ گئی...... پیچھے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے بلب کی زرد روشنی میں دیوار کی بھربھری مٹی اور چونا زمین پر گرتے دیکھا۔

خوف کی جگہ اب حیرت اور تحیر نے لے لی تھی۔

پہلا سوال اس نے خود سے یہی کیا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟ "دوست" اس کے ذہن نے مختصر سا جواب دیا۔ دشمن کو اس طرح اس تک

پہنچنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

......اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک اینٹ اندر آرہی۔ اس کے ساتھ ہی دو آنکھوں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ زہراں اپنی جگہ پتھر کا بت بن کر کھڑی رہی۔ پھر دوسری اینٹ گری اور اس کے بعد تیسری اور چوتھی۔ کسی کا کپڑے میں لپٹا سر اور گردن اندر داخل ہوئے۔

''زہراں'' ایک تیز سرگوشی گونجی۔

جواب میں زہراں کے قدم بے اختیار اندر جھانکتی ہوئی گردن کی سمت بڑھنے لگے۔ وہ کسی بے اختیار عمل کے تحت گردن کے نزدیک آکر ٹھہر گئی۔

''زہراں بیٹی!'' اس مرتبہ سرگوشی ہلکی سی آواز میں بدل گئی۔ ''اس سوراخ کے ذریعے باہر نکل آؤ'' یہ کہنے کے بعد گردن نے وہاں خلا پیدا کردیا۔

زہراں کو آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی...... کئی مرتبہ کی سنی ہوئی، لیکن نہ تو اس نے کوئی بات دریافت کی اور نہ ہی نو وارد نے اپنا اسرار منکشف کیا۔

اس نے اپنے سینے کے زیر و بم کو سنبھالا، اللہ کا نام لیا......اور بڑی خود اعتمادی سے ایک ٹانگ باہر نکال دی۔ اس کے بعد دوسری۔ اب اس کا دھڑ اندر تھا اور ٹانگیں باہر۔ باہر کھڑے سجاول نے اسے اپنی سمت کھینچا۔ زہراں کے منہ سے ہلکی سی ''آہ'' کی آواز نکلی۔ رگڑ کھانے سے اس کی کمر اور پیٹ پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔

اس کی ''آہ'' نے چند ثانیے کے لیے سجاول کو چونکا دیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر جھٹکے سے اسے باہر نکال لیا۔ وہ مزید اینٹیں نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس فالتو وقت تھا۔ کسی بھی لمحے میجر رام سنگھ واپس آجاتا اور اس کے فوجی شکاری کتوں کی طرح اس کی تلاش میں نکل پڑتے۔

............☆☆☆............

باہر نکلتے ہی بدبو زہراں کے نتھنوں میں گھسنے لگی، لیکن اسے نہ اپنے جسم پر لگنے والی خراشوں کی پروا تھی نہ اس بات کی فکر کہ یہاں کی فضا کیسی ہے۔

سجاول نے اپنا چہرہ بدستور چھپایا ہوا تھا۔ اسے جلد از جلد زہراں کو محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر واپس اپنے گھر جانا تھا۔

......کیوں؟ اس لیے کہ اگر وہ پولیس یا فوج کی آمد پر اپنے گھر میں موجود نہ ہوا تو وہ لوگ فوراً اسی پر شک کرتے اور...... سجاول کسی کو اس وقت تک خود پر شک کرنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہ تھا جب تک کہ وہ شیرو کو آزاد نہ کروالیتا۔

واپسی کے لیے اسے زہراں سمیت بادل نخواستہ گندہ نالہ عبور کرنا پڑا۔ زہراں کو اس نے اپنے کندھے پر بٹھا کر نالہ عبور کیا تھا۔ دوسرے کنارے پر رک کر اس نے اپنا نظام تنفس درست کیا۔ سجاول عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جب آدمی سنجیدگی سے بڑھاپے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

اپنی چڑھتی جوانی میں وہ پونچھ کا کبڈی کا مانا ہوا کھلاڑی تھا۔ نوکری کے دوران میں کئی دفعہ وہ انعامات حاصل کر چکا تھا، لیکن شادی کے بعد سے اس نے خود کو صرف بیوی بچوں تک ہی محدود کرلیا تھا۔ اگست کے اوائل ہی میں اس نے خطرے کی بو سونگھتے ہوئے اپنی بیوی اور تین بچوں کو ان

کے ننھیال میں کوہالہ بھیج دیا تھا اور اب حالات سدھرنے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ بچوں کو واپس لا سکے، لیکن حالات سدھرنے کے بجائے روز بروز بگڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔

''کون ہیں آپ؟'' کنارے پہنچنے کے بعد پہلی مرتبہ زہراں نے زبان کھولی۔

''ابھی ان باتوں کا وقت نہیں آیا بیٹی۔'' سجاول نے جواب دیا۔ ''تم خدا کا شکر ادا کرو جس نے مجھے تمہاری رہائی کا ذریعہ بننے کی توفیق عطا فرمائی۔''

زہراں خاموش ہو رہی، لیکن ایک بے کلی سی اسے لگ گئی تھی۔ وہ اپنے محسن کا نام جاننے اور شکل دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئی جاتی تھی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے پیدل چلتے چلتے پوچھا۔

سجاول جو اس کے آگے آگے چل رہا تھا، رک گیا۔ اس نے سامنے پھیلے پہاڑی سلسلے کی طرف انگلی اٹھائی۔

''اس طرف۔ تمہارے لیے فی الوقت اس سے زیادہ محفوظ ٹھکانہ اور کوئی نہیں۔''

''لیکن میرا لالہ......؟''

''مطمئن رہو بیٹی۔'' اس نے زہراں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم اب بھی اپنوں ہی میں جا رہی ہو۔ اگر میں اس وقت تمہیں تمہارے لالہ کے پاس لے گیا تو ہم سب مارے جائیں گے۔''

زہراں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن خاموش ہو رہی۔ اسے کوئی نادیدہ طاقت اس بات کا یقین دلا چکی تھی کہ...... یہ شخص جو کچھ بھی کر رہا ہے، ٹھیک کر رہا ہے۔

گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے گزر کر اب وہ اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئے جس طرف سجاول نے اشارہ کیا تھا۔

......رات کا پہلا پہر بیت چکا تھا جب وہ ایک پہاڑی غار کے کنارے کھڑے تھے، جو اپنی بناوٹ کے لحاظ سے بالکل محفوظ تھا۔ اس غار تک پہنچنے کے لیے سجاول نے اسے اتنے چکر دیئے تھے کہ اگر وہ یہاں سے واپس جا کر دوبارہ اسی جگہ پہنچنا چاہتی تو کبھی نہ پہنچ سکتی۔ غار میں لالٹین روشن تھی اور ایک عورت مصلے پر بیٹھی ایک کونے میں عبادت میں مشغول تھی۔ اس کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر اس طرف دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے ''زہراں بیٹی'' نکلا اور وہ بانہیں پھیلائے اس کی سمت لپکی۔

''چاچی'' کہہ کر زہراں اس سے لپٹ گئی۔

دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عورت نے زہراں کو آہستگی سے خود سے الگ کیا۔ زہراں نے چاہا کہ مڑ کر دیکھے۔ اس نے اپنے پیچھے نظر ڈالی تو اس کا محسن وہاں سے غائب تھا۔ وہ بے اختیار باہر کو دوڑی۔ اس کی چاچی بھی اس کے تعاقب میں تھی...... غار کے سامنے والے موڑ پر انہوں نے ایک سائے کو غائب ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''آ جاؤ بیٹی۔'' چاچی نے زہراں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ ''وہ کوئی فرشتہ ہے، قدرت نے اسے ہماری

عزت بچانے کے لیے انسان کے روپ میں اس دنیا میں اتارا ہے۔ پہلے اس نے مجھے ظالموں سے بچایا اور اب شاید تمہیں۔''

''ہاں چاچی۔'' زہراں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ یقیناً کوئی فرشتہ ہی ہے۔''

دونوں ایک دوسری کو اپنی رام کہانی سنانے لگیں۔ چاچی کی زبانی زہراں کو علم ہوا کہ وہ پچھلے تین روز سے یہاں مقیم ہے۔ جو شخص اسے لے کر آیا ہے وہی چاچی کو لایا تھا اور اس نے فی الحال اپنی شناخت نہیں کروائی۔

''یہاں غار میں ابھی پانچ چھ دن کے لیے کھانے پینے کا سامان موجود ہے، مگر پھر بھی یہ روزانہ میری خیریت معلوم کرنے آتا ہے۔''

سجاول گھر پہنچا تو رات کا دوسرا پہر تھا۔ اسے علم تھا کہ کن کن راستوں پر پولیس یا فوج نے نظر رکھی ہوئی ہے...... اپنے گھر کی دیوار پھاند کر وہ اندر داخل ہوا اور اس اطمینان کے بعد کہ ابھی تک کوئی اس کی ''خیریت دریافت کرنے'' نہیں آیا، چار پائی پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھ لگ گئی، لیکن ابھی اسے سوئے ہوئے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا جب کسی نے باہر کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

......سجاول آنکھیں ملتا باہر آیا تو حوالدار جانکی داس کو اپنا منتظر پایا۔

''کیا بات ہے مہاراج جی؟ اپنے ساتھ اب لوگوں کی نیندیں بھی حرام کرنے لگے۔ بھابی سے جھگڑا ہو گیا کیا؟'' اس نے اپنے لہجے کی شگفتگی برقرار رکھی۔

جانکی داس پہلے تو اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا کہ کہیں وہ ایکٹنگ تو نہیں کر رہا۔ ''ایک بری خبر سنانے آیا ہوں میاں۔'' جانکی داس نے کہا۔

''اندر آ جاؤ۔'' سجاول نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ''اور اطمینان سے بات کرو۔ تمہارے منہ پر تو یوں ہوائیاں اڑ رہی ہیں جیسے کسی مگر مچھ کے منہ سے نکل کر آئے ہو۔''

''مگر مچھ کے منہ سے تو نکل کر آیا ہوں میاں۔'' حوالدار جانکی داس نے اندر چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ میجر رام سنگھ پاگل ہوا جا رہا ہے۔ ہر کسی کو کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہماری جان تو عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہے...... اس نے منشی کو تو اپنے بید سے بری طرح پیٹا ہے۔''

''ٹھہر و یار! قہوے کی دو پیالیاں بنا لوں، پھر بات کرنا۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔'' سجاول نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

...........☆☆☆...........

لالہ مہاویر پرشاد نے اس کے سامنے زہراں کے حسن کا جو نقشہ کھینچا تھا، اسی نے میجر رام سنگھ پر ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ بہت عرصے بعد ایسا ''شکار'' اس کے ہاتھ لگا تھا۔

''ٹھیک ہے، اب تک وہ نیند بھی پوری کر چکی ہوگی اور باقی دو چار مسلمان پولیس مین بھی تھانے سے جا چکے ہوں گے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''جلدی چلو۔'' اس نے جیپ میں بیٹھتے ہی ڈرائیور کو حکم دیا۔

روانگی سے قبل اس نے شراب کے دو تین پیگ چڑھا لیے تھے۔ کشمیر کی ٹھنڈی اور رسیلی ہوا نے اس کا نشہ دو آتشہ کر دیا تھا۔

...... کمرہ خاص کے سامنے وہ جیپ سے اتر گیا۔ اس کے ''خصوصی دستے'' کے دو مستعد جوان وہاں پہرہ دے رہے تھے۔ رام سنگھ نے ڈرائیور کو جیپ واپس لے جانے کو کہا۔ اس نے دروازے کے باہر کھڑے سنتریوں کو حکم دیا کہ کسی کو صبح تک اندر نہ گھسنے دیا جائے نہ ہی اس کے کام میں کوئی مداخلت کرے۔ صرف اس کے بلانے پر ہی کوئی اندر آئے۔

بغل میں رم کی بوتل دبائے جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اسے ایک دم بجلی کا زوردار جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے غلطی سے اس کا ہاتھ ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔

میجر رام سنگھ کا نشہ ہرن ہو گیا...... سامنے والی دیوار میں ایک خلا سے اندر آتی روشنی اور ہلکی ہلکی بدبو نے اسے نیم پاگل کر دیا۔ اس نے زور زور سے گالیاں بکتے ہوئے پہرے داروں کو اندر بلا لیا۔

''یہ کیا ہے؟'' رام سنگھ نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

''معلوم نہیں سر! ہم...... ہمیں......'' ان میں سے ایک گھگھیایا۔ ڈھنگ سے کوئی بات ہی بے چارے کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔

''اندھے ہو گئے تھے کیا؟ بہرے ہو گئے تھے تم؟ تم نے کچھ نہیں دیکھا؟ تمہیں کچھ سنائی نہیں دیتا؟'' اس نے شعلے برساتی آنکھوں سے انہیں گھورتے ہوئے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

''سر! ہمیں لالہ جی نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ کوئی اس کمرے کے دروازے کے نزدیک بھی نہ پھٹکے۔'' اسی جوان نے دوبارہ ہمت کی۔ دوسرے کی تو زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

''گدھو! تم میرے حکم کے پابند ہو یا اس کے۔'' کہتے ہوئے میجر رام سنگھ نے دو تین بید اسے دے مارے۔

یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ جب غصے میں ہوتا تو اپنے جامے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ اپنے ماتحتوں کو مارنا پیٹنا اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ اس کے ساتھی اس سے کسی بھی لمحے ایسے گھٹیا سلوک کی توقع رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ رہتے تھے۔

''دفع ہو جاؤ اور فوراً چاروں طرف پھیل کر اسے ڈھونڈو۔ مجھے دو گھنٹے سے پہلے زہراں یہاں اس کمرے میں چاہیے ورنہ میں تم سب کو گولی مار دوں گا۔'' اس نے باقاعدہ اپنے ہولسٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

میجر رام سنگھ کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ماتحت ''جان بچی سو لاکھوں پائے'' کا ورد کرتے باہر کو لپکے۔ چند منٹ بعد ہی فوجیوں کی مختلف ٹولیاں مختلف سمتوں میں زہراں اور اس کے اغواء کنندہ کی تلاش میں روانہ ہو گئیں۔

زہراں اور شیرو کی ماں دونوں اس کے ہاتھ آتے آتے نکل گئی تھیں۔ رام سنگھ سوچ رہا تھا کہ شیرو کی ماں تک تو ان کی رسائی ہی نہیں ہو سکی، لیکن زہراں کی یہاں موجودگی کا علم حریت پسندوں کو کیسے ہوا؟

رام سنگھ جانتا تھا کہ لالہ مہاویر کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور ایسا گہرا آدمی کبھی اتنا غیر محتاط نہیں ہو سکتا کہ وہ زہراں کے اغواء کا علم کسی کو ہونے دے...... اغوا ہونے سے تھانے پہنچنے تک اس نے تو کسی کو کانوں کان اطلاع نہیں ہونے دی تھی۔ اس

کے خصوصی عملے کے سپاہی جو اس مہم پر اس کے ساتھ گئے تھے، ان میں سے بھی کسی کی وفاداری پر وہ شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

......پھر اس نے فرض کیا کہ اگر حریت پسندوں کو اس بات کی خبر بھی ہو گئی تھی تو وہ کبھی اتنی تیزی سے حرکت میں نہیں آسکتے تھے۔ انہیں اس جگہ پہنچنے کے لیے رات کا انتظار کرنا چاہیے تھا اور جس راستے سے زہراں کو نکالا گیا تھا، اس طرف تو کوئی ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کا ذہن مکمل بیدار تھا اور وہ تمام امکانات پر دماغ سوزی کر رہا تھا تا کہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی راہ نکال سکے۔ میجر رام سنگھ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ حرکت ضرور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کی ہے۔

......شاید کسی مسلمان فوجی یا پولیس والے نے زہراں کو اغواء کر لیا ہے یا وہ حریت پسندوں کا کوئی ساتھی ہے جس کی اطلاع پر وہ لوگ فوراً حرکت میں آگئے اور اطلاع دینے والے ہی نے انہیں اغواء اور فرار کے لیے اس راستے اور طریق کار کی نشاندہی کی ہوگی۔

رام سنگھ کی ترقی کا شاید سب سے بڑا راز ہی یہی تھا کہ اس نے جوش میں بھی کبھی ہوش کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور اب چونکہ وہ بڑی تیز رفتاری سے اپنے ذہن میں ترتیب پا جانے والے منصوبوں پر عمل پیرا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس واقعے کی خبر کم از کم وہاں موجود مسلمان سپاہیوں کو نہ ہونے پائے۔

اس کی اطلاعات کے مطابق صرف سجاول ہی چھٹی کر کے گیا تھا۔

......اور اس نے کسی کو بتائے بغیر وہاں موجود پولیس کے مسلمان اور غیر مسلم تمام سپاہیوں سے اپنے طور پر اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی سجاول خان کی کوئی غیر معمولی حرکت نوٹ نہیں کی۔

پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ حریت پسندوں کا ساتھی ہے تو ابھی تک اس کے گھر واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ لوگ پونچھ سے دور تھے اور وہاں اطلاع پہنچا کر اتنی جلدی کوئی واپس نہیں آسکتا اور...... اگر ان کے کچھ ساتھی یہاں چھپے ہوئے ہیں جو سجاول کے کہنے پر فوراً حرکت میں آگئے تھے تو بھی ابھی وہ زہراں کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر واپس نہیں آیا ہوگا۔

......اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس نے جانکی داس کو اعتماد میں لے کر اس کے گھر کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

..........☆☆☆..........

''یار! میجر رام سنگھ کے کمرے سے ایک انتہائی خطرناک زیر تفتیش ملزم فرار ہو گیا ہے۔'' حوالدار جانکی داس نے قہوے کا لمبا گھونٹ نگلتے ہوئے اپنی دانست میں اسے ''اہم اطلاع'' دی۔

''تمہاری عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ وہاں سے کون مائی کا لال فرار ہو سکتا ہے، چاروں طرف تو رام سنگھ کے فوجی پہرہ دے رہے ہیں۔ پولیس والوں کو تو اس طرف جانے کی بھی اجازت نہیں۔'' سجاول نے بظاہر اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

''یہی تو بات ہے۔'' جانکی داس نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے سے لہجے میں کہا۔ ''رام سنگھ کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ خود فرار نہیں ہو سکتا۔ ضرور اسے کسی نے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔''

''میں اس سلسلے میں اب کیا عرض کروں۔ ہم تو معمولی سے بندے ہیں، اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات

ہے۔صبح میر صاحب آ جائیں گے تو یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔وہ تو مفرور کو کبھی معاف کریں گے ہی نہیں۔تم تو جانتے ہو انہوں نے آج تک کتنے اشتہاری مجرم گرفتار کروائے ہیں۔"

"بھگوان کے لیے۔" جانکی داس نے اس کے زانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔"اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے تو وہ مجھے فوراً گولی مار دے گا۔" پھر جانکی داس نے اس کے بالکل ساتھ جڑتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔"اس نے تو مجھے تمہاری چیکنگ کے لیے روانہ کیا ہے۔وہ اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ تم گھر ہی پر موجود ہو یا نہیں۔"

حوالدار جانکی داس سیدھا سادا بوڑھا آدمی تھا۔اس نے قہوے کی دو پیالیوں کے عوض ساری کہانی سجاول کو سنا دی اور اس بات کا یقین بھی دلا دیا کہ وہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن رہے۔جانے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر سجاول سے درخواست کی کہ وہ اس بات کا ذکر اپنے کسی ساتھی سے بھی نہ کرے۔

جانکی داس کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد سجاول جس طرح اپنے گھر میں داخل ہوا تھا، اسی طرح دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔پہلے اس نے گھوم پھر کر اطمینان کر لیا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا اور پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر لالہ کے مکان کے عین سامنے جا پہنچا۔

......پریشان حال لالہ اتنی رات گئے سجاول کو اپنے دروازے پر دیکھ کر چونک پڑا۔اس کی صاحب سلام تو سجاول سے تھی، لیکن اس سے کچھ زیادہ تعلقات نہ تھے ویسے اسے اس بات کا علم ضرور تھا کہ سجاول پولیس میں ملازمت کرتا ہے۔سجاول نے اسے مختصر لفظوں میں سارے واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد فوراً بے بے کو ساتھ لے کر یہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر لالہ، میجر رام سنگھ کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔

کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اس نے فی الحال زہراں اور چاچی کا پتہ بتانے سے معذرت کی، لیکن اس بات کا وعدہ بھی کر لیا کہ وہ مناسب موقعے پر اسے زہراں سے ملا دے گا۔وقت کی کمی کا احساس لالہ کو دلا کر وہ رخصت ہو گیا۔

صبح بستی والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لالہ اور بے بے بھی گھر سے غائب ہیں......!



سجاول خان

مہاویر پرشاد تھانے سے اکیلا ہی باہر نکلا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ آنے جانے والوں کی نظروں سے بچا رہے۔

......شیرو کی ماں کے بدلے اس کی منگیتر کو میجر رام سنگھ کے حضور پیش کرنے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ دراصل اس نے زہراں کو پیش کر کے خود کو رام سنگھ کے عتاب سے محفوظ کر لیا تھا ورنہ تو پچھلے دو تین سال سے جب سے وہ رام سنگھ کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس نے بخوبی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ناکامی کی صورت میں رام سنگھ کی حالت زخمی سانپ کی سی ہو جاتی ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اپنی بیٹی کملا کے سوگوار چہرے پر پڑی جو اسے دیکھتے ہی ''پتا جی'' کا نعرہ لگا کر اس سے چمٹ گئی تھی۔

''خیریت بیٹی؟'' مہاویر پرشاد نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بننے کا مظاہرہ کیا۔

''پتا جی'' کملا سسک پڑی۔ ''زہراں غائب ہے۔ کہاں چلی گئی وہ؟''

''ارے واہ۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے، کہیں چلی گئی ہوگی، آ جائے گی۔'' مہاویر نے کمال مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن کملا بضد رہی کہ وہ خود اسے تلاش کرے۔ اسے مطمئن کرنے کے لیے مہاویر اپنی سپتری کے ساتھ لالہ کے ہاں گیا اور اس سے بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد اسے یقین دلایا کہ زہراں کی تلاش میں وہ زمین آسمان ایک کر دے گا۔ کملا اپنے مکار باپ کی یقین دہانی پر قدرے مطمئن سی ہو گئی، لیکن مہاویر کے لاکھ اصرار کرنے پر بھی اس نے رات کا کھانا نہ کھایا۔

''جب تک زہراں نہیں آ جاتی میں 'کا جل بھوجن' نہیں کروں گی۔'' اپنی ماں کے اصرار پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اپنے سونے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مہاویر کو بیٹی کے اس انتہا پسند رویئے نے کسی قدر پریشان کر دیا تھا، لیکن رام سنگھ کی طرف سے ملنے والے ممکنہ انعامات کے تصور نے اس کی پریشانی دور کر دی۔ اس نے اپنے خاص ملازم کو ہدایت کی کہ آج وہ کھانا اپنے کمرے ہی میں کھائے گا اور اپنے کمرے میں کھانے کا مطلب ملازم خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ ایسا ''حکم'' مہاویر اسے خاص موقعے پر ہی دیتا تھا۔

اس نے ولایتی شراب کی بوتل اور گلاس جگ اس کے پاس ہی پہنچا دیا۔ مہاویر نے جی بھر کے شراب نوشی کے بعد کھانا کھایا اور وہیں مست ہو کر لیٹ گیا۔

............☆☆☆............

حسین خان نے ایک مرتبہ پھر قمیص کے نیچے بندھی بیلٹ اور اس میں اڑسی گولیوں کا جائزہ لیا۔ رائفل اس نے کپڑے میں لپیٹ کر اس طرح کندھے پر رکھ لی تھی کہ اس کی شناخت ممکن نہ رہی۔

''اشرف خان'' اس نے اپنے پہلو میں کھڑے نوجوان کو مخاطب کیا: ''اصولاً مجھے تمہیں اس مہم میں نہیں لے جانا چاہیے تھا کیونکہ تم ابھی زیادہ تجربہ کار نہیں ہوئے، لیکن اس بات کے پیش نظر کہ تم کہیں اپنے دوست کی عزت کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے احساس محرومی کا شکار نہ ہو جاؤ، میں یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔ ہاں...... ! تم صرف ایک بات یاد رکھنا کہ ہمارا مقابلہ وادی کے دو خبیث ترین انسانوں میجر رام سنگھ اور مہاویر پرشاد سے ہے اور ہم میں سے کسی ایک کی معمولی سی غلطی بھی ہم سب کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔''

''بے فکر رہو چاچا۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' اشرف خان نے بڑے مضبوط لہجے میں اسے یقین دلایا۔ پستول اس نے بھی اپنے جسم سے باندھ رکھا تھا، لیکن اس طرح کہ بوقت ضرورت دوسرے ہی لمحے وہ اسے استعمال میں لا سکتا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی اس لحاظ سے غیر مسلح تھا کہ آتشیں اسلحہ اس کے پاس نہیں تھا، وہ صرف کلہاڑی اٹھائے ہوئے تھا۔

رب نواز، میر ولی اور ان کے دوسرے ساتھی انہیں پہاڑی راستوں کے اختتام رخصت کرنے آئے تھے۔ روانگی سے پہلے میر ولی نے حسین خان کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ ''حسین خان! خالی ہاتھ اس طرف واپس نہ آنا۔ ہم صرف تمہارے منع کرنے پر رکے رہے ہیں ورنہ خدائے واحد کی قسم ابھی کسی مائی نے وہ لال نہیں جنا کہ سدھنوں کی غیرت کو للکار کر یوں سکھ کی نیند سوتا رہے۔''

حسین خان خاموشی سے چند ثانیئے ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے کہا:

''میر ولی! زہراں کشمیر کی بیٹی ہے اور کشمیر کی عزت۔ یہ خدا اس وادی کا ذرہ ذرہ اس بات کا گواہ ہے کہ ہم نے کبھی بے غیرت کہلانا پسند نہیں کیا۔''

''فی امان اللہ!'' میر ولی خود میں اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

''فی امان اللہ'' تینوں آگے بڑھ گئے۔

بوڑھے آسمان پر اکا دکا تاروں نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ان تینوں سر بلنوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کے تعاقب میں پونچھ شہر کی طرف بڑھ رہے تھے......انہوں نے شہر میں محفوظ داخلے کے لیے محفوظ راستے کا انتخاب پہلے ہی کر لیا تھا۔ مضبوط قدموں اور ارادوں کے ساتھ اب وہ اسی راہ پر گامزن تھے۔ نصیب شام ڈھلتے ہی حسین خان کی ہدایت پر اس طرف روانہ ہو گیا تھا تاکہ حالات پر نظر رکھے۔

..........☆☆☆..........

رات کے تیسرے پہر وہ تینوں اس محلے کے باہر کھڑے نصیب کے منتظر تھے جس کے ایک مکان میں مہاویر پرشاد آنے والی قیامت سے بے خبر شراب کے نشے میں مدہوش گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ انہیں اس بڑ کے درخت کے نیچے کھڑے ابھی بمشکل چند منٹ ہی گزرے تھے جب ایک مکان کی دیوار سے چپکا ایک سایہ ان کی سمت بڑھتا دکھائی دیا......شرفو کی گرفت پستول پر مضبوط ہو گئی۔

''حسین خان!'' آنے والے کی سرگوشی نے انہیں مطمئن کر دیا۔

حسین خان آگے بڑھ آیا۔ نصیب نے اس کے کان سے منہ لگائے، اسے کچھ سمجھایا۔ اس کی باتوں پر کبھی تو حسین خان سر ہلانے لگتا اور کبھی سراپا سوال بن جاتا۔

چند منٹ بعد وہ تینوں نصیب کی سربراہی میں مہاویر کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کے بعد مکان کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ حسین خان سب سے آگے تھا، دونوں اس کے پیچھے۔

اب وہ کمروں کی دورویہ قطار کے سامنے کھڑے تھے۔ شرفو کو اس گھر کے ایک ایک کمرے سے آشنائی تھی۔ اس کا بچپن اس حویلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ حسین خان نے کلہاڑی بردار کو دروازے پر کھڑا کیا۔ شرفو اس کے اشارے پر زنان خانے کی طرف بڑھ گیا جب کہ وہ خود چند سیکنڈ کے بعد مہاویر پرشاد کے سر پر رائفل تانے کھڑا تھا۔

''ک.............ک.............کون ہو تم؟'' خوف اور دہشت سے مہاویر پرشاد کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہاری موت......!'' حسین خان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ک.............ک.............ک.............کیا چاہتے ہو؟'' مہاویر پرشاد پر لرزہ طاری تھا۔

''چپ چاپ اٹھ کر باہر آ جاؤ ورنہ......'' فقرہ اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''دیکھو......دیکھو میں تمہیں گ.............گ.............گرفتار کروا دوں گا۔'' مہاویر کے منہ سے خوف اور بوکھلاہٹ میں نکل گیا۔

''اٹھو۔'' حسین خان نے رائفل کی نال اس کے سینے میں ٹھونکی۔

مہاویر موت کے ڈر سے اٹھنا تو چاہتا تھا، لیکن اس کے وجود نے جیسے جنبش کرنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے وہ کھڑا ہو ہی گیا۔

''باہر نکلو۔'' اگلا حکم موصول ہوا۔

''دیکھو۔ تم جو کوئی بھی ہو۔ تم......تم آ......آ......اچھا نہیں کر رہے۔'' مہاویر نے سنبھلنا چاہا۔

''بکومت۔ جس طرح تمہیں میں کہہ رہا ہوں کرتے جاؤ ورنہ یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے۔''

یہ بات مہاویر پرشاد کی سمجھ میں آ گئی کہ نو وارد کا تعلق آزادی پسندوں سے ہے، لیکن یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر زہراں کے اغواء میں ملوث ہونے کا شک کیا جا رہا ہے۔

کمرے کے دروازے سے قدم باہر رکھتے ہی اس نے چلانا چاہا۔ ابھی اس کے منہ سے بمشکل پہلی آواز ہی نکل پائی تھی کہ حسین خان نے رائفل کا بٹ گھما کر اس کے سر پر مارا اور مہاویر کو اگلی آواز نکالنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔

............☆☆☆............

میجر رام سنگھ کے سپاہیوں نے اردگرد کی پہاڑیاں، پونچھ کو آنے اور جانے والے خفیہ اور ظاہر راستے سبھی کچھ چھان مارا، لیکن زہراں کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ ساری رات خود اس نے بھی آنکھ تک نہ جھپکائی۔ وہ خود زہراں کی تلاش میں نکل کر پارٹیوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے اپنی جیپ میں پاگلوں کی طرح ان کا پیچھا کرتا رہا۔ اس نے خود شہر کو آنے اور جانے والے راستوں کو چیک کیا تھا۔

علی الصبح وہ اپنی جگہ پر موجود تھا کیوں کہ تھوڑی ہی دیر بعد انسپکٹر میر کو واپس آ جانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابھی زہراں کے اغواء اور فرار کا راز کسی اور پر کھلے، لیکن یہ خبر چھپی بھی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ سوچ سوچ کر بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میر کو بتا دے، لیکن ذرا سی تبدیلی کے ساتھ زہراں کے بجائے کسی مسلمان حریت پسند کا نام لے لیا جائے۔'' یہی سوچتا وہ تھانے کی طرف جا رہا تھا۔

اسے اپنے کمرے میں پہنچے بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے جب ایک سپاہی لفافہ لے آیا جو اس کے نام تھا۔ رام سنگھ نے حیرت سے دیکھا

''کون لایا ہے یہ؟''

''سر! ایک بوڑھا سا آدمی تھا۔ اس نے اپنا تعلق آپ سے ظاہر کیا تھا۔ وہ بہت جلدی میں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ لفافہ دیتے ہی فوراً چلا گیا۔''

میجر رام سنگھ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور لفافہ کھول کر اس میں سے رقعہ نکال کر پڑھنے لگا۔

''رام سنگھ! ہم لالہ مہاویر پرشاد کو اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ اگر تم اپنے اس وفادار کی خیریت چاہتے ہو تو زہراں کو ایک لفظ کہے بغیر واپس کر دو۔ تبادلے کی جگہ اور طریقہ ہم مقرر کریں گے۔ اگر تمہیں ہماری بات منظور ہو تو جیپ پر سفید جھنڈا باندھ کر اسے شہر میں گھما دینا۔ ہم شام تک انتظار کریں گے۔''

بھیجنے والے نے اپنا کوئی نام بھی نہیں لکھا تھا، لیکن رام سنگھ جان گیا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ خط پڑھ کر وہ چکرا ہی تو گیا تھا۔ ''کیا یہ لوگ اس کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟ زہراں تو پہلے ہی غائب ہے۔''

میجر رام سنگھ سوچ رہا تھا کہ اگر زہراں حریت پسندوں کے قبضے میں ہے تو یہ کون لوگ ہیں اور اگر یہ خط حریت پسندوں کی طرف سے ہے تو زہراں کو اغوا کس نے کیا یا کروایا ہے؟

اس لمحے اسے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ اس نے جھنجلانے یا اپنے ساتھیوں کو لتاڑنے کی بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے معاملے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

نینداس کی آنکھوں سے کافی دور تھی۔ اس کی حالت اس چوکنے بھیڑیے کی سی تھی جس کے منہ سے کوئی چیتا شکار چھین کر لے گیا ہو۔ وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوا تھا لیکن حالات کی سنگینی اس کے پیش نظر تھی۔

پونچھ کی مقامی آبادی میں بیداری اور آزادی وطن کی جو لہر دوڑی تھی، اس نے مقامی انتظامیہ میں جو یہاں کے ''مقامی حکمران'' کی سی حیثیت رکھتے تھے، تشویش کی زبردست لہر دوڑا دی...... وہ لوگ جو خود عملی کارروائیوں میں حصہ نہیں لے رہے تھے، وہ ہر طرح مجاہدوں کے مددگار تھے۔ میجر رام سنگھ نے شہر کو آنے والے تمام ممکنہ راستوں پر زبردست نظر رکھی ہوئی تھی۔ گھر گھر میں اس کے جاسوس موجود تھے جو اسے پل پل کی

خبریں پہنچا رہے تھے۔اس کے باوجود لالہ مہاویر پرشاد اغواء ہو گیا تھا جس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا تھا کہ حریت پسندوں...... خصوصاً اغوا کنندگان نے مقامی بستی میں پناہ لے لی تھی جہاں سے نکل کر ان لوگوں نے اطمینان سے اپنا کام مکمل کیا اور واپس چلے گئے تھے۔

اب ایک اور مصیبت بھی آن پڑی تھی۔حریت پسندوں کے علاوہ جن کی کمانڈ حسین خان کے ہاتھ میں تھی، کوئی اور گروپ بھی میدان میں آ گیا تھا اور اسی گروپ کے ارکان نے اس کے خیال میں زہراں کو رام سنگھ کے منہ سے چھینا تھا۔

اس کی توجہ اب حسین خان کی طرف سے ہٹ کر اس ''نئی مصیبت'' کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔اس کے خیال کے مطابق یہ دوسرا گروہ بڑا ہی منظم اور ہوشیار تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوقوفی کی حد تک دلیر بھی......!

......رام سنگھ کے ذہن میں اب یہ سوال سلگ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔کم از کم کوئی ایسا پتہ اس کے ہاتھ میں ہو جس کے عوض وہ ان لوگوں سے سودے بازی کر سکے۔جہاں تک شیرو کا سوال تھا یہ کارڈ اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔وہ تشدد کے ذریعے اس سے کچھ نہیں اگلوا سکتا تھا کیونکہ اس کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ وہ مر جائے گا، لیکن اپنے کسی ٹھکانے کی خبر نہ دے گا۔

''لالہ'' اس نے سوچا: ''زہراں کا باپ شاید اس کے لیے ترپ کا پتہ ثابت ہو۔'' اور دوسرے ہی لمحے اس کے دو مستعد نائب اس کے سامنے کھڑے تھے۔

''فوراً لالہ کو گرفتار کر کے لاؤ۔'' اس نے اپنے انتہائی قابل اعتماد نائبین کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

دونوں تیز رفتاری اور پھرتی سے باہر کو لپکے مگر دس پندرہ منٹ بعد ہی ان کی واپسی ہو گئی اور یہ اطلاع اس کے لیے بم کا دھماکہ ثابت ہوئی کہ زہراں کا باپ بھی غائب ہے۔

''جہنم میں جاؤ تم سب۔'' اس نے سر پر ٹوپی جماتے ہوئے بڑبڑا کر کہا۔زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اس طرح پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھا اور منہ لٹکا کر باہر نکل گیا۔

میجر رام سنگھ کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔اس کا سارا زور رم کی بوتل پر چلا اور وہ اپنی بدبختی، ناکامی اور نامرادی کو تلخی جام کی نذر کرتا رہا۔

......سورج طلوع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے کمرہ خاص میں جا پہنچا اور اس نے جاتے ہی شیرو کو لانے کا حکم دیا...... اپنی تمام ناکامیوں کا ذمہ دار اس نے شیرو کو گردانا تھا۔

میجر رام سنگھ اور اس کے درندے شیرو کی بوٹی بوٹی سے اپنے انتقام کی پیاس بجھاتے رہے۔انہوں نے اپنی دانست میں اسے اذیتیں دے دے کر بے ہوش کر کے گویا اپنی نامرادیوں کا بدلہ چکا لیا تھا۔

......مارتے مارتے جب اس کے بازو شل ہو گئے تو اس نے شیرو کو واپس کوٹھڑی میں پھینک دینے کا حکم دیا اور خود اپنی آرام گاہ میں پہنچ کر بے دم سا ہو کر بستر پر گر گیا۔

شیر وکو شام کے وقت ہوش آیا تو وہی سنتری اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

اس نے پانی سے بھرا مٹی کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس لمحے شیر وکو اس کی اس ''نیکی'' پر نہ جانے اتنا غصہ کیوں آ گیا۔ اس نے بڑے غصے سے جھنجلا کر سنتری سے کہا: ''دیکھو اگر تم اس طرح میری ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مجھے ڈوگروں سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی ان کے وفاداروں سے۔''

سنتری نے اس کی بات کا جواب نہ دیا صرف مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے ضد کر کے اور شیرو کی لعن طعن سننے کے باوجود زبردستی اور دوسرے لوگوں سے چوری چھپے اسے دودھ بھی پلا دیا۔ دودھ میں اس نے پھٹکڑی، ہلدی اور گھی خاص طور سے گرم کر کے ملا دیا تھا۔

شیر وکو قدرے افاقہ محسوس ہو رہا تھا، لیکن وہ ایک عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ کبھی تو وہ اپنے اس پر اسرار محسن کے لیے اپنے دل میں احترام کے جذبات موجزن پاتا اور کبھی جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر اسے برا بھلا کہنے لگتا۔

آج اس کی ڈیوٹی رات آٹھ بجے ختم ہو رہی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے شیر وکو اس کی استقامت اور ثابت قدمی پر مبارک باد دی اور اس بات کا یقین دلایا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا۔

شیر واس کی طرف احسان مندی سے دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

............☆☆☆............

رات کا پہلا پہر تھا جب شیر وا چانک ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا...... ایک کنکر روشن دان سے اس پر آن گرا تھا۔ پھر اس نے دو ہاتھوں کو سلاخیں اکھاڑتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ہاتھوں نے روشندان میں اتنی جگہ بنا دی تھی جس میں سے شیر و جیسے جسم کا نوجوان آسانی سے گزر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ایک رسہ اندر آیا جس کا ایک سرا دیوار کے ساتھ لٹک رہا تھا اور دوسرا باہر۔

شیر و نے دھڑکتے دل سے رسے کو پکڑا تا کہ اس کے سہارے دیوار پر قدم جما تا روشندان تک پہنچ سکے، لیکن ابھی اس نے پہلا ہی قدم بڑھایا تھا کہ اس کی نبضیں ساکت ہو گئیں...... پہرے دار کی ٹارچ کی روشنی اسے دروازے کے باہر لہراتی بل کھاتی صاف نظر آ رہی تھی۔

شیر و بیک وقت دو باتوں کا شکار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باہر والوں کو اس بات کی اطلاع کیسے دے کہ وہ رسی باہر کھینچ لیں اور دوسری طرف وہ پہرے دار کے وہاں پہنچنے سے پہلے باہر کود جانا چاہتا تھا۔ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا وہ۔

پہرے دار کی ٹارچ کی روشنی اس کے سامنے والی دیوار پر لرز رہی تھی، پھر یک بیک روشنی غائب ہو گئی۔ شیر و نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اب پہرے دار کے قدموں کی آواز بھی دور ہی دور ہٹتی جا رہی تھی...... اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ اس نے اپنے جسم پر لپٹے چیتھڑوں سے دونوں ہاتھ پونچھے اور رسی کی طرف لپکا۔

......اس کی جسمانی حالت قطعی اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ رسی کے سہارے دیوار میں بنے روشندان تک پہنچ سکتا، لیکن اس لمحے نہ جانے کہاں سے اتنی توانائی اس میں عود کر آئی کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ رسی کو تھاما اور دیوار پر پاؤں ٹیکتا روشندان کی طرف لپکا

اور ابھی وہ بمشکل دو تین فٹ ہی اوپر پہنچا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اسے اپنی کمزوری پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ تاہم رسی کو ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اس نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور دوبارہ ہمت کر کے اوپر کی سمت سرکنے لگا۔ روشندان کے نزدیک اچانک ایک ہاتھ دست سکندری کی طرح نمودار ہوا اور کسی نے اندر جھکتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی مدد کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیرو کا دم پھولنے لگا تھا۔ اس لمحے اس نے اس تائید غیبی کو اپنی خوش بختی جانا اور کسی نہ کسی طرح اپنے دونوں ہاتھ اندر لپکتے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں دے دیئے جنہوں نے اسے اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ دیوار سے رگڑ کھاتا وہ اب روشندان تک پہنچ گیا تھا جس کی کچھ سلاخیں اس کی مدد کو آنے والے نے نکال کر اس کے باہر نکلنے کے لیے راستہ بنا دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ روشندان سے دھڑ باہر نکالے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

رسی اندر پھینکنے والوں نے روشندان کے اوپری حصے میں دیوار کے دونوں اطراف لگی لوہے کی مضبوط سلاخوں سے ایک اور رسی باندھ کر اترنے کے لیے بھی آسانی پیدا کر دی تھی۔

شیرو کو توقع تھی کہ باہر کم از کم اس کے پانچ چار ساتھی اس کے استقبال کو ضرور موجود ہوں گے، لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ وہاں صرف ایک نقاب پوش موجود تھا جس نے اس کے پاؤں زمین سے لگتے ہی اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف کھینچنا شروع کر دیا۔

شیرو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے احکام کی تعمیل کرے یا نہ کرے؟ ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ اسی شخص نے اسے قید سے رہائی دلائی ہے، لیکن اس کا رویہ بڑا پراسرار سا لگ رہا تھا۔ شیرو ایک طرح سے اس کے ساتھ گھسٹ ہی رہا تھا۔ راستے میں جب اس نے ایک مرتبہ اس کا نام جاننا چاہا تو نووارد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اب وہ لوگ تھانے سے قریباً آدھ میل دور پہنچ چکے تھے۔

''فی الحال خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔'' نووارد نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

شیرو چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سے پہلے بھی اس نے کہیں یہ آواز سنی ہے، لیکن کہاں؟ اسے یاد نہ آ سکا۔

''کیا تم حسین خان کے ساتھی ہو؟'' اس نے چلتے چلتے ہانپتے ہوئے نووارد سے پوچھا کیونکہ تیز چلنے سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔

''جلد ہی تمہیں تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔'' نقاب پوش نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

اب وہ لوگ اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہو رہے تھے جو تھانے سے قریباً دو ڈھائی میل دور واقع تھا اور جس کے چاروں اطراف گھنا اور گنجان جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں کچھ دور جانے کے بعد شیرو بے دم سا ہو گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ ''مجھ سے اور نہیں چلا جاتا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اٹھو۔ شاباش! ہمت کرو۔ تھوڑی دور اور چلنا ہے۔'' نقاب پوش نے اس کی ہمت بندھائی۔

شیرو نے درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہونا چاہا لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے اپنی بزدلی پر غصہ تو بہت آیا، لیکن وہ بمشکل چند قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گر پڑا۔

نو وارد نقاب پوش نے اسے زمین پر الٹا لٹا کر اس کا بدن مخصوص انداز سے دبایا تو شیرو کو کچھ سکون محسوس ہوا۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ہم سفر نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے سہارے سے آگے اٹھایا اور پون گھنٹے کے اس سفر کا اختتام آخر ایک پہاڑی سلسلے میں ایک انتہائی محفوظ اور قدرتی غار کے کنارے پر ہوا۔

............☆☆☆............

چاند کی روشنی میں اردگرد کا سارا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔

......شیرو نے غار کے کونے پر کسی عورت کو سجدہ ریز دیکھا اور جب عورت نے سجدے سے سر اٹھایا تو پتہ چلا کہ وہ اس کی ماں تھی۔ شیرو کو دیکھتے ہی اس کے دعا کو پھیلے ہاتھ سمٹ گئے اور وہ اٹھ کر دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔

ماں کی پرشفقت آغوش سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے وہی سنتری کھڑا ہے جو اسے چوری چھپے کھانا دیا کرتا تھا۔

''ت......ت......تم!'' وہ حیرت اور تشکر کے ملے جلے تاثرات سے ہکلایا۔

''ہاں میں۔ سجاول نام ہے میرا۔ تمہارا چچا مجھے جانتا ہے۔'' سنتری نے بڑے پرسکون لہجے میں اپنا تعارف کروایا۔

''لیکن وہ پیغام......''

''وہ میں نے ہی حسین خان کی طرف سے تمہارے لیے لکھا تھا۔ مجھے علم تھا کہ براہ راست اگر میں تمہاری مدد بھی کرنا چاہتا تو تم اسے دشمن کی کوئی چال سمجھ کر کبھی آمادہ نہ ہوتے۔'' سجاول نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے مجھ پر...... بہت بڑا احسان۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ میں نے......'' وہ بے اختیار سجاول سے لپٹ گیا۔

''نہیں شیرو۔ تم ٹھیک تھے۔ تمہیں میرے متعلق یہی رائے قائم کرنی چاہیے تھی۔'' اس نے آہستگی سے شیرو کو خود سے الگ کردیا۔

ان کی گفتگو سن کر زہراں اور لالہ بھی باہر نکل آئے۔ دونوں کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بے اختیار جھلک پڑیں۔ طلوع سحر تک وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ شیرو کو اپنے زخموں کا جیسے احساس ہی نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں کی زبانی شیرو کو علم ہوا کہ بے بے ضد کر کے اپنی ایک قریبی رشتہ دار کے گھر چلی گئی تھی۔ وہ لوگ پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اب معلوم نہیں بے بے ان کے ساتھ ہے یا پاکستان چلی گئی۔

''ایک بات سمجھ لو شیرو۔'' سجاول نے روانگی سے پہلے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''فی الحال یہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا...... میں نے رام سنگھ کے پہلو میں خنجر گھونپا ہے۔ اس کی ناک کے نیچے ہم محفوظ بھی ہیں اور خدانخواستہ......''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔'' شیرو نے بڑے سعادت مندانہ لہجے میں گردن ہلائی۔

''ایک تو تمہاری جسمانی حالت ہی اس قابل نہیں کہ تم کچھ کرسکو۔ دوسرے یہ کہ ہم میں سے کسی کی گرفتاری ہم سب کو مروادے گی۔'' سجاول نے کہا۔

''میرا ایک کام ضرور کرنا سجاول۔'' شیرو نے التجا کی۔

''کیا؟''

''کسی طرح مجھے شرفو سے ملا دو۔''

''اس بات کا کبھی تصور بھی نہ کرنا۔ ہماری ملاقاتیں صرف رازداری میں ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ تمہارے ساتھیوں تک تمہاری سلامتی اور عافیت کا پیغام پہنچ جائے گا۔'' سجاول نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

شیرو کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اس نے گردن جھکا کر سجاول کی بات پر صاد کر دیا۔

''میں معافی چاہتا ہوں دوست، لیکن ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میں مشن مکمل ہونے سے پہلے مارا جاؤں یا رام سنگھ کی نظر میں آ جاؤں۔''

''تم واقعی عظیم انسان ہو۔'' شیرو نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر جوش جذبات سے دباتے ہوئے کہا ''اندر ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ میں تم سے غافل بھی نہیں رہوں گا۔ فی امان اللہ۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

''فی امان اللہ'' شیرو کی ماں کے دل سے سجاول کیلئے صدا بلند ہوئی۔

............☆☆☆............

تلملاہٹ اور غصے سے وہ پھٹا جا رہا تھا۔ حریت پسندوں کی طرف سے مسلسل اور بھرپور نفسیاتی حملوں نے اسے ذہنی مریض بنا ڈالا تھا۔ ......میجر رام سنگھ ہر ایک کو کاٹنے کو دوڑ رہا تھا اور اپنے اس غصے اور بے بسی کا بدلہ لینے کے لیے لے دے کے اسے اگر کوئی نظر آتا تھا تو وہ شیرو تھا......صرف شیرو۔''

''شیرو کو پیش کرو۔'' اس نے علی الصبح اپنے کمرے میں پہنچتے ہی دروازے کے باہر موجود سنتری کو حکم دیا۔ غصے سے وہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اور داہنے ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی کو بے دھیانی میں کئی مرتبہ اپنی داہنی ٹانگ پر خاصی زور سے مار چکا تھا۔

''او۔کے سر!'' کہہ کر سنتری نے واپس مڑنا چاہا کہ سامنے سے چھوٹا تھانیدار منوہر لال عجیب و غریب حلیے میں اسے اپنی سمت بڑھتا نظر آیا۔ اس کے کندھے سے تولیہ لٹک رہا تھا۔ آدھے چہرے پر شیو کا جھاگ چپکا ہوا تھا اور بنیان اور نیکر پہنے ننگے پاؤں وہ قریباً بھاگتا ہوا میجر رام سنگھ کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ میجر رام سنگھ کا ماتھا اس کی وضع قطع دیکھ کر ٹھنکا اور منوہر لال کے کچھ بولنے سے بیشتر ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''مہاراج جی......مہاراج جی!'' رام سنگھ کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''بکو'' رام سنگھ نے چھڑی پورے زور سے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے بائیں ہاتھ پر ماری۔

''وہ......وہ......شیرو بھاگ گیا......مہاراج جی!'' منوہر لال نے قریباً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اوہ...... !باسٹرڈ!'' رام سنگھ نے پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا بید اس کے جسم پر مارا۔

منوہر لال نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو، میجر رام سنگھ نے اسے دو تین بید غصے میں مغلظات بکتے ہوئے مزید رسید کر دیئے۔ احساس ذلت اور غصے نے چھوٹے تھانیدار منوہر لال کو بھی پاگل کر دیا۔

''پاگل...... پاجی!!'' وہ غصے سے چلاتا ہوا باہر دوڑ پڑا۔

رام سنگھ نے پہلے تو اس کے پیچھے دوڑ لگائی، لیکن چند قدم دوڑ کر ہی رک گیا۔ شاید اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہو گیا تھا اور اب اس نے شیرو کی کوٹھڑی کا رخ کیا۔

جب وہ اپنے پہرے داروں کی معیت میں شیرو کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچا تو روشندان کے راستے نکلتا ہوا رسہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا اور کوٹھڑی کے سامنے انسپکٹر میر اور اس کے ساتھی ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے تھے۔

''کھلواسے گدھو۔'' اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رکھا تھا۔

انسپکٹر میر کے اشارے پر ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی نکال کر کانپتے ہاتھوں سے کوٹھڑی کا تالا کھولا۔ سب سے پہلے میجر رام سنگھ ہی اندر داخل ہوا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ روشندان کی کچھ سلاخیں نکلی ہوئی تھیں اور ان میں اتنا خلاء پیدا ہو گیا تھا کہ ایک عام تن و توش کا شخص باآسانی باہر نکل سکتا تھا۔ بجائے اس کے کہ میجر رام سنگھ غصے سے پاگل ہو جاتا، اسے آہستہ آہستہ عقل آنے لگی۔ اس پر اب غصے کے بجائے جھنجلاہٹ اور بے نام سا خوف طاری ہونے لگا تھا: ''یہ لوگ اتنی جلدی اتنے منظم بھی ہو سکتے ہیں؟'' اس نے سوچا اور بڑے مردہ دل سے سر جھکائے باہر آ گیا۔ وہاں موجود سبھی لوگ حیرت سے میجر رام سنگھ کے اس اچانک بدلتے ہوئے رویئے کا جائزہ لے رہے تھے۔

میجر رام سنگھ اس مسئلے پر فی الوقت کسی سے گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی میں آج تک اسے یوں پے در پے ناکامیوں کا منہ کبھی نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ اس نے آج تک کسی کام کو مکمل کیے بغیر چھوڑا ہی نہیں تھا۔ اسی لیے تو راج دربار میں اسے خاص رتبہ حاصل تھا، لیکن ''یہ کمبخت مجاہدین آزادی'' یہی کچھ سوچتا وہ اپنے دفتر میں آ پہنچا جہاں ایک نئی قیامت اس پر ٹوٹ پڑنے کی منتظر تھی۔

..........☆☆☆..........

''سر!'' اس کے محافظ نے ایڑیاں بجائیں۔

میجر رام سنگھ نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے صرف سر اٹھا کر دیکھنے ہی پر اکتفا کیا۔

''ارجنٹ میسج سر!'' کہہ کر اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔

پونچھ چھاؤنی کے افسر کمانڈنگ نے فوراً اسے وہاں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

''ڈرائیور سے کہو فوراً گاڑی لے آئے۔'' اس نے خلاف توقع اپنے گارڈ کو گالیاں دیئے بغیر کہا۔ وہ شاید خود بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔

چند منٹ کے بعد وہ جیپ کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے گردا گرد سڑک کے دونوں اطراف دور دور تک پھیلے پہاڑی

سلسلے اوران سے لپٹی ہریالیاں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

......ایک عجیب سی نحوست اس پر طاری ہونے لگی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے سوچا: ''کہیں ایسا نہ ہو کہ تاریخ کا دھارا اپنا رخ بدل لے ......کہیں یہ مسلمان مفلوک الحال گڈریے اور مزدور کشمیری دوبارہ اقبال مند ہو جائیں۔''

نفاق کا وہ بیج جو اس کے اجداد نے بڑی ہی محنت اور جانفشانی سے ان لوگوں کے دلوں میں بویا تھا اور جس کا پھل اب وہ بڑے مزے سے کھا رہے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بیج کو جس نے اب درخت کی شکل اختیار کر لی تھی، یہ مٹھی بھر مسلمان مجاہدین جڑ ہی سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اگر یہ لوگ اصلیت جان گئے تو متحد ہو کر ان کا راج پاٹ اور سرداریاں سب کچھ ان سے چھین لیں گے۔''

''لیکن نہیں......!'' کوئی نادیدہ طاقت اسے طفل تسلیاں دینے لگی: ''اس نفاق کے درخت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بڑی دور تک کشمیری مسلمانوں کے دل و دماغ میں جا گھسی ہیں۔ بس یہ تو وقتی ابال ہے جیسے ہی ایک مرتبہ پھر وہ لوگ اپنی مکارانہ فریب کاریوں کا جال لے کر ان کی طرف بڑھے، یہ سادہ لوح سے مسلمان دوبارہ اس میں پھنس جائیں گے۔ تب نہ کوئی مجاہد باقی رہے گا نہ آزادی کی تڑپ۔ ایک نہ ایک روز یہ کھیل بالآخر ختم ہو ہی جائے گا۔''

جیپ پونچھ چھاؤنی کے باہر آ کر ٹھہر گئی......اسے پہچان کر ڈیوٹی پر موجود پہریداروں نے بیریئر اوپر اٹھا کر جیپ کو راستہ دے دیا۔

مجاہدین کے ممکنہ حملے اور ریاست میں ان کی مسلسل چھاپہ مار کارروائیوں نے مہاراجہ کے نمک خواروں کو خاصا چوکنا کر دیا تھا اور خصوصاً پونچھ میں تو فوج نے زبردست حفاظتی اقدامات کیے ہوئے تھے۔ چھاؤنی کے نزدیک کسی کو پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ پچھلے آٹھ دس روز میں وہ پندرہ بیس مشتبہ شہریوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بھی بنا چکے تھے اور چھاؤنی کے او۔سی کا حکم تھا کہ کسی فوجی افسر کو بھی شناخت حاصل کیے بغیر اندر داخل نہ ہونے دیا جائے، لیکن میجر رام سنگھ اس حکم سے مستثنیٰ تھا۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اسے روک کر اس کی شناخت دریافت کرتا۔

چھاؤنی کے داخلی دروازے کے ایک کونے میں بنے کمروں کے سامنے اس نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا اشارہ کیا جہاں فوجیوں کے ہجوم میں اسے بوڑھے او۔سی ڈوگرے کا چہرہ نمایاں نظر آیا۔

جیپ سے اتر کر وہ تیز رفتاری سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا او۔سی تک جا پہنچا۔ وہاں موجود فوجیوں کا ہجوم اسے دیکھتے ہی چھٹ گیا تھا۔ او۔سی کے سامنے ایک سٹریچر پر لاش دھری تھی جس پر سرخ کمبل ڈال کر اسے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میجر رام سنگھ نے غیر اختیاری طور پر آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ننگا کیا تو ایک سنسناہٹ سی اس کے رگ و پے میں سما گئی اور برقی رو بڑی تیزی سے اس کے دل و دماغ میں دوڑنے لگی۔

اس کے سامنے لالہ مہاویر پرشاد کی لاش دھری تھی۔ دل کے مقام پر صرف ایک سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے بہنے والا خون اب کناروں پر جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ماہر بندوقچی نے بڑے اطمینان سے اس پر نشانہ بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔

رام سنگھ لاش کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ کسی نے بھی ابھی تک لالہ مہاویر پرشاد کی دہشت زدہ کھلی آنکھوں کے پپوٹے بند نہیں کیے تھے اور ان آنکھوں کی دہشت ناکی سے اسے اب وحشت ہونے لگی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے مہاویر کی آنکھوں سے خارج ہونے والی برقی

لہریں اس کے جسم میں داخل ہو کر اسے جھلسا کر رکھ دیں گی۔

''یہ رقعہ لاش کے ساتھ رکھا تھا۔'' ایک جوان نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اسے تھما دیا۔ میجر رام سنگھ نے کسی سحر زدہ معمول کی طرح رقعہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اسے اپنی زبان کے گنگ ہو جانے کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''لاش ایک پٹرول پارٹی نے دریافت کی تھی۔'' بوڑھے او۔سی نے مردہ سی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''کب؟ کہاں سے؟'' رام سنگھ کو یہ تین الفاظ ادا کرنے کے لیے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لانا پڑا۔

''چھاؤنی کے نزدیکی پہاڑی سلسلے میں ایک نمایاں جگہ پر لاش دھری تھی۔ کاغذ کا یہ ٹکڑا اس کے سرہانے ایک پتھر کے نیچے رکھا ملا تھا۔ اس وقت تک خون بند نہیں ہوا تھا، شاید اسے رات کے آخری پہر گولی ماری گئی ہے۔ میں نے فوراً گشتی پارٹیاں پہاڑی سلسلے میں پھیلا دی ہیں، لیکن ان کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔''

''ہوں'' میجر رام سنگھ نے لمبی سانس لی۔

وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر پلٹا اور بوجھل قدموں سے اپنی جیپ تک آ گیا۔ جیپ کے بونٹ سے ٹیک لگا کر اس نے رقعہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

''رام سنگھ!

تمہارا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ آج جس انجام سے یہ بھیڑ نما بھیڑیا دوچار ہوا ہے، تم بھی بہت جلد اسی انجام کو پہنچنے والے ہو۔ تمہارے جرائم کی فہرست بھی اس کی طرح بہت لمبی ہے اور ہماری ہائی کمان نے تمہارے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا ہے۔ کل تک اگر تم نے آزادی کشمیر کے جرم میں گرفتار شدہ تمام مظلوموں کو رہا نہ کیا تو اپنے بھیانک انجام کو پہنچو گے۔ مجاہدین کی رہائی کی صورت میں ہم تمہیں پونچھ سے بحفاظت نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں گے دوسری صورت میں یاد رکھنا، پونچھ تمہارے لیے موت کا پنجرہ ثابت ہوگا۔

حسین خان......کمانڈر افواج آزادی کشمیر۔''

میجر رام سنگھ کو ہاتھ پاؤں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بجائے واپس جانے کے چھاؤنی میں قیام کرنا ہی مناسب جانا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔

رقعہ پڑھتے ہوئے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا، لیکن کچھ نہ کر سکا۔ اسے کسی اور کے بجائے اب اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا تھا۔

یلغار

21 اکتوبر 1947ء کی ایک شام:

دنیا بھر میں اخباری ایجنسیوں کے نمائندے دلی میں مہاراجہ کشمیر کے روحانی لے پالک شیخ عبداللہ کی پریس کانفرنس میں موجود بڑے غور سے اس بیان کو سن رہے تھے۔

''معزز حاضرین!'' مستقبل میں کشمیر کا شہنشاہ بننے کے امیدوار کی جذبات سے عاری آواز بلند ہوتی ہے۔ ''مشرقی پنجاب کے شہروں خصوصاً پٹیالہ اور بھرت پور میں جو جو واقعات رونما ہو رہے ہیں، وہ مسلمانوں کو بھارت میں اپنے مستقبل سے مایوس کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ سارے بھارت کے خصوصاً ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں میں زبردست بے چینی پائی جاتی ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں سے بہت زیادہ ہے اور اب وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر ریاست کا الحاق بھارت سے ہو گیا تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔''

پونچھ میں ہونے والے خون ریز ہنگاموں اور مسلمانوں کی مسلح کارروائیوں کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا:

''ریاستی حکومت کی انتہائی غلط اور غیر دانش مندانہ پالیسیوں کی وجہ سے پونچھ میں مسلمانوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا کر مسلح جدوجہد شروع کر دی ہے۔ ان لوگوں نے ماضی میں مہاراجہ اور اس کے ٹوڈیوں خصوصاً مقامی حکمرانوں کے ہاتھوں بڑے مظالم کا سامنا کیا۔ بیداری کی جو ایک لہر سارے ہندوستان میں دوڑ گئی ہے، اس کے اثرات یہاں بھی پہنچے ہیں۔ پونچھ کے لوگ ہمیشہ سے آزادی پسند اور بہادر کہلاتے آئے ہیں۔ انہوں نے حالات سے مایوس ہو کر اب ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ پونچھ میں فوج کی آمد اور کارروائیوں نے ان لوگوں کے اشتعال میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

پونچھ کے زیادہ تر لوگ انڈین آرمی کے سابق فوجی ہیں اور ان کی رشتہ داریاں راولپنڈی اور جہلم میں ہیں۔ یہ لوگ اپنے بیوی بچوں کو سرحد پار چھوڑ کر وہاں سے اسلحہ لے کر واپس آگئے ہیں اور اب ریاستی فوج کے خلاف زیر زمین کارروائیوں میں مصروف ہیں۔''

''جناب والا!'' ایک اخبار کا نمائندہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ''ان لوگوں کو کس کی پشت پناہی حاصل ہے؟''

''پاکستان کی!'' شیخ عبداللہ نے دوٹوک جواب دیا۔

''موجودہ صورتحال کیا ہے؟'' دوسرا سوال ہوا۔

''ریاست کے کئی مقامات سے مہاراجہ کی فوجوں کو پسپا کر دیا گیا ہے۔''

''جناب والا!'' ایک غیر ملکی نمائندہ کھڑا ہوتا ہے۔ ''ہماری اطلاعات کے مطابق ریاست کی مسلمان آبادی خصوصاً پونچھ کے لوگ ریاست کے پاکستان سے الحاق کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔''

''شیر کشمیر'' کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کا جواب دیئے بغیر کانفرنس سے باہر نکل جاتا ہے۔

اخباری نمائندہ حیرت سے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا، پھر منہ ہی منہ میں اس نے کچھ کہا اور شیخ عبداللہ کی تقلید کرتے ہوئے وہ بھی باہر آ گیا۔

............☆☆☆............

جنرل طارق بڑی تیزی سے اپنے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ اس کی حتی المقدور کوشش تھی کہ جلد از جلد کشمیر میں داخل ہونے والے مجاہدین کو مسلح کر سکے۔ آرمی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر شیر خان اور آرمڈ کور کے بریگیڈیئر ٹامی (مسعود) ہر مرحلے پر ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے نظر آتے تھے۔ خصوصاً فوج کے ''ضائع شدہ'' اسلحے کے لیے جو کراچی میں سمندر میں پھینکے جانے کے لیے رکھا گیا تھا۔ بریگیڈیئر ٹامی نے ان کی ہر طرح مدد کی اور راتوں رات وہ اسلحہ اپنے پاس اسٹورز میں محفوظ کر لیا جہاں سے بعد میں وہ مجاہدین میں تقسیم ہوتا رہا۔

جنرل طارق کی زیادہ امیدیں ان چار ہزار رائفلوں سے وابستہ تھیں جو انہوں نے پولیس سے حاصل کرنا تھیں۔

لیکن جب یہ رائفلیں آگے پہنچیں تو خود جنرل بھی چکرا گیا۔ پولیس نے ان رائفلوں کی جگہ جو انہیں فوج سے ملیں تھیں، فرنٹیئر کی بنی ہوئی دیسی رائفلیں آگے بھیج دیں۔ یہ رائفلیں بظاہر تو فوجی رائفلوں کی نقل ہوتی ہیں، لیکن کارکردگی کے لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہیں ہوتیں۔ ان کی نالی جلد خراب ہو جاتی ہے اور لکڑی اور لوہے کے باقی حصے بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ قبائلیوں کے پاس اپنی رائفلوں کی خرابی دور کرنے کیلئے مناسب بندوبست ہوتا ہے جبکہ دشمن کے علاقے میں لڑنے والے رضا کاروں کے پاس جنہوں نے اپنی کارروائیاں اب شروع کر دی تھیں، ان کی مرمت کا کوئی مناسب بندوبست نہیں تھا۔ جو رائفل ایک دفعہ خراب ہوتی، وہ ناکارہ ہو کر رہ جاتی۔

اسے دوسرا دھچکا اٹلی سے حاصل کردہ اسلحے نے لگایا جو اٹلی سے اسی مقصد کیلئے خریدا گیا تھا۔ اس میں کچھ لائٹ گنیں (برین گنیں) بھی شامل تھیں۔ جب یہ ڈھائی سو مشین گنیں جنرل طارق تک پہنچیں تو انہوں نے سر پیٹ لیا کہ وہ تو اٹلی کی بنی ہوئی اسٹین گنیں تھیں۔

اسٹین گن کی رینج صرف دو سو گز ہوتی ہے اور ان کی حیثیت برین گنوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

ان تمام نامساعدہ حالات کے باوجود اگر کوئی چیز ان کی ہمت بڑھائے ہوئے تھی، وہ پاکستانی عوام کا کشمیر کے لیے لڑ مرنے کا عزم اور قبائل کے غیور پٹھانوں کا ولولہ، جوشِ جہاد اور اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کیلئے کٹ مرنے کا مصمم ارادہ تھا۔

جنرل طارق نے بجائے پیچھے ہٹ جانے اور کشمیر کے مظلوم عوام کو ظالم مہاراجہ اور بھارتی فوجوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے خدا کی مدد، اپنی قوت بازو اور ساتھیوں کے لازوال اور مصمم عزم و عمل اور جوشِ جہاد پر تکیہ کر کے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور تاریخ کا سینہ شق کر کے اس میں سے قرونِ اولیٰ کی وہ تصویر ایک عالم کو دکھائی کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔

کشمیر کے مرغزاروں میں آزادی کا نعرہ مستانہ گونجا تو غاصبوں کے ایوان ہل کر رہ گئے۔ 20 اکتوبر 1947ء کو بھارت کے انگریز کمانڈر انچیف کو پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف کا خفیہ پیغام موصول ہوا۔

''پانچ ہزار سرفروش قبائلی پٹھان مظفر آباد اور دومیل کو روندتے ہوئے سری نگر کی طرف یلغار کر رہے ہیں۔''

23/اکتوبر 1947ء کو مہاراجہ نے جو گھبراہٹ اور خوف کا بری طرح شکار ہو چکا تھا، ریاست کی قریباً 3/4 آبادی کی مرضی کے بالکل خلاف محض اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے تاریخ کی بدترین غلطی کا ارتکاب کیا اور بھارت سے ریاست کے جبری الحاق کا معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ اتنی مکاری اور جلدی سے طے پایا کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی۔ جب ریاست کے مسلمانوں اور پاکستانی عوام تک راجہ کا منافقانہ فیصلہ پہنچا تو وہ تڑپ کر رہ گئے۔

اس کے ساتھ ہی پنجاب کے میدانوں اور خیبر کی پہاڑیوں سے نعرہ تکبیر بلند کرتے سربلندوں کے قافلے مظلوم و مقہور کشمیری مسلمانوں کی صدا پر لبیک لبیک کہتے ہوئے کشمیر کی طرف بڑھے۔ کشمیر میں موجود حریت پسندوں نے اپنے سروں کی فصل کٹوا کر مہاراجہ اور براہمن کی مکارانہ سازش کے سامنے جسموں اور خون کی وہ دیوار کھڑی کر دی جسے عبور کرنا دونوں کے لیے ممکن نہ رہا۔

کشمیر کی وادیاں آزادی کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ چشموں کا پانی شہیدوں کے لہو سے سرخ ہو گیا۔ پہاڑوں کو مجاہدین نے اپنے خون کا غسل کروایا اور وہ انتہائی فرسودہ اسلحہ، لیکن انتہائی مضبوط ارادوں کے ساتھ بھارت اور کشمیر کی افواج سے ٹکرا گئے۔

............☆☆☆............

23/اکتوبر 1947ء کو سری نگر میں مہاراجہ کے محلات کے در و دیوار اس خبر سے کانپ اٹھے کہ قبائلی پٹھانوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ لوگ دریائے جہلم کو عبور کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے کہ وہ ''حملہ کرنے'' کی زیادہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور ''چھپ کر گھات لگانے'' میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا، لیکن یہاں صورت حال بالکل الٹ ہو چکی تھی۔

یہ قبائلی جن کی تعداد صرف دو ہزار تھی، ریاستی افواج کے لیے ایسی دہشت اور خوف کی علامت بن گئے کہ کئی جگہ ڈوگرہ افواج نے بغیر لڑے میدان ان کے لیے خالی کر دیا۔ قبائلی بسوں میں بیٹھ کر آئے تھے۔ ان کے حملہ کرنے کا انداز بھی نرالا اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ طوفان کے ریلے کی صورت لاریوں میں سفر کرتے سری نگر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہاں پکنک منانے جا رہے ہوں۔ راستے میں جہاں کہیں ڈوگرہ فوجیوں کی طرف سے مزاحمت ہوتی، وہاں ان کا کارواں رک جاتا۔ وہ لوگ بسوں کو محفوظ آڑ میں کھڑا کر لیتے اور اپنی ایک چوتھائی نفری کو بسوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باقی لوگ فوراً پہاڑی سلسلے میں غائب ہو جاتے جہاں وہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر سیکشن کی صورت اختیار کر لیتے اور مزاحمتی فوج کو اس طرح گھیرے میں لیتے کہ ان کے فرار کی کوئی راہ باقی نہ بچتی۔

شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ''معجزہ'' ہوا کہ ان کا راستہ روکنے والے ڈوگرہ دستے میں سے کوئی خوش قسمت سپاہی زندہ بچ کر نکل گیا ہو۔ مردہ فوجیوں کے اسلحے پر وہ فوراً قبضہ کر لیتے تھے۔

پہلے پہل ان لوگوں کا انحصار درے کی بنی ہوئی دیسی رائفلوں ہی پر تھا، پھر ان کے ہاتھ ریاستی فوج کی تھری ناٹ تھری رائفلیں آ گئیں جس سے ان کے حملوں میں اور زیادہ جان پڑ گئی۔

27/اکتوبر 1947ء:

ریڈیو پاکستان نے دو خبریں بیک وقت نشر کیں۔ یہ دونوں ہی پاکستان ہی میں نہیں برصغیر میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کو چونکا دینے کے لیے کافی تھیں۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ کشمیر نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا ہے اور دوسری یہ کہ...... بھارتی فوج کشمیر میں داخل ہو جائے گی۔

............☆☆☆............

سری نگر کا ہوائی اڈہ پچھلے تین چار روز سے کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا تھا۔ کنٹرول ٹاور پر ڈیوٹی دینے والے آپریٹر کے لیے یہ معمولی بات تھی کیوں کہ اس سے پہلے اس کی راتیں زیادہ تر اونگھتے ہوئے ہی گزرا کرتی تھیں، لیکن اس روز جب وہ ڈیوٹی پر آیا تو اسٹیشن کمانڈر نے اسے خاص طور سے اپنے پاس طلب کر کے خصوصی ہدایات دی تھیں۔

......کنٹرول ٹاور کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے آپریٹر نے وہاں خصوصی انتظامات اور غیر معمولی صورت حال کا جائزہ لے لیا تھا۔ فوج کی ایک پلٹن نے اڈے کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور بھارتی فوج کا ایک اعلیٰ افسر ریاستی فوج کے دو افسروں کے ساتھ عمارت میں براجمان تھا۔

شام کے سائے لمبے ہو کر رن وے کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے تھے۔ سنہری چمکیلی کرنوں کا رقص پہاڑوں کی چوٹیوں پر بڑا ہیجان انگیز لگ رہا تھا۔ ناچتی کرنیں اب جوش میں سرخی کا لبادہ اوڑھ رہی تھیں، پھر اندھیرا آہستہ آہستہ منظر پر غالب آنے لگا۔ تینوں افسر آپریٹر کے ساتھ ہی اس سیٹ پر سر جھکائے کھڑے تھے جس نے کسی پراسرار مہمان کی آمد کا پیغام نشر کرنا تھا، لیکن انتظار کی گھڑیاں لمبی ہی ہوتی جا رہی تھیں اور ابھی تک ان کی مراد بر آتی نہیں آ رہی تھی۔

''ریڈیو آن کرو۔'' ان میں سے ایک نے جس کے کندھے پر سجا شو کا اس کے بھارتی مسلح افواج سے تعلق کی گواہی دے رہا تھا، آپریٹر کو مخاطب کیا۔

''یس سر!'' کہہ کر آپریٹر اپنے کام میں جت گیا۔

مطلوبہ فریکوئنسی پر سوائے شوں شوں کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

''سوری سر، کوئی آمد نہیں۔'' اس نے مایوسی سے گردن اسی افسر کی طرف موڑی۔

''مجھے دو۔'' افسر نے خود آگے بڑھ کر مائیک اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

''ہیلو بلیک برڈ...... بلیک برڈ۔ اوور'' اس نے پیغام دہرا کر ریسیونگ سوئچ آن کیا، جواب میں دوسری طرف گہرا سناٹا تھا۔

بھارتی افسر نے دوبارہ کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے سیٹ آف کر دیا۔

''کمال ہے۔ اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔'' بھارتی افسر نے اپنے دونوں ساتھیوں سے تشویش ظاہر کی جن کی نظریں بار بار گھڑی کی سوئیوں پر جا رہی تھیں۔

''رام جانے'' ان میں سے ایک نے مختصر سا جواب دیا۔

تینوں منہ لٹکائے ایک طرف ہٹ کر تبادلہ خیال کرنے لگے کہ اچانک ریڈیو میں جان پیدا ہوئی۔ تینوں بے قراری سے آپریٹر کے سر پر مسلط ہو گئے جو مختلف ڈائل گھما کر آواز کو نمایاں کر رہا تھا۔

''ہیلو سری نگر......ہوشیار اوور۔''

''سری نگر ہوشیار اوور۔'' آپریٹر نے جواب دیا۔

کسی پہاڑی پوسٹ سے پیغام آ رہا تھا۔ ''ہم نے ابھی ایک جہاز کو پرواز کرتے ہوئے سری نگر کی طرف بڑھتے دیکھا ہے اوور۔''

''کوئی شناخت......اوور۔''

''کوئی نہیں۔ اس نے لائٹیں بھی آف کر رکھی ہیں۔ اوور۔'' جواب ملا۔

''او۔ کے......اوور اینڈ آؤٹ۔''

آپریٹر نے کانوں پر چڑھا ہیڈ فون اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ریڈیو سے بلند ہوتی آواز چونکہ سب کو بخوبی سنائی دے رہی تھی، اس لیے آپریٹر نے کسی کو خود بتانا مناسب نہ جانا......انہوں نے خود ہی سب کچھ جان لیا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' ریاستی فوج کے افسر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے بھارتی افسر کی طرف دیکھا۔

''اپنے جوانوں سے کہو وہ فوراً رن وے کو گھیرے میں لے کر ہوشیار ہو جائیں۔ شاید یہ کوئی پاکستانی چال ہے۔'' اس نے بجائے ریاستی افسر کے سوال کا جواب دینے کے اسے ہدایت جاری کی۔

دوسرا افسر اس کی بات سنتے ہی باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں افسر دوربین سنبھالتے ہوئے باہر نکل آئے۔ انہوں نے آپریٹر کو باہر نکلنے سے پہلے کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔ ابھی وہ بمشکل کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے جب ایک مہیب گڑگڑاہٹ نے ان کے قدم تھام لیے۔ اس کے ساتھ ہی ہوائی اڈے کے شمالی جانب بنے پہاڑی سلسلے کی اوٹ سے روشنیوں میں نہایا ایک ڈکوٹا جہاز نمایاں ہونے لگا۔ دوربین ان کی آنکھوں سے جا لگی اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے مطمئن ہو کر دوربین آنکھوں سے ہٹالی۔ شاید یہی ان کا مطلوبہ جہاز تھا۔ اس پہاڑی سلسلے کی اوٹ سے کبھی کبھی کسی رائفل کے فائر ہونے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ ان سے کچھ فاصلے پر حملہ آور موجود ہیں، لیکن اس بات کا بھی انہیں بخوبی علم تھا کہ ان کی تھری ناٹ تھری رائفلوں یا اسٹین گنوں کی گولیاں اس جہاز کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتیں۔

چند منٹ بعد ہی ونگ کمانڈر مہر سنگھ اپنے دو اسٹاف افسروں کے ساتھ جہاز کے کاک پٹ سے برآمد ہوا۔ اس کا ریڈیو خراب ہو چکا تھا، لیکن بھارتی ایئر فورس کا یہ مایہ ناز افسر جہاز کو کامیابی سے اڑاتا ہوا ہوائی اڈے پر لینڈ کر گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک تیز رفتار جیپ دو مسلح فوجیوں سے بھرے ٹرکوں کے درمیان مہاراجہ کے محل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ مہاراجہ جس کی نیندیں پچھلے دو تین مہینوں میں پیش آنے والے مسلسل واقعات نے حرام کر رکھی تھیں، ان کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا

کرے؟ کدھر جائے؟

بھارت سے الحاق کا فیصلہ بھی اس نے افراتفری اور گھبراہٹ کے عالم میں کیا تھا۔ وہ صرف اپنی گدی اور راج پاٹ کی ضمانت چاہتا تھا جس کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا، لیکن بھارت سے الحاق کا اعلان کرنے کے بعد سے اسے ایک عجیب سی بے کلی لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھارت نواز مصاحبوں کے جال میں پھنس چکا تھا۔

اس اطلاع نے قبائلی پٹھان بارہ مولا تک آ پہنچے ہیں، اس کے اعصاب مختل کر دیئے تھے۔ وہ بے چینی سے بھارتی فوجوں کی آمد کا منتظر تھا کہ ونگ کمانڈر مہر سنگھ اور دو اعلیٰ افسر اس کی مدد کو پہنچ گئے۔

رات گئے محل میں تینوں اسٹاف افسروں کا استقبال مہاراجہ نے خود کیا تھا۔ مہر سنگھ کی آمد ہی اس بات کی نشاندہی کے لیے کافی تھی کہ بھارت مہاراجہ کی مدد کو آ رہا ہے کیونکہ تقسیم ملک سے پہلے ہی ونگ کمانڈر مہر سنگھ مسلم دشمنی کے لیے خاصی شہرت پا چکا تھا۔ اس کا شمار بھارتی فوج کے افسران کی اس لابی میں ہوتا تھا جو نوزائیدہ مملکت پاکستان پر قبضہ کر کے اکھنڈ بھارت کا خواب پورا کرنا چاہتی تھی۔

مہاراجہ مجاہدین کے حملوں سے اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ ڈھنگ سے اس "فوجی وفد" سے بات ہی نہ کر پا رہا تھا۔ قریباً تین گھنٹے کی گرما گرم بحث کے بعد مہر سنگھ مہاراجہ سے ایک "درخواست نامے" پر دستخط لے چکا تھا جس کے مطابق مہاراجہ نے بھارت سے پاکستانی حملے کے خلاف فوجی مدد کی درخواست کی تھی۔

دستاویز اپنے قبضے میں لیے ونگ کمانڈر مہر سنگھ علی الصبح پالم پور کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا، جہاں اس کی واپسی کا انتظار شدت سے ہو رہا تھا۔

............☆☆☆............

سجاول اور شیرو پہاڑی کی ایک قدرتی اوٹ میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے......!

"آپ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتے؟" شیرو نے پریشان ہو کر سجاول سے پوچھا۔

یہ اطلاع اس کے لیے بڑی چکرا دینے والی تھی کہ سجاول کا تعلق کسی بھی گروپ سے نہیں اور صرف اپنی انفرادی کوششوں سے شیرو، اس کی ماں، زہراں اور اس کے باپ کو میجر رام سنگھ کے ظالمانہ شکنجے سے نکال لایا ہے۔

"ابھی وقت نہیں آیا برخوردار۔" سجاول نے حسب معمول اسے ٹالنا چاہا۔

"کیوں؟"

"تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ دیکھو شیرو میں تمہیں واپس جانے سے نہیں روکوں گا۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا...... ایک مسلمان اور کشمیری ہونے کے ناطے یہ میرا فرض تھا کہ میں اپنے کشمیر کے لیے لڑنے والے ایک مجاہد کو جس کے باپ نے اس مقدس سرزمین کی آزادی کے لیے جان کا نذرانہ دیا تھا، دشمن کی قید سے رہا کرواؤں اور کشمیر کی عزت...... اس کی منگیتر اور ماں کو دشمن کے ناپاک ارادوں سے بچائے رکھوں...... اور اگر تم اسے نیکی یا احسان سمجھتے ہو تو میری ایک درخواست ہے کہ ابھی کسی کو میرے متعلق کچھ نہ بتانا۔"

"میں آپ کی بات میں پوشیدہ مصلحت کو گو کہ سمجھ نہیں پایا، لیکن آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس

راز کو راز ہی رکھوں گا۔ اس وقت تک جب تک کہ آپ خود اس سے پردہ اٹھانا پسند نہ کریں۔'' شیرو نے سر جھکا لیا۔

''میرے خیال میں ابھی زہراں، تمہاری ماں اور چچا کے لیے پوری وادی میں سب سے محفوظ پناہ گاہ یہی ہے کیونکہ میجر رام سنگھ زخم خوردہ کتے کی طرح ان کی بو سونگھتا پھر رہا ہوگا۔ مناسب تو یہی تھا کہ ابھی تمہارے ساتھیوں کو بھی اس پناہ گاہ کا علم نہ ہونے پائے کیونکہ بدقسمتی سے ہماری ماؤں نے کچھ ایسے بدبختوں کو جنم دیا ہے جنہوں نے چند ٹکوں کے عوض مادر وطن کی عصمت کا سودا دشمن سے کر لیا ہے...... یہ لوگ مجاہدین میں بھی شامل ہیں اور پل پل کی اطلاع اپنے مالکوں کو پہنچا کر ان کی سرگرمیوں کے راستے میں دیوار بن رہے ہیں۔ خدا نہ کرے اگر یہ بات کسی ایسے غدار تک جا پہنچی، مجھے اپنے انجام کی تو فکر نہیں لیکن......'' سجاول خاموش ہو گیا۔

''میرے محترم! کاش میں آپ کے احسانات اور ان جذبات کا جو آپ ہمارے لیے رکھتے ہیں، اس دنیا میں بدلہ دے سکوں۔ کاش ......!'' جذبات نے اسے مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی۔

سجاول نے دیکھا، نوجوان شیرو کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

''ادھر آؤ'' اس نے شیرو کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دوسرے کے پیچھے پہاڑی سلسلے سے منسلک گھنے جنگل کے اندر ہی اندر ڈیڑھ دو میل تک گھستے چلے گئے۔ ایک جگہ پہنچ کر جہاں گھنے درختوں سے سورج کی شعاعیں بمشکل گزر کر زمین تک پہنچ سکتی تھیں، سجاول نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اپنے کندھے پر رکھی کدال سے اس نے ایک درخت کے تنے کے ساتھ تھوڑی سی کھدائی کی اور ایک تھیلا باہر نکال لیا۔ تھیلا خاصا وزنی تھا۔ شیرو کو اس کی مدد کے لیے آنا پڑا۔ حیرت سے وہ ان سارے مناظر کو ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔

جب سجاول نے تھیلے کا مضبوطی سے بندھا ہوا منہ کھولا تو شیرو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ تھیلے میں موجود دو اسٹین گنیں اور کچھ راؤنڈز نکال کر سجاول نے شیرو کو تھما دیں اور تھیلے کا منہ اسی طرح مضبوطی سے باندھ کر اسے زمین میں دفن کر کے مٹی برابر کر دی۔ بطور احتیاط اس نے خاصی گھاس پھونس اور درختوں کے پتے اس پر ڈال دیئے تھے۔ اول تو یہاں تک کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن اگر کوئی آ بھی جاتا تو اسے شک کرنے کی گنجائش میسر نہ تھی۔

''شیرو!'' سجاول نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ ''ہم لوگ ایک لمبی جنگ لڑنے جا رہے ہیں۔ یہ جنگ شاید ہماری زندگی میں ختم نہ ہو، لیکن ہم اسے جب اگلی نسل کو سونپیں گے تو اپنے منطقی انجام کی طرف اس کا سفر بڑی تیزی سے شروع ہو چکا ہوگا...... میں خود کو اس لمبی لڑائی کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ یہ اسلحہ میں نے تھانے کے مال خانے سے چرایا تھا۔ ابھی میں اسے باہر نکالنا نہیں چاہتا تھا، لیکن یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ مادر وطن کے سپوت نہتے دشمن کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں اور میں اسے دبائے رکھوں۔ اسے میری طرف سے ادنیٰ تحفہ سمجھنا۔ تمہارے باپ کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم اس کی ایک گولی سے کم از کم ایک غاصب کو اس کے انجام تک پہنچاؤ۔''

''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اندرون کشمیر لوگ آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے عوام ہماری عملی مدد کر رہے ہیں۔

سرحدی صوبے سے ہمارے غیور پٹھان بھائی ہماری مدد کو آ رہے ہیں۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ یہ خطہ، یہ وادی جنت نظیر یقیناً ہماری ہوگی۔ ہم سب آزاد فضاؤں میں سانس لیں گے...... دنیا بھر کے آزادی پسند لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم...... ہم......'' شیرو کی آواز خوشی کے جذبات کا بوجھ نہ سہار سکی۔

''چلو چلیں۔'' سجاول نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ شیرو کچھ الجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ سجاول نے اس کی کسی بات پر ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی۔

''آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آیا۔'' اس نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

جواب میں سجاول آہستہ سے ہنسا۔ شیرو نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سجاول جیسے اس کی بات کا تمسخر اڑا رہا ہو۔ ''خدا کرے تمہارا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے۔'' سجاول نے اچانک سنجیدگی اختیار کر لی۔

''آپ دیکھ لیجئے، آپ دیکھیں گے۔ یہ صرف چند دن کی بات ہے...... چند دن کی۔'' فرط جذبات سے شیرو کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ایک بات کبھی نہ بھولنا برخوردار۔ دماغ کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھا کرو۔ تمہاری عمر اتنی نہیں جتنا میرا تجربہ ہے۔ تم ابھی بچے ہو۔ ابھی صرف یہ بات ذہن نشین کر لو کہ سپاہی ہمیشہ نتائج سے بے پروا ہو کر لڑتا ہے۔'' سجاول نے قریباً اسے ڈانٹ دیا۔

شیرو خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اپنا کیا اور کیسا ردعمل ظاہر کرے......؟ دونوں اب اپنی پناہ گاہ تک پہنچ گئے تھے جس کے دروازے سے کچھ دور ہٹ کر لالہ ان کا منتظر تھا۔ انہیں اس طرف آتے دیکھ کر وہ بے صبری سے بھاگتا ہوا ان تک پہنچ گیا۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ لالہ انہیں کوئی اطلاع دینے کے لیے بے چین ہے۔

''وہ اس طرف...... سامنے والی پہاڑی کی ڈھلان سے میں نے ڈوگرہ فوجیوں کو اترتے دیکھا ہے۔ وہ لوگ مغرب کی سمت چلے گئے ہیں۔'' اس نے بے چینی سے ایک طرف ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کیا۔

سجاول کو اس اطلاع نے چونکا دیا، لیکن وہ غیر معمولی ردعمل ظاہر کر کے انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''شاید وہ لوگ کوئی معمول کی مشق کر رہے ہوں گے۔ آج کل ان لوگوں پر دن رات شب خون اور اچانک حملے سے بچنے کی مشقیں کرنے کا بھوت سوار ہے۔'' اس نے لالہ کو مطمئن کرنا چاہا۔

''لیکن یہاں......؟'' شیرو نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''شیرو! تمہاری تشویش بجا ہے، لیکن اس معاملے میں تم مجھ پر اعتماد کرو۔ انشاء اللہ کسی بھی صورت حال میں مجھے تم سب سے آگے پاؤ گے۔'' پھر وہ لالہ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ لو'' اس نے ایک گن اور گولیاں لالہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم سابق فوجی بھگوڑے ہو، لیکن اسے چلانا خوب جانتے ہو گے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد تمہیں کسی خطرے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

لالہ نے گن کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ اس نے اپنی جوانی کا بمشکل ایک سال برطانوی فوج کے ایک ٹریننگ سنٹر میں گزارا تھا اور وہاں سے بھاگ نکلا تھا، پھر چھ ماہ کی قید بھگتنے کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو اس نے سب سے پہلے سو نفل شکرانے کے ادا کیے تھے۔ اسے ہمیشہ ہی فوجی نوکری سے نفرت تھی۔ وقت دوبارہ اس کے ہاتھ میں گن تھما دے گا، اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ لیکن آج نہ جانے کیوں وہ ایسی ہی کسی اسٹین گن کی کمی بڑی

شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

''شکریہ تمہارا سجاول خان۔ جب تک ان ہاتھوں میں دم ہے کس کی مجال ہے کہ وہ سدھنوں کی عزت کو میلی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کرے۔''

لالہ اپنی بھابی اور بیٹی کے ساتھ وہیں رہ گیا۔

پہلے سجاول ان سے الگ ہوا پھر شیرو۔ سجاول نے حسین خان کے نزدیکی اڈے کی طرف رہنمائی کر دی تھی۔ اسٹین گن ایک ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے وہ رات کے اندھیرے میں اس پہاڑی کمین گاہ کی طرف رواں دواں تھا جہاں اس کے ساتھی اگلے منصوبے ترتیب دے رہے تھے۔

............☆☆☆............

روانگی سے پہلے بمشکل اسے چند منٹ کی تنہائی زہراں کے ساتھ میسر آئی تھی۔ جب زہراں وہاں سے اٹھ کر قریبی ڈھلان کے ایک پتھر پر حسب عادت سامنے والے جھرنے پر نظریں جمائیں بیٹھی تھی۔

......شیرو دبے قدموں چلتا ہوا اس کے پیچھے اس طرح آن کھڑا ہوا کہ اسے شیرو کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی۔ یونہی جب کسی لاشعوری عمل کے تحت اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ جانے وہ کب سے اس کے ساتھ بڑے انہماک سے جھرنے کے پانی کو پتھروں پر سے پھسلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''آپ......!'' وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

''ہاں میں ہوں زہراں۔ اچھا ہوا تم اس طرف آ گئیں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔''

جواب میں زہراں سوائے اپنی چادر کے پلو سے انگلی مروڑنے کے اور کچھ نہ کر سکی۔

''زہراں میرے پاس کہنے کے لیے بڑی باتیں ہیں۔ جب میں تفتیش کاٹ رہا تھا اور دشمن مجھے زخموں کی اذیت برداشت کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑی میں پھینک دیا کرتا تھا تو میرے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بڑی دلیل موجود تھی کہ...... یہ سب کچھ مجھے مادر وطن کی آزادی کے لیے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

لیکن مجھے چند لمحوں کے لیے اگر پرسکون پناہ میسر آتی تھی تو صرف تمہاری یادوں میں۔ تمہارا سجیلا پیکر میرے لاشعور میں رچا ہوا تھا۔ تب میں تمہاری قربت کی حسین مہک کا سہارا ڈھونڈا کرتا تھا۔

......آج میں سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مجھے تھانے میں تمہارے ساتھ بیتنے والی قیامت کی خبر ہو جاتی تو میں شاید کبھی نہ سنبھل پاتا۔ زہراں! میں آج جس راستے پر سفر کر رہا ہوں، یہ کوئی نیا راستہ نہیں۔ میرے باپ نے انگلی پکڑ کر مجھے بچپن ہی میں ان راہوں پر دھکیل دیا تھا۔ آج جب ان کی قربانیاں رنگ لا رہی ہیں اور ساری وادی کے سپوت مادر وطن کی آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو ان کی روح کتنی خوش ہو گی۔ بخدا! میں اگر موت کی اس شاہراہ پر قدم نہ رکھتا تو شاید کبھی روز قیامت اپنے باپ سے آنکھیں نہ ملا سکتا۔ زہراں! میرے پاس وقت کم ہے۔ حالات نے ہمیں ایسے رشتے میں باندھ دیا ہے جس سے مفر نہیں اور...... اگر کبھی اس راہ آزادی میں میری شہادت کی خبر آ جائے تو ان جاہل لڑکیوں کی طرح جو زندگی بھر کنواری بیٹھی رہتی ہیں، اپنی زندگی ضائع نہ کر دینا ورنہ میری روح کو کبھی قرار نہ آئے گا۔''

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن دوسری سمت سے لالہ کے اس طرف اٹھتے قدموں کی آواز نے اسے وقت کی کم مائیگی کا احساس دلایا۔ ''خدا حافظ زہراں...... فی امان اللہ۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔

زہراں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی اور گلے میں اٹک گئی۔ اس نے چاہا کہ بڑھ کر شیرو کا گریبان تھام لے اور اس سے پوچھے کہ کس نے اسے یہ حق دیا ہے کہ وہ یوں اپنی زہراں کو رلائے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اس کی زہراں نے اس کے بغیر زندہ رہنے کا کبھی تصور ہی نہیں کیا۔ وہ تو جو کچھ بھی ہے شیرو کی وجہ سے ہے۔ شیرو ہی اس کی پہچان ہے، اس کا حوالہ ہے۔ شیرو کے بغیر تو وہ کچھ

بھی نہیں۔اس کی بانہیں آگے کی سمت پھیلی رہ گئیں۔"شیرو......!شیرو......!!" وہ آہستہ سے کراہی لیکن شیرو تو کبھی کا جا چکا تھا۔

ایک پہاڑی موڑ سے اس کا باپ اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے بیٹی! تم رو کیوں رہی ہو؟" لالہ بیٹی کے دکھ پر تڑپ اٹھا۔

زہراں خاموش رہی۔

......لالہ نے اس کے دونوں کندھے پکڑ کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا تو وہ کسی سالخوردہ درخت کے کٹے ہوئے تنے کی طرح اس کے سینے سے آ لگی۔زہراں باپ کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔جب لالہ کی نظریں پہاڑی ڈھلان سے اترتے ہوئے شیرو پر پڑیں تو اسے خود بخود ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

اس نے بیٹی کی کمر تھپک کر اسے خود سے الگ کیا۔ہٹ پگلی نہ ہو تو......!"

لالہ، بیٹی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور زہراں سامنے والی پگڈنڈی پر جاتے اس مسافر پر نظریں جمائے کھڑی تھی جو اسے جدائی کے نئے جہانوں سے آشنائی بہم پہنچا کر اس کی حد نگاہ سے دور ہی دور ہٹتا چلا جا رہا تھا۔پھر اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھوں میں تیرتی نمی بوند بوند گالوں پر پھسلنے لگی۔

"خدایا! میرے شیرو کو اپنی امان میں رکھنا......!"

موت کی شاہراہ

وہ ڈھلتے چاند کی راتیں تھیں۔

رات کے دوسرے پہر جب چاند کشمیر کی سربلند پہاڑیوں کے عقب میں ہلکورے لے رہا تھا، شیرو اپنا منہ، سر کپڑے میں چھپائے ہوئے شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں ایسا راستہ اپنایا تھا جس پر کسی فوجی یا کسی پولیس پارٹی سے اس کے ٹکراؤ کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے...... اس کے زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے، لیکن تین چار روز سے زیادہ اپاہجوں کی طرح لیٹے رہنا اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔

سجاول نے خدا جانے کہاں سے جڑی بوٹیاں لا کر اس کے زخموں پر لگائیں جنہوں نے جادو کا اثر دکھایا تھا۔ وہ دن رات میں دو مرتبہ ان لوگوں کی خبر لینے آتا اور ان سب کی خدمت میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جانے کہاں سے وہ ان کے لیے اتنا گھی اور دودھ لے آیا تھا۔

یہ سارا شہر اور اس کی گلیاں محلے شیرو کے دیکھے بھالے تھے، لیکن آج نہ جانے کیوں وہ خود کو یہاں سے گزرتے ہوئے اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے ہی گھر پر ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہو۔ چلتے چلتے اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا...... مخالف سمت سے اسے ٹارچ کی روشنی اپنی سمت لپکتی دکھائی دی۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی شیرو کے جسم میں برقی رو دوڑنے لگی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے پھرتی سے ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گیا جہاں وہ ان لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس نے گن سیدھی کر کے اس سمت اندھیرے میں نظریں گاڑھی ہوئی تھیں جس طرف سے اب بہت سے قدموں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ اس کی حس سماعت پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

اچانک وہ سہم کر رہ گیا۔ ایسے ہی قدموں کی آواز اس کے عقب سے بھی آنی شروع ہو گئی تھی۔ شاید یہاں پہنچ کر دونوں پارٹیوں نے آپس میں رابطہ قائم کرنا تھا اور سوئے اتفاق سے وہ ان دونوں پٹرول پارٹیوں کے عین درمیان میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ خاموشی سے آنے والوں کا لقمہ بن جائے یا عقب والوں کے نمودار ہونے سے پہلے ہی سامنے کی سمت اچانک فائرنگ کر کے خلاء پیدا کرے اور بھاگ جائے۔

...... اس کے سامنے پھیلا پہاڑی سلسلہ بھی اپنا دامن پھیلائے اسے سمیٹ لینے کو بالکل تیار تھا اور اس سلسلے میں یہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو میل دور گھنے جنگل میں اس کے ساتھی چھپے ہوئے تھے۔

ایک ایک لمحہ اس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ جلد ہی شیرو ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے بے بسی سے لقمہ اجل بننے کی بجائے بہادروں کی طرح موت سے ٹکرا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

...... ابھی تک سامنے سے آنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ شیرو چیتے کی سی پھرتی سے اٹھا اور جھکتے ہوئے قریباً بھاگ کر اسی ٹیلے کی نکڑ پر

پہنچ گیا جس کے پہلو سے پٹرول پارٹی کو نمودار ہونا تھا۔ ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالا۔ ابھی اس نے اسٹین گن سیدھی ہی کی تھی کہ روشنی کی ایک لکیر اس سے بمشکل دو تین گز دور رینگتی نظر آئی۔ اس کے ساتھ کسی کے اونچا اونچا بولنے کی آواز بھی سنائی دی۔

آنے والے مجاہدین کو گالیاں دے رہے تھے جنہوں نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی اور انہیں اپنے بستروں سے اٹھ کر کشمیر کی جان لیوا ٹھٹھرتی ہوئی راتوں کے حوالے کر دیا تھا...... شیرو کی انگلی ٹریگر پر جم کر رہ گئی۔ تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح اس نے قریباً جھکتے ہوئے ایڈوانس کرنے کی پوزیشن بنائی اور نظریں ادھر جما دیں۔ اس کے عقب میں آنے والی آوازیں بھی اب نمایاں ہونے لگی تھیں، پھر سب جیسے گڈمڈ ہو کر رہ گئیں۔ دو پولیس والے جنہوں نے رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں، سامنے سے نمودار ہوئے۔ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے جب اچانک ان کے قہقہوں نے موت کی چیخوں کا روپ اختیار کر لیا۔ شیرو کی اسٹین گن کی لال سرخ زبان باہر نکلی اور انہیں چاٹ گئی اس کے ساتھ ہی وہ آگے کی سمت بھاگا۔

محض پندرہ بیس قدم بھاگ کر اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھلانگ لگائی اور کندھے سے اسٹین گن لگا کر اس کا رخ مرنے والوں کے ان تین ساتھیوں کی طرف کر دیا، جنہیں اچانک پیش آمدہ صورت حال نے حیرت زدہ کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے گلے میں لٹکی رائفلوں کو اتار کر لوڈ کرتے وہ بھی شیرو کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

اچانک فائرنگ اور مرتے ہوئے سپاہیوں کی دلدوز چیخوں نے آنے والوں کو خبردار کیا۔ وہ شاید ڈوگرہ فوجیوں کا کوئی سیکشن تھا جو پٹرولنگ کرنے نکلا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لوگ جنگی حکمت عملی کے مطابق ادھر رینگنے لگے جس طرف سے انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ شیرو نے پہلے تو چاہا تھا کہ وہ رک کر مردہ سپاہیوں کی رائفلیں اٹھا لے، لیکن اسے اپنا یہ خیال فوراً بدلنا پڑا۔ یہاں ایک لمحے کا توقف بھی اس کی جان لے سکتا تھا۔ ٹیلے کی آڑ ہی میں وہ جھکتا ہوا پہاڑی سلسلے کی طرف بھاگنے لگا۔

اچانک اس کے عقب میں کسی طاقتور ٹارچ کی روشنی لپکی اور اگر وہ اپنے کسی لاشعوری عمل کے تابع ہو کر یک لخت سامنے والی گھنی جھاڑیوں میں چھلانگ نہ لگا دیتا تو ٹارچ کی روشنی کے تعاقب میں لپکنے والی درجنوں گولیوں میں سے کئی گولیاں اس کے جسم میں بے شمار روشندان بنا دیتیں۔

فائرنگ کی آواز سے اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کا مقابلہ پولیس کی ریوڑ سے ہے بچھڑی ہوئی بھیڑوں سے نہیں، ڈوگرہ فوجی دستے کے خون آشام بھیڑیوں سے ہے۔ شیرو زمین سے چپکا اپنی کہنیوں کے بل بڑی تیز رفتاری سے پہاڑی سلسلے کی طرف رینگ رہا تھا اور پھر اس نے اپنے عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لیے لوٹنیاں لگانی شروع کر دیں۔

لڑھکنیاں لگا تا اب وہ پہاڑی سلسلے میں پہنچ کر قدرے محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے زمین سے اٹھ کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے اپنی سمت یلغار کرتے ڈوگرہ فوجیوں کا جائزہ لیا اور ایک جگہ رک کر اطمینان سے ان کی سمت فائرنگ کرتے ہوئے گن کی میگزین خالی کر دی۔ دو ڈوگرہ فوجیوں کو جو کسی کارنامے کی توقع پر سیدھے اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے، شیرو نے الٹ کر گرتے اور زمین چاٹتے دیکھا اور بھاگ اٹھا۔ اس نے دوسری میگزین بھاگتے ہوئے ہی گن میں فٹ کی تھی۔



اب وہ پہاڑی سلسلے کے اندر ہی اندر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

......اپنے تعاقب میں آنے والی گولیاں اور گالیاں اسے بخوبی سنائی دے رہی تھیں، لیکن جس علاقے میں وہ پہنچ چکا تھا وہاں تو دن کے اجالے میں بھی فوج کی پوری بٹالین اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہتی۔

میجر رام سنگھ کی ظالمانہ تفتیش نے اس کے جسم سے خاصی توانائی نچوڑلی تھی اور یوں بھی بھاگتے بھاگتے اب اس کا سانس قدرے پھولنے لگا، لیکن اس نے تھکاوٹ یا کمزوری کے اس احساس کو خود پر غالب آنے کا موقع نہ دیا اور اس علاقے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں اسے اپنے ساتھیوں کی مدد ملنے کی توقع تھی۔

اصولاً تو اب اس کے تعاقب میں آنے والے فوجیوں کو لوٹ جانا چاہیے تھا کیوں کہ ان پہاڑیوں میں ایک مرتبہ گھر جانے کے بعد ان کے یہاں سے واپسی کے امکانات بہت کم رہ جاتے تھے، لیکن ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ شیرو کے تعاقب میں گولیاں چلاتے ہوئے آ رہے تھے...... فائرنگ کی آواز تو حسین خان اور اس کے ساتھیوں تک کبھی کی پہنچ رہی تھی، لیکن فائرنگ کرنے والے انہیں اب نظر آئے تھے۔ وہ لوگ اپنی پناہ گاہ سے دو تین فرلانگ کی دوری پر یہاں بیٹھے ہوئے تھے تاکہ پونچھ کی جانب سے کیے جانے والے اچانک حملے کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔ فائرنگ کی اس آواز نے انہیں چونکا دیا......!

پہلے انہیں اونچائی سے ایک سایہ اپنی سمت بھاگتا نظر آیا، پھر اس کے تعاقب میں فائرنگ کرنے والوں کے ہیولے نمایاں ہونے لگے۔ اس بات کا اندازہ تو انہیں بخوبی ہو چکا تھا کہ ایک شخص بھاگ رہا ہے اور اس کے تعاقب میں فائرنگ کی جا رہی ہے، لیکن جہاندیدہ حسین خان کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ دشمن کی کوئی چال ہو اور وہ لوگ اس طرح ''ڈرامہ'' رچا کر اچانک ان کے سروں پر پہنچ جانا چاہتے ہوں۔

''اشرف خان'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ ایک پتھر کی اوٹ میں کھڑے شرفو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ ''تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے اترو اور اس بھاگنے والے کو گھیر کر پکڑنے کی کوشش کرو۔ اگر شک گزرے یا وہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو اسے گولی مارنے میں بالکل دریغ نہ کرنا۔'' اس نے شرفو کو ہدایات دیں۔

حسین خان کی بات مکمل ہوتے ہی شرفو کے ساتھ چار اور مجاہد پہاڑی کی ڈھلان سے نیچے اتر کر ان راستوں کی طرف بڑھنے لگے جہاں وہ شیرو کو باآسانی گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

''نصیب!'' حسین خان نے اپنے ساتھی چھپے دوسرے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ''نورولی کو جنگل کی طرف روانہ کر دو تاکہ وہ تمام لوگوں کو خبردار کرے، لیکن انہیں سختی سے ہدایت کر دے کہ میرے حکم کے بغیر ایک گولی بھی فائر نہ کی جائے۔ تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے ساتھ ہی آؤ۔ ہمیں ان فوجیوں سے نمٹنا ہے۔''

نصیب اور اس کے پانچ رائفل بردار ساتھی کمانڈر حسین خان کے پیچھے پیچھے پہاڑی سلسلے میں غائب ہو گئے جبکہ نورولی تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور...... محض پندرہ بیس منٹ بعد شیرو نے اپنے چاروں اطراف پہاڑی سلسلوں سے شعلے لپکتے دیکھے۔

...... فائرنگ یک دم ہی ہوئی تھی اور چند ہی منٹ بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا...... مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ غالباً اس کے ساتھیوں نے تعاقب میں آنے والے سارے ڈوگرہ فوجیوں کو مار ڈالا تھا۔ اب وہ قدرے بے پروا ہو کر جنگل کی سمت بڑھنے لگا تھا کہ...... اچانک ایک پہاڑی موڑ مڑتے ہوئے ایک رائفل کی ٹھنڈی نال اس کی پیٹھ سے آ لگی۔

''ہینڈز اپ!'' کسی کی للکار گونجی۔

شیرو نے بڑے اطمینان سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اسے یقین تھا کہ یہ اسی کا کوئی ساتھی ہوگا۔

''اپنی گن نیچے پھینک دو اور میری طرف گھومو'' دوسرا حکم ملا۔

''شرفو! کیوں میری گن کا نقصان کرواتے ہو۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے۔'' شیرو نے اپنے دوست کی آواز پہچان لی تھی۔

''شیرو...... !'' شرفو نے مسرت سے قریباً چیختے ہوئے نعرہ لگایا اور رائفل ایک طرف رکھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس کے منہ سے شیرو کا نام سنتے ہی اس کے ساتھی بھی وہاں اکٹھے ہو گئے اور سب باری باری شیرو سے بغل گیر ہو رہے تھے۔

شرفو شدت جذبات سے دو تین مرتبہ ''شیرو! میرے یار! میرے بھائی...... !'' کہہ کر اس سے لپٹ چکا تھا اور وہ سب شیرو کو اپنے جلو میں لیے اپنی ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے...... جہاں کمانڈر حسین خان بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔

............☆☆☆............

بھارت کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد اس بات کی پکی امید تھی کہ وہ فوراً اپنی افواج کشمیر روانہ کرے گا۔ مہاراجہ پچھلے دو تین ماہ سے ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔ آج بھی جب وہ مہر سنگھ کو رخصت کر کے واپس ہوا تو اچانک بوکھلا گیا، جب اس کے اے ڈی سی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ قبائلی پٹھان بارہ مولا کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ڈوگرہ پلٹنیں ان کے لیے بھیڑوں کے ریوڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

''میرا خیال ہے ہمیں رات کے اندھیرے میں سری نگر سے نکل جانا چاہیے۔'' اس نے مہارانی سے کہا۔

دونوں اپنی آرام وہ خواب گاہ میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ مہاراجہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ مہارانی کو آلہ کار بنا کر اس کے ساتھ کیا خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا محل سازشوں کا گڑھ بن چکا تھا اور اس سازشی ٹولے کا سربراہ تھا...... راج گرو!

راج گرو کی شخصیت خاصی پراسرار تھی۔ ایک روز وہ اچانک ہی ڈوگرہ محل میں پہنچا اور رانی سے ٹکرا گیا جس کے بعد اسے رانی کے مندر کا خصوصی پروہت مقرر کر لیا گیا۔ اس بات کا علم کسی کو نہیں تھا کہ راج گرو کو کانگریس کے اس خاص طبقے کے لیڈروں کی مکمل پشت پناہی اور سازش کے ساتھ محل کی طرف روانہ کیا گیا تھا، جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا دشمن رہا تھا۔

اس طبقے کے لیڈروں کو اس بات کا یقین تو ہو چکا تھا کہ کشمیر کے مسلمان کبھی بھارت کی غلامی میں رہنا پسند نہیں کریں گے۔ یوں بھی اصولاً اور قانوناً دونوں طرح سے کشمیر پاکستان کا حصہ تھا، لیکن جیتے جی وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ راج گرو اپنی شیطانی ذہنیت سمیت ایک مذہبی رہنما کا

لبادہ اوڑھ کر ڈوگرہ محل تک پہنچ گیا تا کہ مہاراجہ کے دل و دماغ پر مہارانی کے ذریعے قابض ہو کر اس سے ہندو لیڈرشپ کے حسب خواہش احکامات جاری کروا سکے۔

روایتی ہندو گروؤں کی طرح راج گرو بھی خفیہ شیطانی قوتوں کا منبع تھا اور اس کی یہی شیطانیت اسے مہاراجہ کے زنان خانے تک لے گئی تھی۔ اس نے مہارانی کے ذہن کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا...... کانگریس ہائی کمان کے زیر ہدایت محض دو تین مہینوں میں اس نے رانی کے ذریعے کشمیر کی سیاست کو بالکل ہی نئے رخ پر ڈال دیا اور مہاراجہ سے اس کے خلاف مرضی اقدامات کروا دیئے۔

مہاراجہ ہری سنگھ کا وزیر اعظم پنڈت رام چند کاک غیر متعصب ہندو تھا اور اس کی مسلمان افسران اور لیڈروں سے خاصی بے تکلفی تھی۔ اپنی سیاسی بصیرت کے بل بوتے پر اس نے مہاراجہ کو کشمیریوں کے سامنے بھی ''غیر متعصب ڈوگرہ مہاراجہ'' کے روپ میں پیش کیا ہوا تھا اور کئی سیاسی طوفان اپنے تدبر سے روک رکھے تھے۔

مسلمان افسران سے پنڈت کاک کی دوستی متعصب، ہندو لیڈروں کی نظروں میں، جو کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ بنانا چاہتے تھے، بہت کھٹکتی تھی۔ انہوں نے پہلے بھی وزیر اعظم پر در پردہ پاکستان کی حمایت کرنے کا الزام عائد کیا، لیکن دال گلتی نظر نہ آئی تو رانی کے ذریعہ مہاراجہ ہری سنگھ کے کان بھرے جانے لگے۔

راج گرو نے پہلی دو تین ملاقاتوں ہی میں رانی کو اپنا ''گرویدہ'' کر لیا تھا اور وہ دن کا زیادہ حصہ گرو جی کے چرنوں میں ہی گزارا کرتی تھی۔ ایک روز ریاست کے عوام پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ وزیر اعظم کشمیر رام چند کاک جو مہاراجہ کے دست راست کہلاتے تھے، وزارت سے سبکدوش کر دیئے گئے ہیں۔ یہ صدمہ ہی بوڑھے اور رحمدل پنڈت کاک کے لیے جان لیوا تھا کہ اسے مہاراجہ کے حکم پر ''پاکستان کی در پردہ حمایت'' کے الزام میں گرفتار کروا کر مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔

اب راستے کا پتھر ہٹ چکا تھا اور راج گرو کو کھل کھیلنے کے بھرپور مواقع حاصل تھے۔ اس نے اپنی چیلی کو خوب خوب استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے راجہ کے گرد سے اس کے پرانے اور نمک خوار ملازمین کو ہٹا کر مسلم دشمن اہلکاروں کا نیا حلقہ قائم کروا دیا گیا۔

یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے اسے یہی مشورہ دیتے تھے کہ اگر اس کی نجات کی کوئی صورت ہے تو صرف بھارت سے الحاق میں۔ اسی دباؤ کے تحت مہاراجہ نے بھارت سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ گو وہ بعد میں بہت پچھتایا اور اپنے اس فعل کو ''پاگل پن'' سے تشبیہہ دی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مہاراجہ کو راج گرو نے یقین دلایا تھا کہ اس کی گدی قائم رہے گی اور کشمیر ایک علیحدہ اور آزاد ملک کی صورت میں اس کے زیر نگیں رہے گا۔ اب پروگرام کے دوسرے حصے پر عمل شروع ہوا...... وہ تھا کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کا داخلہ، تا کہ وقت آنے پر وہ بزور اپنا فیصلہ منوا سکیں۔ ونگ کمانڈر مہر سنگھ کی آمد اسی منصوبے کا حصہ تھی اور وہ کامیاب و کامران لوٹا تھا۔

مہاراجہ کے ذہن پر پاکستانی حملہ آور اس بری طرح سے چھائے تھے کہ وہ ذہنی مریض بن کر رہ گیا۔ اس روز جب اسے اے ڈی سی کے ذریعے قبائلی پٹھانوں کے سر پر پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ بالکل ہی دل چھوڑ گیا۔

''مہاراج جی!'' رانی نے بڑے ناز و ادا سے اٹھلا کر اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک روز ہی کی تو بات ہے، گرو جی کہہ رہے تھے کہ 'شبھ گھڑی' آیا ہی چاہتی ہے۔ بھارتی فوج کو ان کے حساب کے مطابق پرسوں تک پہنچ جانا چاہیے۔''

''جہنم میں گیا تمہارا گرو۔'' مہاراجہ نے اسے جھٹک کر خود سے الگ کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ مہارانی نے پہلے تو آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا، لیکن اس کی آنکھوں میں ناچتے شعلے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

وہ رات مہاراجہ نے دہشت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے تحت شراب نوشی اور چہل قدمی کی نذر کر دی۔ علی الصبح جب اسے علم ہوا کہ سرینگر سے صرف 35 میل کے فاصلے پر واقع بارہ مولا بھی قبائلی پٹھانوں نے فتح کر لیا ہے اور اب وہ لوگ سری نگر کی طرف تیزی سے ایڈوانس کر رہے ہیں تو اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے فوراً اے ڈی سی کو طلب کیا۔

''جی سرکار!'' اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔

''فوراً سفر کی تیاری کرو۔ ہم جموں جانا چاہتے ہیں۔'' خود مہاراجہ کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

''لیکن مائی باپ......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''شٹ اپ! حکم کی فوری تعمیل ہو۔'' مہاراجہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جو حکم مہاراج!'' اے ڈی سی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

مہاراجہ کے کمرہ خاص سے وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ اس کا رخ راج گرو کے خصوصی آشرم کی طرف تھا۔ مندر سے پجاریوں کے پاٹھ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بھجن کتھا اپنے عروج پر تھی، لیکن اے ڈی سی جانتا تھا کہ راج گرو ابھی بستر استراحت پر موجود ہوگا۔

گرو جی کے کمرے کے باہر کوئی پہرے دار بھی خلاف توقع موجود نہیں تھا۔ مہاراج کا یہ فیصلہ ایک بم کی طرح اے ڈی سی کے ذہن میں پھٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس لیے وہ سیدھا یہیں چلا آیا تھا۔ نہ جانے بغیر اطلاع کے آمد کا گرو جی کتنا برا منائیں؟ اس نے سوچا اور ٹھٹکا، لیکن معاملے کی سنگین نوعیت نے اسے ہمت دلائی اور اے ڈی سی نے اچانک بڑھ کر دروازے پر ہاتھ مارا جو اندر سے کھلا ہونے کی وجہ سے کھلتا چلا گیا۔ سامنے راج گرو اپنے چوبی تخت پر نرم اور دبیز ریشم کے گدوں پر ڈھیر ہوا پڑا تھا اور مہاراجہ کی خصوصی باندی کوشلیا اس سے لپٹی ''مکتی پراپت'' کر رہی تھی۔

''ما...........ما............مہاراج۔'' اس کی زبان ہکلانے لگی۔

''شانت بالکیے۔'' اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ اونچا کر کے سائبان کی طرح یوں بلند کیا جیسے آنے والے نے کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔

''تم جاؤ بالکیے۔'' اس نے سہمی ہوئی کوشلیا کی کمر پر تھپکی دی۔

کوشلیا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے الٹے قدموں چلتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ کر مہاراج کو ''سیس نوائے'' اور باہر نکل گئی۔

''کہو!'' راج گرو نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں خوفزدہ اے ڈی سی کے چہرے پر جما دیں۔

اے ڈی سی نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ باندھ کر اسے اس نئی ''بپتا'' سے آگاہ کیا۔ راج گرو اس کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ مراقبے کی کیفیت سے بیدار ہو کر اے ڈی سی سے مخاطب ہوا۔ ''ٹھیک ہے اس کے حکم پر عمل کرو۔ ہری سنگھ کی ہر طرح سے رکھشا کرنا۔ اپنے پندرہ آدمی ساتھ لے لو۔ خبردار ایک بھی دربار کا آدمی نہ ہو۔ مہاراج کی جان بہت قیمتی ہے۔ اسے ہر صورت ابھی زندہ رہنا چاہیے۔ ہاں اگر وہ پاکستان کی طرف فرار ہونے یا حملہ آوروں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً جان سے مار دینا۔''

''آوش ہے۔ (ضرور ایسا ہی ہوگا) گرو جی۔'' اے ڈی سی نے ہاتھ باندھے اور الٹے پاؤں چلتا کوشلیا کی طرف باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مسلح محافظوں کی رہنمائی میں مہاراجہ کا قافلہ جموں کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی کار میں دو مسلح باڈی گارڈ ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ لیے بیٹھے تھے۔ کار کے آگے ایک ٹرک ڈوگرہ فوجیوں کا بھرا ہوا چل رہا تھا جس میں لگے طاقتور وائرلیس سیٹ کے ذریعے راستے کی پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔

دو سو میل کا فاصلہ بخیر و عافیت اور راستے میں دم لیے بغیر مسلسل طے کر کے مہاراجہ جموں جا پہنچا۔ اس کے ذہن میں کیا ہے؟ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس بات کا علم بھی کسی کو نہ ہو سکا۔

مہاراجہ نے سختی سے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ اس کی آمد کو بالکل خفیہ رکھا جائے۔ اے ڈی سی کو اس نے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ باندھے مہاراجہ کے سامنے کھڑا تھا۔

''اگر کل صبح تک وی پی مینن بھارت سے فوجی مدد لے کر نہ پہنچے تو تم مجھے نیند میں گولی مار دینا۔'' مہاراجہ نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

اے ڈی سی نے کچھ کہنا چاہا، لیکن حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ بڑا عجیب اور وحشت ناک فیصلہ کیا تھا اس کے مہاراج نے۔

''اب کیا ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے ہو۔ جاؤ، شب بخیر!'' مہاراجہ نے اسے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

گردش حالات نے جب کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجے کو اتنا بے بس اور بد دل کر دیا تھا کہ وہ مجاہدین کی مسلسل اور منضبط کامیابیوں کے ہاتھوں عاجز اور ذہنی مریض بن کر اس حالت کو پہنچ چکا تھا کہ اپنے اے ڈی سی کو خود کو گولی مارنے کا حکم دے رہا تھا۔ عین ان لمحات میں وقت کا دھارا بدلا۔ کاتب تقدیر کا قلم ایک نئی نہج اپنا گیا۔ اس کے ساتھ ہی برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا سیاہ باب رقم ہونے لگا جس نے بعد میں اس خطہ زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کی بد بختی پر صاد کرنا تھا۔

قبائلیوں کے حملے کے تیسرے ہی روز بھارتی ہائی کمان ایک اہم فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ کانگرسی لیڈر اس زعم میں مبتلا تھے کہ یہ نوزائیدہ مملکت

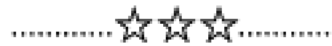
جس پر یک دم لاکھوں یتیم، بیواؤں اور لٹے پٹے انسانوں کا بوجھ آ پڑا ہے، جس کا خزانہ بالکل خالی ہے، جس کے حصے میں آنے والی فوج سمندر کے پار یا برصغیر کے دور دراز کونوں میں پاکستان سے ہزاروں میل دور کیمپوں میں بے دست و پا پڑی ہوئی ہے، محض چند ہفتوں میں معاشی موت مر جائے گی۔

خود پاکستان کا وجود سلامت رکھنا ہی اس مملکت کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا، لیکن کانگریسی لیڈر شپ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو گیا، جب انہوں نے دیکھا کہ کمزور جسم، لیکن فولاد ایسے مضبوط ارادوں کا مالک قائداعظمؒ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے کہہ رہا ہے کہ کشمیر، دکن اور حیدر آباد ہمارے ہیں اور وہ پاکستان کی سمت اٹھنے والے ہاتھوں کو کاٹ کر پھینک دے گا۔

پاکستانی افواج کا انگریز کمانڈر انچیف ان کا پروردہ تھا۔ اس کے جیتے جی اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج کشمیر میں داخل ہو، لیکن جنرل طارق کی کمان میں اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کو آنے والے پٹھان اور کشمیری مجاہدین جس تیزی سے کشمیر کے دارالحکومت کی طرف بڑھ رہے تھے، اس کا کبھی کسی کو گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

قبائلی سرفروشوں کی یلغار کے تیسرے ہی روز بھارتی حکمرانوں نے اپنے چیف آف اسٹاف کو حکم دیا کہ وہ کشمیر میں حملے کا پلان تیار کرے۔

جب مہاراجہ ہری سنگھ حالات سے تنگ آ کر خودکشی کے منصوبے بنا رہا تھا تو ساؤتھ انڈیا کے رہنے والے بریگیڈیئر عثمان کی قیادت میں ایک سو فوج بردار طیارے بھارتی فوجیوں کو سری نگر کی طرف اڑا لے جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ گورداسپور، جالندھر اور پٹھان کوٹ کی چھاؤنیوں میں موجود تمام بھارتی فوجوں کو جموں کی طرف بڑھنے اور اس پر فوراً قبضہ کر لینے کے احکامات جاری ہو رہے تھے اور تاریخ کا دھارا بڑی تیزی سے اپنا رخ بدل رہا تھا۔



میجر رام سنگھ نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، لیکن پے در پے ناکامیوں نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ پچھلے مہینے جو تین اسٹین گنیں چوری ہوئی تھیں وہ مجاہدین آزادی کے ہاتھ لگ چکی ہیں۔

لاشیں اس کے سامنے رکھی تھیں اور ان کی موت واقعی اسٹین گن کی فائرنگ سے ہی ہوئی تھی۔ دونوں پٹرول پارٹیوں میں سے صرف ایک خوش قسمت اپنی بربادی کی کہانی سنانے کے لیے زندہ اس تک پہنچ پایا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے اپنے افسر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پہاڑی سلسلے میں چھاپہ مار کا تعاقب کرنے کی بجائے چھپ جانے ہی میں عافیت جانی تھی۔

''......ایک حملہ آور پولیس کی پوری پٹرول پارٹی کا صفایا کر گیا اور...... اس کے تعاقب میں جانے والوں کو اس کے پہاڑوں میں چھپے ساتھیوں نے لقمہء اجل بنا دیا'' میجر رام سنگھ کا ذہن صرف ایک ہی سمت راہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے سوچا ''ناممکن ہے کہ وہ لوگ اکیلے ہوں۔ ضرور ان کی پشت پناہی پاکستانی فوج کر رہی ہے۔'' قبائلیوں کی مسلسل پیش قدمی کی خبروں نے الگ اس کا برا حال کر رکھا تھا۔ لالہ مہاویر پرشاد اس کے لیے بڑے کام کا آدمی تھا۔ اس کا سارا انتظام جاسوسی لالہ مہاویر پرشاد ہی کے سہارے چل رہا تھا اور اسی کی کوششوں سے میجر رام سنگھ کو مقامی غدار میسر آئے تھے۔

لالہ مہاویر کے اغواء اور موت کے بعد سے مجاہدین آزادی کی ایسی دہشت ان مقامی غداروں پر بیٹھی تھی کہ وہ اب تھانے میں آنے سے بھی خوفزدہ رہتے تھے۔ زیادہ تعداد ان غداروں کی تھی جو قبائلیوں کے آزاد کردہ علاقے کا رخ کر رہے تھے یا پھر سری نگر اور جموں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میجر رام سنگھ کو ایک خوف اندر ہی اندر سے کھا رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگر اس نے مجاہدین آزادی کی دی ہوئی وارننگ کو نظر انداز کر دیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں۔

وہ تو شیرو کے فرار اور لالہ مہاویر پرشاد کی لاش ملنے کے فوراً بعد ہی یہاں سے کسی اور جگہ تبادلہ کروا کے جا چکا ہوتا، لیکن اس کے لاشعور میں لگی انتقام کی آگ اب اس کے شعور کو بھی جھلسانے لگی تھی۔ وہ صرف انتقام کے لیے یہاں رکا ہوا تھا۔ زہراں کے اغواء، شیرو کے فرار اور لالہ مہاویر کی موت کا انتقام......!

اس سے پہلے اس نے کبھی اپنے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات نہیں کیے تھے، لیکن اب وہ اس سلسلے میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا، تین چار چاق و چوبند جوان حفاظت کے لیے اس کے ہمراہ ہوتے۔ ایک بات کا تو اسے پختہ یقین تھا کہ اس تھانے کے اندر بھی مجاہدین کا کوئی نہ کوئی ہمدرد ضرور موجود ہے...... اسی کی مدد سے انہوں نے زہراں کو اغواء کیا اور شیرو کو فرار کروا دیا ہے۔ اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ شیرو بغیر کسی "اندرونی امداد" کے وہاں سے فرار ہو سکتا۔

میجر رام سنگھ کا پونچھ میں اب صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا کہ وہ آستین کے سانپ کو ڈھونڈے اور اسے اذیتیں دے دے کر اپنے ہاتھوں مار ڈالے۔ یہی عزم تھا جس نے میجر رام سنگھ کا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ اس نے تمام معاملے پر براہ راست نظر رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور بجائے کسی اور کو شامل کرنے کے اکیلے ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس نے باری باری تمام پولیس ملازمین کو جن میں ہندو سکھ اور ڈوگرے بھی شامل تھے، علیحدہ علیحدہ اپنے پاس بلا کر ان سے گفتگو کی تھی۔ اس نے کمال مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ اسے کسی پر کسی قسم کا شک ہے...... اور اپنی طویل تفتیش کے بعد اس کے ذہن نے جن مشتبہ آدمی کی نشاندہی کی تھی، ان میں سے ایک سجاول بھی تھا۔ میجر رام سنگھ نے انتہائی معتمد اور خصوصی آدمیوں کے ذریعے ان لوگوں کے معمولات چیک کیے تھے۔ خود بھی مختلف بھیس بدل کر باری باری ان لوگوں کی نگرانی کی تھی...... جب سجاول کے متعلق اسے خبر ملی کہ اس کے بچے تو تقسیم ملک کے اعلان سے پہلے ہی پاکستان پہنچ چکے ہیں تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"جناب کیا عرض کروں!" جب میجر رام سنگھ نے کمال مکاری سے اپنے چہرے کے تاثرات بدل کر بڑے معصوم سے لہجے میں سجاول سے اس کے بیوی بچوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بلا کسی جھجک کے ہنستے ہوئے کہا۔ "میری گھر والی کا دنیا میں اگر کہیں دل لگتا ہے تو صرف اپنی ماں کے گھر۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے سرکار کہ آخر میری تنخواہ میں ہمارا سب کا گزارا کیسے ممکن ہے؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" رام سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ میں تو مخدوش حالات کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔ ایک لحاظ سے تو تم نے اچھا ہی کیا کیونکہ سرکاری ملازمین کو تو یہ لوگ معاف کرتے ہی نہیں۔ ذرا امن ہو جائے تو ان کو لے آنا۔"

''ٹھیک ہے سرکار۔'' سجاول نے بڑے انکسار کا مظاہرہ کیا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میجر رام سنگھ کو اس پر کچھ شک ہو گیا ہے۔ شام کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے جب وہ بارک میں پہنچا تو انسپکٹر میر نے اسے خوشخبری سنائی کہ آج اس کا تھانے میں رات گزارنا ضروری نہیں۔ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر بھی جا سکتا ہے۔'' پچھلے آٹھ دس روز سے ان لوگوں کو انتہائی مخدوش حالات کے پیش نظر ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی تھانے میں رہنے کا پابند کر دیا گیا تھا کیونکہ کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی پیش آسکتی تھی۔

اکثر انہیں آدھی رات کو سوتے سے اٹھا کر ''ایمرجنسی ڈیوٹی'' پر طلب کر لیا جاتا تھا۔ آج جب انسپکٹر میر نے اسے رات کی چھٹی کا مژدہ سنایا تو وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا جس کی شکل اس نے پچھلے تین چار روز سے نہیں دیکھی تھی۔ ان چار پانچ دنوں میں گو کہ وہ رات کو تھانے میں سوتا رہا تھا، لیکن اس نے اپنے مہمانوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ ہر شام یا دن کے کسی بھی حصے میں کسی نہ کسی بہانے ان تک پہنچ جاتا، لیکن یہ ملاقات انتہائی مختصر ہوتی تھی۔

سجاول ضروریات زندگی انہیں تھماتا، دو چار فقرے حوصلہ قائم رکھنے کو کہتا، مجاہدین اور قبائلی پٹھانوں کی سرفروشانہ یلغار کا ذکر کرتا اور رخصت ہو جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ لالہ نے اسے کہا بھی کہ مجھے شہر تک ہو آنے دو، بھلے رات کے اندھیرے ہی میں سہی، لیکن سجاول نے سختی سے روک دیا۔ اس نے لالہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے کبھی بھولے سے بھی اس کمین گاہ سے باہر قدم رکھا تو اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے گا۔

............☆☆☆............

تھانے سے باہر نکلتے ہوئے آج اچانک ہی اس نے گردو پیش کا جائزہ لیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ فوجی کنوائے والے میدان سے پہلے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تھا، شاید اسے کوئی بات یاد آ گئی یا اپنے کسی لاشعوری فعل کا محتاج ہو کر اس نے یہ عمل دہرایا تو فوجی کنوائے کے خیموں کے عقب سے سپاہی منوہر لال کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دی جو اسے دیکھتے ہی دوبارہ غائب ہو گیا۔ سجاول ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے لاشعور میں دبے خدشات انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگے۔ ''رام سنگھ کے پاس اس کی طلبی......!'' وہ چونک پڑا۔

......اگرچہ اکیلے اسی کو طلب نہیں کیا گیا تھا، لیکن منوہر لال جیسے ''کارخاص'' کے آدمی کو اس طرح چھپ کر پیچھے آتا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے اپنے میجر رام سنگھ کے نزدیک مشتبہ ہونے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ آخر رام سنگھ نے مختلف انداز سے بات بدل بدل کر اس کے بچوں کے متعلق کیوں دریافت کیا تھا؟ اب اسے سارے معاملے کی سمجھ آ گئی تھی۔

اس بات کا تو اسے پہلے ہی روز سے اندازہ تھا کہ رام سنگھ کا ذہن کبھی نہ کبھی اس طرف ضرور جائے گا کہ کوئی نہ کوئی ضرور اس تھانے میں مجاہدین کا ''خاص آدمی'' موجود ہے اور اسی وجہ سے زہراں اور شیرو اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، لیکن اس سلسلے میں وہ بھی مشتبہ ٹھہرے گا...... یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا اور چپ چاپ نارمل رفتار سے چلتا رہا۔ اس دوران شہر میں مختلف گلیوں کے موڑ مڑتے ہوئے اس نے دو تین مرتبہ کن انکھیوں سے منوہر لال کو اپنا تعاقب کرتے دیکھ لیا تھا۔ گو کہ منوہر لال نے خود کو چھپانے کی بہت کوشش کی تھی پر وہ سجاول کی عقابی

نظروں سے محفوظ نہ رہ سکا۔

سجاول حسب سابق راستے میں مختلف ملنے جلنے والوں سے گپ شپ لگاتا اپنے گھر پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور دروازے کی کنڈی لگا کر کوٹھے پر چلا گیا۔ اپنے مکان کی چھت سے اس نے چھپ کر منوہر لال کو گلی کی نکڑ پر بنے وسنت راؤ کے مکان میں داخل ہوتے دیکھا۔ وسنت راؤ کے متعلق وہ کبھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہا تھا۔ لالہ مہاویر کا تو وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا اور ایسے شخص کے متعلق وہ سوائے اس کے اور کیا رائے قائم کرسکتا تھا کہ لالہ مہاویر کے مرنے کے بعد وہی اس کا جانشین ہوسکتا تھا؟ اس نے تھانے میں روانگی کے وقت یہی ارادہ کیا تھا کہ وہ گھر سے نکل کر سیدھا اپنے مہمانوں کے پاس پہنچے گا، لیکن تازہ صورتحال میں اس نے اپنا منصوبہ تبدیل کردیا۔ اس کا ذہن اب کسی اور ہی لائن پر کام کرنے لگا تھا۔

قہوے کا ایک کپ پی کر اس نے بیڑی سلگائی۔ وہ تمبا کو نوش نہیں تھا، لیکن کبھی کبھی خصوصاً ایسے لمحات میں جن سے وہ دو چار ہو گیا تھا، بیڑی یا سگریٹ کا سہارا لیا کرتا تھا۔ سجاول نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے بیڑے کے خالی بنڈل میں تروڑ مروڑ کر اس طرح جیب میں ڈال لیا کہ دور سے دیکھنے پر وہ بیڑی کا خالی بنڈل ہی نظر آتا تھا۔

جیسے ہی شام کے ڈوبتے اجالوں پر رات کی سیاہیوں نے غلبہ پانا شروع کیا۔ وہ دوبارہ کوٹھے پر چلا گیا۔ اس مرتبہ اس نے وسنت راؤ کے مکان کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے مکان کے پچھواڑے والی گلی میں جھانکنے پر اکتفا کیا اور مطمئن ہو کر نیچے اتر آیا۔ اپنے کمرے میں جلتی لالٹین کی لو اس نے اندازے سے بڑھادی تھی اور خود وہ دیوار تک پہنچ گیا جسے پھلانگ کر اس نے پچھواڑے والی گلی میں اترنا تھا۔ گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دور دور تک کوئی لیمپ بھی روشن نظر نہیں آرہا تھا۔

ایک پراسرار سا سناٹا...... جس میں خوف کا تاثر غالب تھا، سارے پونچھ کو اپنے حصار میں جکڑے ہوئے تھا۔

کشمیر کی سربلند پہاڑیاں گھور اندھیروں میں سینہ تانے اپنے جیالے سپوتوں کی عظمت و سربلندی پر صاد کررہی تھیں۔ 84 ہزار مربع میل میں پھیلی وادی جنت نظیر نے بڑی دیر بعد یہ مناظر دیکھے تھے۔ جانے کب سے اس کی لہلہاتی ہریالیاں اس نجات دہندہ کی راہ دیکھ رہی تھیں جو آئے اور چند انسان نما درندوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے لاکھوں انسانوں کو اس بے رحمانہ غلامی سے نجات دلادے۔

سجاول نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دو تین مرتبہ گہری نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا، پھر مطمئن ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس نے راستہ تو خاصا لمبا اور پیچیدہ اختیار کیا تھا، لیکن محفوظ۔ سارے راستے اس کی مڈبھیڑ کسی بھی گشتی پارٹی سے نہیں ہوئی تھی۔ شہر کے باہر ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے ایک درخت کے ساتھ رکھے دو بھاری پتھروں میں سے ایک کو خاصا زور لگا کر اپنی جگہ سے ہٹایا اور اپنی جیب سے بیڑی کا وہ بنڈل نکال کر دوبارہ اس پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس عمل میں اس کا خاصا زور صرف ہو گیا۔ کشمیر کی ٹھنڈی اور یخ بستہ رات میں بھی اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اپنا کام مکمل کرکے اس نے ناقدانہ نظروں سے ماحول کو ٹٹولا اور مطمئن ہو کر واپس پلٹا۔ واپسی کا سفر اس نے کسی اور راستے سے طے کیا تھا۔

قریباً دو گھنٹے گھر سے غائب رہنے کے بعد وہ دوبارہ پچھواڑے والی دیوار پھاند کر اندر آگیا اور گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے

انتہائی باریک بین نظروں سے یہ جانچنے کی کوشش کی کہ اس کی غیر موجودگی میں تو کوئی اندر نہیں آیا؟ بظاہر تو ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ لالٹین کی روشنی اس نے گل کر دی تھی۔

صبح تک سجاول بے فکری کی نیند سوتا رہا اور صبح طلوع ہونے پر وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔

منوہر لال کی رپورٹ نے میجر رام سنگھ کو شپٹا کر رکھ دیا۔ اس نے بھی سجاول کے ''غیر مشتبہ'' ہونے کی تصدیق کر دی تھی، لیکن نہ جانے رام سنگھ کیوں اس کی بات پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے بجائے منوہر لال کی بات سے مطمئن ہونے کے خود سجاول کو چیک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

27/اکتوبر 1947ء:

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز دن کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ اس روز دو تین ایسے اچانک اور بھرپور فیصلے اور اقدامات ہوئے جو برصغیر خصوصاً پاکستانی کے عوام کے لیے کسی دھماکے سے کم ہرگز نہیں تھے۔

مہاراجہ کشمیر جس نے بزعم خویش خود کو کشمیری عوام کی قسمت کا ''مختار کل'' جاننا شروع کر دیا تھا اور جس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بھارت سے الحاق کی تحریر لکھ کر اپنی دانست میں اپنے لرزہ براندام سنگھاسن کو منہدم ہونے سے محفوظ کر لیا تھا، لیکن اس کے فیصلے کو کشمیر کے لاکھوں شہریوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے قیام پاکستان کا اعلان ہوتے ہی مہاراجہ کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اپنی نفرت کا کھلم کھلا اظہار تو کبھی کا کر دیا تھا، لیکن وہ خوش فہمی یا غلط فہمی جس کا شکار مہاراجہ ہری سنگھ ڈوگرہ ہو چکا تھا، اب تک جوں کی توں قائم تھی۔ جب ریاست میں اس کے اس فیصلے سے نفرت کا اظہار کرنے کیلئے عوام نے آواز اٹھائی تو ڈوگرہ محل کی بنیادیں لرزنے لگیں۔

مہاراجہ ہری سنگھ کو شدت سے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ راج گرو کی مدد سے کی جانے والی سازش اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ وہ پچھتایا ضرور تھا، لیکن اب وہ پچھتاوا بے معنی تھا کیونکہ 27/اکتوبر کی صبح اپنے جلو میں 330 فوجیوں کا ایک لشکر بھی لے کر آ رہی تھی جو فوج بردار طیاروں کے ذریعے سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتر کر مورچے سنبھال چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔

اسی روز سردار ابراہیم خان کی زیر قیادت کشمیر کے آزاد کرائے گئے علاقوں میں نئی حکومت کا قیام عمل میں آ گیا، جس کے ساتھ ہی ہندوستان کی طرح کشمیر بھی دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا۔

اسی روز پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں ﷫ لاہور میں اکابرین ملت کا ایک نہایت اہم اجلاس اس ضمن میں طلب کیا کہ اب اس نئی اور سنگین پیدا شدہ صورتحال سے کیسے نمٹا جائے۔ دیگر بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری نمائندوں کے علاوہ اس اجلاس میں جنرل طارق نے خصوصی شرکت کی۔ کشمیری مسلمانوں کو جبر و استبداد کے نوکیلے پنجوں سے رہائی دلانے والے سرفروشوں کے کمانڈر نے حکومت کو واضح لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اب عزت سے زندہ رہنے اور کشمیر کو بھارتی مسلح افواج کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ ہے جموں پر قبضہ۔

جموں پر قبضہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم ایک انتہائی خطرناک اور زہریلے سانپ کو سر اٹھانے سے پہلے کچل کر رکھ دیں۔ کشمیر میں پنجاب سے داخلے کی اس واحد گزرگاہ پر بھارتی فوج کا اجتماع ہونا تھا اور یہاں سے اس نے شمال کی طرف بڑھنا اور جنگ کو طول دینے کے بعد مغرب کی

سمت اختیار کرنی تھی۔اس مقصد کے لئے نوشہرہ والی سڑک کو استعمال کرنا تھا اور اس سے آگے نکل کر اس لشکر کو راجوڑی اور پونچھ پر قابض ہونا تھا۔ اس وقت تک عملاً ان علاقوں پر مجاہدین آزادی کا کنٹرول تھا۔اگر پاکستان سے کھلی جنگ بھی چھڑ جاتی تو جموں کا فوجی ہوائی اڈہ پاکستان کے نزدیکی شہر سیالکوٹ کے لئے سنگین خطرہ بنا رہتا۔سب سے بڑا نقصان جموں پر قبضہ یا حملہ کرنے کی صورت میں یہ پہنچتا کہ مجاہدین آزادی کا عقب بالکل غیر محفوظ ہو جاتا اور ان کی سرگرمیاں زبردست خطرے میں پڑ جاتیں۔

جموں پر حملہ کرنے کیلئے جنرل طارق نے فوجی امداد طلب نہیں کی تھی۔انہوں نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ قبائلیوں کی صرف ایک ہزار نفری کو اس طرف سے حملہ کرنے کی اجازت دیدے، لیکن ان کا یہ منصوبہ اور خواب ادھورا رہا۔''سیاسی بازی گروں'' نے فوراً اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ اس طرح بھارت اور پاکستان کے درمیان کھلی جنگ چھڑ جائے گی اور بھارت کو پاکستان پر حملہ کرنے کا بہانہ میسر آجائے گا۔

حالات اور تاریخ نے تب بھی اور آج بھی اس سوچ کو لغو ثابت کر دیا ہے۔اس وقت قبائلی پٹھان (جن کے متعلق بھارتی حکومت کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ پاکستان کے شہری نہیں ہیں) میر پور، پونچھ، کوٹلی، جھانگڑ، نوشہرہ اور بھمبھر پر کامیاب بلغار کر رہے تھے اور بھارتی حکومت کے پاس، اگر اس نے حملہ کرنا ہی تھا تو یہ بڑے معقول بہانے تھے۔

جنرل طارق نے اس خیال کو بالکل غلط بتایا اور ان ''سیاسی بازی گروں'' کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جموں پر قبائلی حملے کی صورت میں مقامی آبادی خوفزدہ ہو کر بھارت کا رخ کرے گی۔اس طرح وہ واحد راستہ بھگدڑ کی وجہ سے بند ہو جائے گا اور قبائلی ایک مرتبہ جموں کے پہاڑی سلسلے میں گھس جائیں تو بھارتی فوج کو کبھی راجوڑی اور پونچھ کی طرف بڑھنے کی ہمت ہی نہ ہوگی۔

جنرل طارق کی اس تجویز کو جس خطرے کے پیش نظر رد کیا گیا تھا، حالات نے اسے جلد ہی باطل ثابت کر دیا کیونکہ حکومت کی اجازت نہ دینے کے باوجود بھی کچھ عرصہ بعد قبائلیوں نے جموں پر خود سے حملہ کر دیا، لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔اس کے بعد پاکستان کی باقاعدہ فوج کی جنگ بھی کشمیر کے مختلف محاذوں پر بھارتی فوج سے ہوئی، لیکن بھارت نے پاکستان پر کھلا حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

جموں ایک سلگتا ہوا سوال بن کر کشمیر کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔

جنرل طارق نے جو آدمی اس طرف روانہ کیے تھے وہ ابتدائی دنوں ہی میں رائفلیں نہ ملنے کی وجہ سے وہاں سے واپس آچکے تھے اور اس انتہائی اہم محاذ کا خالی رہ جانا بڑا المیہ تھا۔

............☆☆☆............

کمانڈر حسین خان اور شرفو دونوں بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔شیرو نے انہیں ساری کہانی سنادی تھی۔

...... پہلے تو ان کا یہی خیال تھا کہ شیرو خود فرار ہوا ہے، لیکن یہ ان کا اجنبی ہمدرد کون تھا؟ جس کے متعلق شیرو کچھ بتانے کو بھی تیار نہ تھا۔'' وہ جو کوئی بھی ہے، ہم میں سے ہے۔ہمارے ہی راستے کا مسافر اور ہماری اگر کوئی پہچان ہے تو وہ کشمیری حریت پسند ہے۔اس کا نام کیا ہے؟ اگر تم بتاتے بھی تو میرے لیے یہ ضروری بات نہیں تھی۔شیرو! اگر ایسی طاقتور اور منظم تنظیم کا قیام عمل میں آچکا ہے جس نے کشمیر کو آزاد کروانے کے لیے اندر

ہی اندر اور نہایت خفیہ طریقے سے تیاری مکمل کر لی ہے تو یہ میری، تمہاری اور ہم سب کی خوش بختی کی علامت ہے۔ آج ہم سب بکھرے ہوئے ہیں۔ ٹکڑیوں میں بٹ کر لڑ رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ہم سب متحد ہو کر استعماریت سے ٹکرلیں گے اور اپنی دھرتی کو غاصبوں کے شکنجے سے نکالیں گے۔'' کمانڈر حسین خان نے طویل سانس لے کر اپنی بات مکمل کی۔

شرفو نے البتہ کچھ نہ کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے دوستوں پر اس خوشی کی کیفیت کا اظہار کیسے کرے جو اسے اچانک شیرو کے مل جانے پر نصیب ہوئی تھی۔

وہ رات کمانڈر حسین خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔ انہوں نے نورولی کو تین چار روز پہلے جموں کی طرف روانہ کیا تھا تا کہ وہاں کے حالات سے انہیں باخبر کر سکے۔

چند روز پہلے ہی جموں کی طرف سے تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔ پٹھانکوٹ چھاؤنی میں بھارتی فوجیں اکٹھی ہو رہی تھیں جو جموں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔

......پونچھ کے جو فوجی چھٹی پر یا ملک کی آزادی کے بعد کشمیر اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، اپنے ساتھ بھارتی فوجوں سے متعلق بڑی اہم خبریں لائے تھے۔ کمانڈر حسین خان تک یہ خبر بھی پہنچ چکی تھی کہ پاکستان نے جموں کے محاذ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

اور اب جب سری نگر میں بھی بھارتی فوج اترنے لگی تھی اور جموں کے راستے بھی وہ لوگ سارے کشمیر میں پھیل رہے تھے تو حسین خان کو بڑی شدت سے اپنے عقب کے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کی واحد امید اب جموں میں اس کا یار غار نبی خان تھا۔ نورولی کو اس نے نبی خان کی طرف ہی روانہ کیا تھا اور دوران گفتگو ہی اسے نورولی کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔

......گفتگو مکمل ہوتے ہی وہ اس کی طرف چل دیا۔

............☆☆☆............

مسلسل سفر نے بوڑھے نورولی کو تھکا ڈالا تھا اور...... وہ چٹائی زمین پر بچھائے ایک تکیے سے ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا، جب اس نے حسین خان کو اس طرف آتے دیکھا۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ دونوں اٹھ کر باہر آ گئے اور تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک دونوں دوست تنہائی میں باتیں کرتے رہے، پھر نورولی تو سونے چلا گیا جب کہ حسین خان سوچ میں ڈوبا واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے بیس خاص آدمیوں کے ساتھ جن میں اشرف خان اور شیر محمد بھی شامل تھے، انتہائی اہم صلاح مشورہ کر رہا تھا۔

''میرے دوستو!'' اس نے گفتگو کے اختتام پر انہیں مخاطب کیا۔ ''تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ تقدیر نے ہمیں دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے عقب سے بھارتی فوجیں ہم پر یلغار کر رہی ہیں اور دائیں بائیں سے ہمیں ڈوگرہ فوجوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ہماری نظریں سامنے کی سمت اپنے پٹھان بھائیوں پر لگی ہیں جو نہ جانے کیوں ہم تک پہنچ نہیں پائے، نہ ہی ابھی تک بھارتی فوج کے خلاف پاکستان کی باقاعدہ فوج میدان میں اتری ہے۔ نہ جانے وہ لوگ کس روز بد کے منتظر ہیں کہ ابھی تک ہماری مدد کو نہیں آئے۔ اس مرحلے پر اگر ہم نے پونچھ کو خالی

چھوڑ دیا تو خدائے واحد کی قسم قیامت تک پھر کبھی ہم دوبارہ یہاں قدم نہ رکھ سکیں گے۔ الا یہ کہ کوئی معجزہ ظہور پذیر ہو اور ہمیں دوبارہ یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے۔ ہم نے جس بے سروسامانی کے عالم میں جہاد کا آغاز کیا تھا، وہ آپ سب جانتے ہیں اور آج جب ہماری کوششیں رنگ لانے لگی ہیں تو مہاراجہ نے اپنی مدد کے لیے اپنے ہم مذہبوں کو بلا لیا ہے۔''

......تھوڑی دیر کے لئے رک کر اس نے اپنے ہمراہیوں کے چہروں پر نظر دوڑائی، سب پتھر کے بت بنے اس پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔

''جموں میں جس طریقے سے خون مسلم بہہ رہا ہے، آسمان بھی اس پر لہو کے آنسو بہاتا ہوگا مگر بہ خدا ہماری غیرت ابھی زندہ ہے۔ کشمیر کے بیٹے ابھی مر نہیں گئے کہ یوں غنیم ان کی بہو بیٹیوں کو گلیوں میں رسوا کرتا پھرے...... آزمائش کی گھڑی سر پر آ گئی ہے۔ ساتھیو! جموں کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کا لہو صرف اپنی بدبختی کی دہائی نہیں دے رہا، ہماری غیرت کو بھی للکار رہا ہے۔ خدائے واحد کی قسم! ہم تعداد میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہمارے پاس اسلحے کے انبار نہ سہی، لیکن ہمارے سروں میں آزادی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ ہمارے بازوؤں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ وہ ان غاصبوں کا گلا گھونٹ دیں جنھوں نے ہماری پشت میں خنجر گھونپا ہے۔'' اس نے رک کر دوبارہ لمبی سانس لی اور گویا ہوا۔

''میں کل رات جموں روانہ ہو جاؤں گا۔ یہاں کی کمان نور ولی کے سپرد کرتا ہوں۔ میں تم میں سے کسی سے اپنے ساتھ چلنے کی اپیل نہیں کروں گا، لیکن تمہیں تمہارا فرض ضرور یاد دلاؤں گا......''

''حسین خان! واللہ ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ تمہیں اکیلا جانے دیں۔'' شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

اس کے ساتھ ہی تمام مجاہدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حسین خان نے شیرو کو بہت سمجھایا، لیکن اس کے جذبہ شوق شہادت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اگلی رات سفر کے لیے منتخب ہوئی۔ ان لوگوں کو پہاڑوں کے بیچوں بیچ پیدل سفر طے کر کے جموں پہنچنا تھا کیونکہ تمام سڑکیں فوج کے قبضے میں تھیں۔

رات گئے تک شیرو، اشرف خان کو تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے زبردستی شرفو کو یہاں چھوڑ دیا تھا۔ قریباً آدھی رات کے بعد ایک شدید ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ وہ اپنے دوست کو اپنی ماں اور منگیتر کے ٹھکانے سے آگاہ کر دے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت حال کے پیش نظر وہ ان لوگوں کو لے کر سرحد پار کر جائے۔

''تم ہمیشہ مجھے چھوٹا سمجھ کر دباتے آئے ہو شیرو......'' اس نے قریباً سسکیاں لیتے ہوئے روانگی کے وقت اس سے کہا۔

''شرفو! میرے بھائی میں ایک بہت بڑی ذمہ داری تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ میری ماں کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ اس کا بیٹا سرخرو نہ ہوا تو کبھی اسے اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ اچھا، فی امان اللہ۔'' اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ مزید تھوڑی دیر تک شرفو کے پاس رکا رہا تو شدت ضبط سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

..............☆☆☆..............

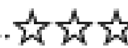
گھور اندھیارے کشمیر کے مقدر کو ڈسنے کے لیے پہاڑوں کے دامن میں اتر رہے تھے...... وہ رات کا دوسرا پہر تھا جب پچاس سرفروشوں کا ایک قافلہ اپنے ہاتھوں میں رائفلیں اور اسٹین گنیں تھامے، کندھوں پر چادریں رکھے اپنے ساتھیوں سے کمانڈر حسین خان کی سرکردگی میں الگ ہو رہا تھا۔ یہ کشمیر کے وہ جیالے سپوت تھے جنہیں دشمن کی برتری ہرگز گوارا نہ تھی۔ وہ مار دینے یا مر جانے کا سودا سروں میں سما کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ احساس تفاخر ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ بہ خدا وہ سربلندوں میں سربلند تھے کہ مادر وطن کی آزادی و عصمت کی پاسداری کے لیے انہوں نے موت کی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دشمن کی للکار پر لبیک کہہ کر اس سے ٹکرانے نکلے تھے۔ یہ پہاڑ اور چیونٹی کا مقابلہ تھا، لیکن آفرین ہے ان کے شوق جہاد پر کہ وہ کسی مصلحت کو، کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لائے تھے۔

نورولی کی کمان میں سو مجاہدین کا ایک دستہ انہیں رخصت کرنے کے لیے پہاڑی سلسلے کی آخری حد تک آیا تھا...... ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، لیکن ان سب کے ہونٹوں پر دعائیں لرز رہی تھیں۔ پہاڑی سلسلے کی آخری حد پر پہنچ کر نورولی کی کمان میں آنے والے مجاہدین دو رویہ قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے قرآن پاک بلند کر لیے۔ وہ قرآن کے مقدس و متبرک سائے میں اپنے پیاروں کو رخصت کر رہے تھے۔

پچاس مجاہد ایک ایک کر کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے رخصت ہو رہے تھے، سب سے آگے کمانڈر حسین تھے۔

''حسین خان! روز قیامت میں خدا کی عدالت میں تمہیں ضرور کھینچوں گا۔'' بوڑھے نورولی کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھے بوڑھا سمجھ کر چھوڑ دیا ہے نا تم نے!''

''نورولی! واللہ میرے نزدیک تم سے بہتر کوئی نہ تھا کہ جسے میں ان منتشر اور نہتے مجاہدوں کو سونپ کر جاتا۔ ہم ایک دوسرے سے انشاء اللہ اسی دنیا میں دوبارہ سرخ رو ہو کر ملیں گے۔ اچھا فی امان اللہ۔'' اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی آہستہ آہستہ اندھیرے کی وسیع و عریض چادر کا حصہ بننے لگے۔



میجر رام سنگھ نے طاقتور دوربین اپنی آنکھوں سے لگا رکھی تھی اور وہ اس پہاڑی سلسلے کے بالکل آغاز ہی میں ایک چھتنار درخت کی ٹہنیوں میں خود کو چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے سجاول کو تھانے کی عمارت سے نکل کر بازار کی طرف جاتے دیکھا...... معاملہ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ خاصی دور تک اس کی نظروں نے سجاول کا تعاقب کیا اور عین ان لمحات میں جب وہ مایوس ہو کر نیچے اترنے والا تھا، اس نے سجاول کو ایک جگہ سے موڑ مڑتے دیکھا۔ یہ راستہ ویران سمت کی جانب رہنمائی کر رہا تھا۔ میجر رام سنگھ چونکا۔ ''یہ کدھر جا رہا ہے؟'' اس نے سوچا اور دوربین اس پر مرکوز کر دی۔ اس کی حیرت بڑھنے لگی۔ جب سجاول اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت کے نیچے سے بھی گزر کر آگے بڑھ گیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔

وہ اپنا سانس روکے وہیں دبکا رہا اور جب وہ کچھ دور نکل کر ایک موڑ پر گھوما تو رام سنگھ بھی درخت سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ دبے قدموں سے بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کیے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ تعاقب کا یہ سلسلہ ختم ہونے ہی نہیں آتا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی تھی، لیکن اس

نے خود پر قابو پائے رکھا۔ کسی آمدہ کامیابی کی خوشی نے اسے تھکاوٹ یا سفر کی طوالت کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اس نے اپنا ریوالور اب مضبوطی سے دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تعاقب کے لیے اس نے بڑا محفوظ طریقہ استعمال کیا تھا۔ وہ حتی الوسع دوربین کے ذریعے سجاول پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جہاں کہیں اس کی بینائی کے راستے میں کوئی پہاڑی موڑ یا سلسلہ آتا، وہ فوراً ایسی جگہ تبدیل ہو جاتا جہاں سے سجاول اسے صاف دکھائی دینے لگتا۔

پھر ایک مقام پر اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، اس نے تو رام سنگھ کو بھونچکا کر رکھ دیا...... اس نے بجائے خود آگے بڑھ کر کھیل بگاڑنے کے وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کرلیا۔

......اب وہ قریباً بھاگتا ہوا تھانے کی طرف آرہا تھا۔ مسلسل اور تیز رفتاری سے بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھولنے لگی تھی، لیکن اس نے کہیں بھی رک کر سانس لینا گوارا نہ کیا۔ اپنی ٹریننگ میں بھی وہ کبھی اس طرح نہیں بھاگا تھا، لیکن کامیابی کے نشے میں چور رام سنگھ کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو ہوا میں تیرتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

''فوراً بیس جوان تیار کرو۔'' اس نے اپنے نائب کو دور ہی سے چلا کر حکم دیا۔

............☆☆☆............

''کل ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔'' سجاول نے لالہ کو مخاطب کیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن شیرو کی کوئی خبر؟'' لالہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں تو خود حیران ہوں۔ خیر تم بے فکر رہو۔ مجھے آج پتہ چل جائے گا۔'' اس نے لالہ کو تسلی دی۔

''خدا تمہارا بھلا کرے۔ نہ جانے ہم کبھی تمہارے ان احسانات کا بدلہ چکا بھی پائیں گے یا نہیں۔'' شیرو کی ماں نے احساس تشکر سے سرشار لہجے میں کہا۔

''اچھا آپ لوگوں نے تو مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں چلتا ہوں...... خدا حافظ!''

''خدا حافظ!'' تینوں نے یک زبان اسے خدا کی حفاظت میں سونپا۔

حسب سابق وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا آ رہا تھا جب سجاول کو اپنے گرد اگرد کسی نادیدہ خطرے کا احساس ہوا...... اس کی چھٹی حس نے اس سلسلے میں اسے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے رک کر بغور ماحول کا جائزہ لیا۔ اپنے دائیں بائیں مختلف درختوں پر چڑھ کر نظریں دوڑائیں، پھر مطمئن سا ہو کر چل دیا۔

...... لیکن ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس گز ہی چل پایا تھا جب اچانک اس کے چاروں طرف ''ہالٹ...... ہالٹ!'' کی آوازیں شور پیدا کرنے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتا، بیک وقت تین چار رائفلوں کی سنگینیں اس کے جسم سے آ لگیں۔ ''ہینڈز اپ'' اس نے رام سنگھ کی آواز سنی اور بے اختیار اس کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

ابھی تک اسے رام سنگھ نظر نہ آیا تھا۔

...... اس سے پہلے کہ سجاول خان کی نظریں میجر رام سنگھ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوتیں، ایک زوردار ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی جس سے بے اختیار وہ بائیں طرف ڈگمگایا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جائے، اس کی بائیں پسلی پر بھی وہی قیامت ٹوٹ پڑی۔ سجاول نے سنبھلنے کی ہزار کوشش کی لیکن اس پر ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔ چیخنا چلانا اس نے بزدلی سمجھا اور اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر اپنے اندر سے اٹھنے والی ٹیسوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اسے زیادہ دیر تک خود سے جنگ نہیں لڑنا پڑی۔ سر پر لگنے والے رائفل کے بٹ نے اسے تھوڑی دیر کے لیے تمام اذیتوں سے نجات دلا دی...... سجاول کا ذہن اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

............☆☆☆............

لالہ اس سمت نظریں جمائے بیٹھا تھا جس طرف سے اکثر سجاول آیا کرتا تھا...... اسے گئے ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ لالہ کا دل گھبرانے لگا۔ آج پہلی مرتبہ اسے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، حالانکہ یہاں آنے کے بعد وہ خود کو قدرے محفوظ خیال کرتا تھا۔

...... اس کے وہم نے تب حقیقت کا روپ دھار لیا، جب اچانک اس نے پہاڑی سلسلے سے ڈوگرہ فوجیوں کو اسی طرف بڑھتے دیکھا۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا تھا، لیکن حقائق سے فرار کی کوئی بھی راہ دکھائی نہ پڑتی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ عالم ہوش میں لوٹ آیا۔ وہ

دوڑتا ہوا مختصر سی غار تک پہنچا۔ اپنی بھابی اور بیٹی کو اس نے بڑی تیزی سے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا کر سنبھلنے کی تاکید کی۔ آنکھیں دونوں کی حیرت اور خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ لالہ نے انہیں جھنجھوڑا اور اس غار کی دوسری سمت سے میدانی علاقے کی طرف اترنے کی ہدایت کی۔ خدا حافظ کہا اور اپنی اسٹین گن اور گولیوں سمیت بھاگتا ہوا اس راستے پر پہنچ گیا جس طرف سے سجاول انہیں ملنے آیا کرتا تھا۔

اس کی نگاہیں اس راستے پر ٹکی تھیں جدھر سے ان لوگوں کی آمد متوقع تھی اور خوف نام کی کوئی شے اس کے نزدیک نہ پھٹکی تھی۔ اسے اگر کوئی ڈر تھا تو صرف یہ کہ عورتیں ہیں، حملہ آوروں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اپنی جان سے گزر جانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ پھر...... سامنے سے آنے والے نمایاں ہونے لگے۔

وہ لوگ دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور لالہ ان سے خاصی اونچائی پر مورچہ زن تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی، لیکن اسٹین گن پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس لمحے کا منتظر تھا جب حملہ آور اس کی گن کی رینج میں آ جائیں اور وہ مرنے سے پہلے اپنے دل کے ارمان نکال سکے۔ بڑی بے چینی کے ساتھ وہ ان کی آمد کا منتظر تھا، لیکن اچانک اس نے حملہ آوروں کو رکتے دیکھا۔

وہ لوگ مختلف ٹیلوں اور بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ اچانک ایک زوردار آواز پہاڑیوں میں گونجی۔

''تم لوگ گھیرے میں آ چکے ہو، خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔''

لالہ خاموش رہا۔ دوبارہ وہی فقرہ دہرایا گیا۔ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس مرتبہ پھر اسی آواز نے کہا۔

''کریم لالہ! دونوں عورتوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ جیسے ہی وہ ہمیں اپنی طرف آتی دکھائی دیں گی، ہم تمہیں نکل جانے کا موقع دیں گے۔ تمہارا عقب خالی ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ عورتوں کو گرفتار کروا دینے کی صورت میں ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

''بزدلو! بے شرمو...... !'' لالہ پھٹ پڑا۔ ''کیا تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ بخدا میرے جیتے جی کس کی مجال ہے کہ جو میری عزت کو میلی نظروں سے دیکھ بھی سکے۔ آؤ اگر ہمت ہے تو سامنے آ کر مقابلہ کرو۔''

دوسری جانب خاموشی طاری رہی، پھر اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ سے کسی کو ہاتھ اوپر اٹھائے اپنی جانب آتے دیکھا۔ شاید دشمن کا کوئی نمائندہ اس سے سودا بازی کرنے آ رہا تھا۔ لالہ ہوشیار ہو گیا۔

آہستہ آہستہ آنے والے کے نقوش نمایاں ہونے لگے اور جب اس کی شکل مکمل نظر آئی تو لالہ کا خون کھول اٹھا۔ ٹریگر پر سے اس نے بمشکل اپنی انگلی کو الگ کیا تھا۔ یہ انسپکٹر میر تھا۔ غدار ابن غدار۔ وہ لالہ سے قریباً تیس چالیس گز دور ہی ایک جگہ آ کر رک گیا۔

''کریم لالہ'' انسپکٹر میر نے گلہ پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''کیوں مفت میں جان گنواتے ہو۔ میجر رام سنگھ کو میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کیا ہے کہ عورتوں کو پیش کر دینے کی صورت میں وہ تمہیں گرفتار نہیں کرے گا......''

''بکواس بند کر۔'' لالہ نے بے قابو ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''مہاراجہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے پلے۔ بخدا تو میرے آباؤ اجداد کو جانتا ہے اور میں تیرے بزرگوں کو...... !'' اونچی آواز میں غصے سے چلانے کی وجہ سے لالہ کریم ہانپنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میر یہ طعنہ برداشت نہ کر

پائے گا اور اس پر فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ لیکن انسان کس حد تک بے غیرت بن سکتا ہے، اس کا اندازہ لالہ کریم کو نہیں تھا۔ وہ تو سیدھا سادا کشمیری تھا۔ کشمیر کی آزادی پر مرمٹنے کا جذبہ اس کے بزرگوں نے خون میں اس کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی، لیکن اس کا سبب بزدلی ہرگز نہ تھا۔

بنیادی طور پر وہ ایک شریف انسان تھا۔ جنگ سے نفرت کرنے اور باغات کو پھلتے پھولتے دیکھنے والا شریف النفس کریم لالہ۔ اس کے بھائی نے قربانی دے کر سدھنوں کو جینے کی نئی راہ سجھائی تھی۔ پونچھ کے لوگ کبھی کبھی اس بات پر حیرانی کا اظہار کیا کرتے تھے کہ اتنے بہادر انسان کا اتنا بزدل بھائی......! لیکن آج جب تقدیر اس کی وطن دوستی کو آزمانے پر تل گئی تھی اور گردش حالات نے اسے غاصبوں کے عین سامنے لا کھڑا کیا تھا تو اس نے بزدلی کو نزدیک بھی نہ پھٹکنے دیا۔ وہ اپنی زمین اور بیٹی کی عزت پر ہر لمحے قربان ہونے کو تیار تھا۔

جس طرح لالہ کریم کو وطن دوستی اور شجاعت ورثے میں ملی تھی، اسی طرح انسپکٹر میر کو غداری اور قوم دشمنی وراثت میں ملی تھی۔ اس کے باپ دادا بھی ڈوگرہ حکمرانوں کا ٹاؤٹ بن کر ایسے ہی عہدوں کا مزا لوٹ چکے تھے۔ وہ ضمیر فروش وطن دشمن محض یہ چاہتا تھا کہ لالہ کریم اور اس کی بیٹی کو زندہ گرفتار کر کے میجر رام سنگھ کے حضور پیش کرے اور انعام کا حق دار ٹھہرے۔ لالہ کریم سے گفتگو کرنے کا مقصد بھی اسے صرف الجھانا ہی تھا جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو چلا تھا...... اس نے دوران گفتگو اپنے سپاہیوں کو ایک پہاڑی ٹیلے کی اوٹ سے دوسری طرف نکل کر اس راستے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا تھا جو اس کی دانست میں زہراں اور شیرو کی ماں کے فرار ہونے کا واحد راستہ تھا۔

............☆☆☆............

کسی لاشعوری حرکت کے تابع ہو کر ہی لالہ کریم نے اس طرف گردن گھمائی۔ اس لمحے اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال جاگزیں ہوا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر دراصل فرار کے امکانات کا جائزہ لینا چاہا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر اپنی بائیں سمت والے ٹیلے کی طرف گئی تو وہ ٹھٹھرا کر رہ گیا۔ چار ڈوگرے ایک دوسرے کے تعاقب میں مختلف پتھروں اور جھاڑیوں کی اوٹ لیتے اسی گزرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے زہراں اور شیرو کی ماں کو اس نے فرار کروایا تھا۔

کریم لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''تو...... یہ مکار مجھے گفتگو کے جال میں الجھا کر گھناؤنا کھیل کھیلنا چاہتا تھا؟'' اس نے لحہ بھر سوچا اور ساتھ ہی گن کا رخ کرالنگ کرتے ڈوگرہ سپاہیوں کی طرف کر دیا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھا اور پہلے ہی ہلے میں اسٹین گن نے اپنے انجام سے بے خبر رینگتے ہوئے ڈوگرہ سپاہیوں میں سے دو کو چاٹ لیا۔

دونوں نے ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر لالہ کریم کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا تھا۔ باقی دو کو بھی گولیاں تو لگی تھیں، لیکن ضرب کاری نہ ہونے کے باعث کسی نہ کسی طرح رینگ رینگ کر محفوظ آڑ میں چلے گئے۔

فائرنگ کی آواز سنتے ہی میجر رام سنگھ کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے دل ہی دل میں انسپکٹر میر کو پانچ چھ گالیوں سے نوازا جو اسے یہ کہہ کر گیا تھا کہ ایک گولی بھی ضائع کرائے بغیر لالہ کریم، زہراں اور شیرو کی ماں کو گرفتار کر لے گا۔

انسپکٹر میر کی بیوقوفی نے لالہ کریم کو ہوشیار کر دیا تھا اور اب اگر وہ اسے گھیر کر مار بھی ڈالتے تو زہراں اور شیرو کی ماں کو ڈھونڈنا بڑا مشکل ہو جاتا کیونکہ لالہ کریم کی پوزیشن ایسی تھی کہ جب تک اس کے پاس اسلحہ ختم نہ ہو جاتا، کسی کے اس کے سامنے سے گزر کر اس کی پشت تک پہنچنے کے امکانات باقی نہیں تھے۔

میجر رام سنگھ نے انسپکٹر میر کو گالیاں بکتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دوربین کو الگ کیا اور اپنے پہلے سے تربیت شدہ جوانوں کو ''چارج'' کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی بیک وقت ڈوگرہ سپاہیوں کے تین سیکشن مختلف اطراف سے فائرنگ کرتے ہوئے لالہ کریم کی طرف بڑھنے لگے۔ لالہ کریم کے عین سامنے، لیکن قدرے نیچی پوزیشن پر لگی مشین گن نے لالہ کریم کے مورچے پر آگ اگلنا شروع کر دی۔ فائرنگ اتنی تیز ہو رہی تھی کہ اسے سر اٹھانے کی مہلت بھی نصیب نہ تھی۔

اس تیز رفتار فائرنگ کی آڑ میں میجر رام سنگھ کے خصوصی دستے کے تربیت یافتہ فوجی اس کی طرف گولیاں برساتے بڑھ رہے تھے۔ لالہ کریم کو اپنی موت کا تو پکا یقین ہو چکا تھا، لیکن اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح زہراں اور شیرو کی ماں کو ظالموں کی دستبرد سے بچا لے اور زیادہ سے زیادہ ڈوگروں کو مار ڈالے۔

تیز فائرنگ اور اس کی طرف ایڈوانس کرتے فوجیوں کے ''بے کاروں'' نے اسے رتی بھر بوکھلایا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دماغ کو حاضر رکھا اور مشین گن کی گولیوں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی طرف بڑھتے فوجیوں پر فائرنگ شروع کر دی۔

انسپکٹر میر نے فوجیوں کو یلغار کرتے دیکھا تو یہی جانا کہ کھیل اس کے ہاتھ سے نکل گیا، لیکن اتنی جلدی ہار ماننے والا وہ بھی نہیں تھا...... اس نے فائرنگ کرنے والوں سے ہٹ کر ایک لمبا چکر لگا کر کریم لالہ کے پہلو میں پہنچنے اور اس پر حملہ کر کے گرفتار کرنے کا عزم کیا اور اپنا ریوالور سنبھالتا اس طرف چل دیا۔

کریم لالہ آخری میگزین لوڈ کر رہا تھا جب اچانک اس کے سامنے سے تین چار سر نمودار ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ گن کو فائرنگ کی پوزیشن میں لاتا، ایک ڈوگرہ سپاہی کی گولی اس کا دایاں کندھا بری طرح چھید گئی۔

کریم لالہ تیورا کر الٹ گیا، لیکن سنبھلا اور اس نے میگزین فٹ کر لی۔ اس کو اپنے دائیں کندھے پر چنگاریاں سلگتی محسوس ہو رہی تھیں اور چند ہی لمحوں میں شانے میں پیدا ہونے والی آگ اس کے سارے بازو میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ دورہ کرنے لگی تھی، لیکن ابھی وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا...... اس نے ایک بڑے پتھر کی پشت سے ٹیک لگائی اور اس کی انگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی...... اچانک ہی مشین گن کا پورا برسٹ اس کے جسم پر پڑا۔

......اور دم توڑتے کریم اللہ کی نگاہوں نے جو آخری منظر دیکھا، اس نے کریم لالہ پر سکرات کے عالم کو سہل کر دیا۔

دم توڑتے انسپکٹر میر کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اچانک کریم لالہ کے پہلو سے نمودار ہوا تھا اور اپنی دانست میں اس نے بڑی صحیح سمت اختیار کی تھی، لیکن بے دم ہوتے کریم لالہ نے زمین پر گرتے گرتے بھی اپنا دباؤ اسٹین گن کے ٹریگر پر برقرار رکھا تھا اور

گولیاں قطار کی صورت انسپکٹر میر کے جسم میں سوراخ بناتی چلی گئی تھیں۔

............☆☆☆............

اشرف خان پچھلے دو دن سے عجیب وغریب ذہنی کشمکش کا شکار تھا...... شیرو نے اس پر معمولی ذمہ داری نہیں ڈالی تھی۔ دوسری طرف اس کی مصروفیات بھی پہلے سے خاصی زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ مجاہدین نے اب زیر زمین کارروائیوں کے بجائے دشمن کے سامنے آکر لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ہر روز وہ لوگ کسی نہ کسی گھات پر جاتے، لیکن آج صبح ہی سے شرفو کو ایک بے کلی سی لگی ہوئی تھی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر شیرو کے گھر والوں کی پناہ گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے جسم پر لپٹی ڈھیلی چادر میں وہ اسٹین گن چھپانا نہیں بھولا تھا۔ دو ہینڈ گرینیڈ بھی اس نے احتیاطاً ساتھ رکھ لیے تھے۔

زہراں تک پہنچنے کے لیے شرفو نے کافی لمبا اور پیچ دار راستہ اپنایا تھا۔ شیرو نے اسے اپنی ماں اور منگیتر تک پہنچنے کے کئی راستے سمجھا دیے تھے۔ شرفو نے وہ راستہ اختیار کیا تھا جس طرف سے اس کے نظر آنے کے امکانات بہت کم تھے۔

وہ اس غار کی پشت پر تقریباً دو ڈھائی فرلانگ دور تھا جب اس نے زوردار فائرنگ کی آواز سنی۔ شرفو کا دل دھک سے رہ گیا۔ دن کی روشنی میں ایسے دھماکوں کی آوازوں کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا تھا کہ ''اس کے مہمان کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ کیا ان پر ڈوگروں نے حملہ کر دیا ہے؟'' اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے سر میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

شیرو کا چہرہ سوال بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو اسے یہ بھی سمجھ نہ آ سکا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ بھاگ جائے یا ان لوگوں کی مدد کو پہنچے؟ اس بات کا اسے بخوبی احساس تھا کہ وہ اکیلا دن کے اجالے میں ڈوگرہ پلٹن کا مقابلہ کسی صورت نہیں کر سکتا۔ شیرو نے اسے بتایا تھا کہ ان کے ''گمنام ہمدرد'' نے لالہ کو اسٹین گن اور گولیاں دی ہوئی ہیں اور اس فائرنگ سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر رہا تھا کہ شاید لالہ ان لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گیا ہے۔

وہ اکیلا کیسے اس کی مدد کرے؟ یہ سوال بار بار اسے ڈسنے لگا۔ پہلے تو اس نے یہی ارادہ کیا کہ وہ واپس ہو جائے اور ساتھیوں کی کمک لے کر یہاں پہنچے۔ اس ارادے کے تابع اس نے ابھی بمشکل دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا ضمیر اس کے راستے کی سد سکندری بن کر اس کے سامنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔

''شرفو!'' ایک آواز اس کے اندر سے بلند ہوئی۔ ''تیرے واپس آنے تک یہاں کیا بچے گا؟ اپنے دوست سے کیسے آنکھیں ملا پائے گا تو......؟ یہ صلہ ہے اس کی دوستی کا؟''

''نہیں......'' شرفو کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ دیوانہ وار پہاڑی کی طرف دوڑنے لگا...... اپنی گن کو اس نے بھاگتے بھاگتے فائرنگ پوزیشن میں کر لیا تھا۔ اونچے نیچے پہاڑی سلسلے پر تیز رفتاری سے دوڑنے پر وہ دو تین مرتبہ ٹھوکر کھا کر گرا بھی، لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے پہاڑی سے نیچے آنے والے راستے پر دو عورتوں کو اپنی طرف بھاگتے دیکھا۔ شرفو بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ زہراں اور شیرو کی ماں ہی ہیں۔ اب ساری بات خود بخود اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ لالہ نے فائرنگ کی آڑ میں انہیں پچھلے راستے سے فرار کروا

دیا ہے۔ شرفو سے ان کا فاصلہ بمشکل تیس چالیس گز تھا لیکن انہوں نے شاید اسے دیکھا نہیں تھا۔ شرفو نے اپنا رخ بدلا اور ان کی مدد کو لپکا۔

شیرو کی ماں نے اپنی جانب آتے ہوئے شرفو کو پہچان لیا...... زہراں نے اگرچہ اس سے پہلے دو تین مرتبہ ہی اسے دیکھا تھا، لیکن وہ بھی اسے پہچان گئی۔ دونوں عورتیں اسے تائید غیبی جان کر اس کی طرف لپکیں، لیکن اچانک ہی اگر شرفو نے ان سپاہیوں کو دیکھ کر ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں چھلانگ نہ لگا دی ہوتی تو رائفل کی گولیاں اسے چاٹ لیتیں۔

ڈوگرہ فوج کا ایک سیکشن جو تین چار سپاہیوں پر مشتمل تھا، بچتا بچاتا کسی نہ کسی طرح چکر کاٹ کر پہاڑی کے ایک پہلو پر ایسی پوزیشن میں آ گیا تھا جہاں سے وہ لوگ فرار کے راستے پر نظر رکھ سکتے تھے۔

......انہوں نے تو اپنی دانست میں دونوں عورتوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے فائرنگ کی تھی تاکہ وہ سہم کر رک جائیں اور گرفتاری کے لیے خود کو پیش کر دیں، لیکن شیرو کی ماں فائرنگ کی رینج میں آ گئی اور تھری ناٹ تھری رائفل کی دو طاقتور گولیاں اس کے پہلو اور پشت میں گھستی ہوئی پار نکل گئیں۔ وہ زمین پر گری ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔

فائرنگ کرنے والوں کو شاید اپنی بے وقوفی کا احساس ہو گیا تھا یا کورٹ مارشل کا خوف دامن گیر تھا کہ انہوں نے فائرنگ روک دی۔ ان کی نظر اب تک شرفو پر نہیں پڑی تھی جس کی آنکھوں میں شیرو کی ماں کو گولیاں کھا کر گرتے ہوئے دیکھ کر خون اتر آیا تھا اور جس کا ہاتھ بڑی عجلت میں اپنے پہلو سے لٹکتے کینوس کے تھیلے میں رینگ گیا تھا۔ وہ شاید گرنیڈ نکال کر ان لوگوں پر پھینکنا چاہتا تھا، لیکن اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ حملہ آور عورتوں کے اتنا قریب آ گئے تھے کہ گرنیڈ پھٹ کر عورتوں کو بھی ان کے ساتھ ہی اڑا دیتا۔ جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ باہر کھینچا اور دوسرے ہی لمحے وہ حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے تیار تھا جو اپنی گنوں کے سنگ کندھوں سے لٹکائے بھاگے چلے آ رہے تھے اور ابھی وہ زہراں سے بمشکل پانچ چھ گز دور ہی تھے جب شرفو اچانک پتھر کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ زہراں شیرو کی ماں پر جھکی ہوئی اسے سنبھالا دے رہی تھی۔

''بزدلو......!'' نفرت اور غصے سے شرفو پھٹ پڑا۔ اس کی گن کی سرخ لمبی زبان باہر کو لپکی اور قبل اس کے کہ حیرت زدہ اور بھونچکے حملہ آور اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر سیدھی کرتے، ان کے خون میں نہائے ہوئے لاشے ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے...... غصے اور نفرت سے کھولتے ہوئے اشرف خان نے پوری میگزین ہی ان پر خالی کر دی تھی۔ ان مناظر نے زہراں کو لرزا کر رکھ دیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ اس کا حلق خشک ہو چلا تھا۔ اس نے چلانا چاہا، لیکن نطق نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

''ماں جی...... ماں جی!'' شرفو نے جھکتے ہوئے شیرو کی ماں کا کندھا آہستہ سے ہلا کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

مادرِ کشمیر کی دم توڑتی آنکھوں نے آخری منظر اس کے ذہن کو منتقل کر دیا تھا۔

......اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود پھیل گئی۔ مادرِ کشمیر نے مرنے سے پہلے دیکھ لیا تھا کہ اس کی مٹی کے ایک سپوت نے اس کے جیتے جی اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔ اس میں نجانے اتنی طاقت کہاں سے عود کر آئی کہ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کا چہرہ اپنے

ہاتھوں کے پیالے میں رکھ کر گویا جھکنے کا اشارہ کیا۔

اور مادر کشمیر کے ہونٹ دہکتے انگاروں کی طرح شرفو کی پیشانی پر ثبت ہو گئے۔

''شرفو......! میرے بچے تو آ گیا......شیرو کہاں ہے؟'' کانپتی اور دم توڑتی آواز میں وہ سسکنے لگی۔

''وہ بھی ابھی آ جائے گا ماں جی......ابھی تھوڑی ہی دیر میں......بس آتا ہی ہوگا۔''

......شرفو کے منہ سے بے اختیار یہ فقرے نکل رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیا بتائے۔ کیسے بتائے کہ اس کا بیٹا تو یہاں سے سینکڑوں میل دور موت کی اس شاہراہ پر اپنے سفر کا آغاز کر چکا ہے جہاں سے لوٹ کر آنا اب شاید اس کے بس میں بھی نہ ہو۔

اسی اثناء میں زہراں کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس نے رندھے ہوئے گلے سے ''چاچی'' پکارا تو شیرو کی ماں نے کمال ضبط سے اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

''بہت دیر ہو گئی بیٹا۔ اس نے بہت دیر کر دی......'' بمشکل اس کی زبان لڑکھڑائی۔

''ماں جی، میں آپ کے لیے......''

......شرفو نے کچھ کہنا چاہا، لیکن ماں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بیٹا'' اس کی آواز لرزی۔ ''اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

......اس لمحے اس کی آنکھیں شرفو اور زہراں سے ہٹ کر آسمان پر لگی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی انمول شے کا سراغ لگا رہی ہوں...... اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ ''مولا! میرے مولا......میرا بچہ......میری زہراں......کشمیر......'' اس نے ہچکی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

............☆☆☆............

''چاچی'' زہراں کی دلدوز چیخ سے شرفو کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ خود شرفو کو یوں لگا جیسے کسی نادیدہ ہستی نے اس کے اندر داخل ہو کر اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر زور سے مسل دیا ہے۔ اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہونے لگا۔ ایک سنسناہٹ سی اس کے خون میں دورہ کرنے لگی تھی...... کشمیر کی داستان حریت کا ایک درخشندہ باب اس کے سامنے کھلا تھا۔ ایک لمبی اور تھکا دینے والی لڑائی لڑنے کے بعد مادر کشمیر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ وہ جس نے اپنے خاوند کو آزادی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا، اب اپنے بیٹے کو آزادی کی سنگلاخ راہ گزر پر روانہ کر کے خود سرخرو ٹھہری تھی۔

جلد ہی شرفو پر سکون ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرداگرد پھیلے پہاڑوں اور سبزے کا سارا حسن ماں میں سمٹ آیا ہو۔ کشمیر کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی سورج کی کرنوں کا ہالہ مادر کشمیر کے چہرے کے گرد پھیل گیا اور اس میں سے ایک مقناطیسی قوت خارج ہو کر شرفو کے تن بدن میں سرایت کرنے لگی۔ ایک ولولہ تازہ اسے میسر آنے لگا۔

ماں کی موت نے اس کے دم توڑتے ارادوں میں بجلیاں سمو دیں۔ ایک کوندا سا لپکا اور اسے قوت ارادی کی دولت سے مالا مال کر گیا۔

شیرو کی ماں نے مر کر اسے جینے کی راہ دکھائی تھی۔

اس لمحے اس نے مادر کشمیر کی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ وہ اس کے عظیم مشن کو زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رکھے گا۔ اس نے جھک کر ماں کی مقدس پیشانی کا بوسہ لیا، پھر اس کے چہرے کو اس کی خون آلود چادر سے ڈھانپ کر سسکیاں لیتی زہراں کو بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

پہاڑی کی دوسری طرف فائرنگ کی آواز اب کم پڑتے پڑتے ختم ہو چکی تھی۔ شاید حملہ آوروں کے سامنے اب کوئی مدافعت باقی نہیں بچی تھی۔ شرفو جانتا تھا کہ اب وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح بو سونگھتے اس طرف آئیں گے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ پہلے اس نے ماں کی لاش کو دفن کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر اسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

''چلو زہراں'' اس نے زہراں کے بازو کو ہلکا سا اپنی سمت کھینچا تو وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح اس پر آ رہی۔ اس کی سسکیوں اور سینے کا زیر و بم شرفو کے خون میں چنگاریاں دوڑانے لگا تھا۔

چند لمحے...... اس نے شاید کسی لاشعوری خواہش کے تحت اس عمل سے چھٹکارہ پانا مناسب نہ جانا، پھر جیسے وہ اچانک گہری نیند سے جاگ اٹھا۔ یہ زہراں تھی...... اس کے دوست کی امانت۔ وہ شیرو کی ماں کو تو بچا نہیں سکا تھا لیکن زہراں...... خدانخواستہ زہراں دشمن کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ کبھی خود کو معاف نہیں کرے گا۔ ''وہ لوگ اب اسی طرف آ رہے ہیں زہراں۔ وقت بہت کم ہے چلو۔'' اس نے زہراں کو خود سے الگ کیا اور اس کا بازو پکڑ کر وہاں سے اسے قریباً کھینچتے ہوئے روانہ ہو گیا لیکن...... ابھی وہ بمشکل چند قدم ہی چلا ہو گا کہ اچانک رک گیا۔ پہاڑی سلسلے میں گونجتی ڈوگرہ فوجیوں کے قدموں کی آواز اب اسے نزدیک آتی سنائی دے رہی تھی...... زہراں کا خیال بھی شاید اسی طرف گیا تھا کیونکہ روتے روتے وہ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی۔

''تم میری واپسی تک یہیں بیٹھی رہنا۔''

اس نے خوفزدہ زہراں کو ایک محفوظ آڑ میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

زہراں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ وا کیے، لیکن اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شرفو حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ مختلف ٹیلوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں بھاگتا چلا جا رہا تھا، پھر اس نے شرفو کو اپنی سمت آنے والے راستے میں ایک بلند ٹیلے کے پیچھے چھپتے دیکھا۔

...... خوف کے مارے اس کی ہتھیلیاں پسینے میں نہا رہی تھیں۔ دل تھا کہ جیسے ابھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا۔ ایک ایک لمحہ قیامت خیز تھا۔ اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، پھر اچانک جیسے اس کی شریانوں میں دوڑتا خون رک گیا۔ اس نے راستے کے اسی موڑ پر ایک دوسرے کے تعاقب میں آتے پندرہ بیس ڈوگرہ سپاہیوں کو دیکھ لیا تھا...... جونہی وہ لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں شرفو فرشتہ اجل بنا ان کا منتظر تھا، یکے بعد دیگرے دوز وردار دھماکے ہوئے اور گویا حملہ آوروں کے لیے حشر بپا ہو گیا...... ان کے سروں پر قیامت ٹوٹی اور زہراں نے ان کے جسموں کے خون آلود لوتھڑے پتھروں اور گرد سمیت فضا میں اچھلتے دیکھے۔

......اور لمحہ بھر بعد اس گرد اور خون کے پس منظر سے اس نے شرفو کو نکل کر اپنی سمت آتے دیکھا۔ ایک پرسکون سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ بالکل اسی مزدور کی طرح جسے دن بھر کی محنت کا صلہ خلاف توقع بہت زیادہ مل گیا ہو۔

''آؤ زہراں۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

تھوڑی دیر بعد ہی دو سائے پہاڑی سلسلوں میں لرزتے وہاں سے دور ہٹتے چلے جا رہے تھے۔

............☆☆☆............

29 اگست 1947ء کی صبح جنرل طارق اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تازہ ترین صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے سری نگر کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں اگلے ہی روز ایک نہایت اہم میٹنگ میں ''لبریشن کمیٹی'' کا ممبر نامزد کیا گیا تھا اور جی ایچ کیو سے الگ کر کے ان کی خدمات وزیراعظم کے لیے وقف کر دی گئی تھیں۔

اس میٹنگ کی تمام کارروائی خفیہ تھی اور شریک حضرات کو سختی سے تنبیہ کر دی گئی تھی کہ وہ اس کی اطلاع فوج کے انگریز افسران تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ جب جنرل طارق اپنے فرائض کی نوعیت جاننے کے لیے بضد ہوئے تو انہیں یہی بتایا گیا کہ وزیراعظم کی خواہش ہے کہ کم از کم تین ماہ تک جنگ جاری رکھی جائے تا کہ اس کی آڑ میں اپنے مخصوص سیاسی مقاصد حاصل کیے جا سکیں۔

جنرل کی جموں پر حملے کی تجویز کو تو کھلی جنگ چھڑ جانے کے خدشے کے پیش نظر رد کر دیا گیا تھا۔ اس لیے انہیں اب اپنی ساری توجہ کشمیر محاذ پر مرکوز رکھنی تھی جہاں سری نگر کے ہوائی اڈے پر دھڑا دھڑ انڈین افواج اتر کر سارے محاذوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ جموں خالی رہ جانے کی وجہ سے بھارت نے وہاں اپنی اچھی خاصی عسکری قوت جمع کر لی تھی اور اپنی پشت پر حملے کے خوف سے مکمل محفوظ بھارتی فوجیں بریگیڈیئر عثمان کی کمان میں برق رفتار پیش قدمی کرتی سارے کشمیر میں پھیل رہی تھیں۔

کشمیر کی گلیاں محلے مجاہدین آزادی کے مورچے بن چکے تھے۔ انہیں قدم قدم پر زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور ابھی تک بھارتی حکومت بھی عملاً اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ جموں و کشمیر پر اپنی مکمل گرفت کا اعلان کر سکے۔ یہ سنگین حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ اب منتشر اور غیر تربیت یافتہ مجاہدین آزادی کے مختلف گروہوں کو براہ راست انڈین فوج سے ٹکر لینا پڑے گی۔

معروف برطانوی فوجی ادارے سینڈز ہرسٹ کے تربیت یافتہ جنرل طارق کو جو دوسری جنگ عظیم میں عملی حصہ لے کر ڈی ایس او کا تمغہ حاصل کر چکا تھا، لڑنے اور لڑوانے پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس نے برما میں دریائے ایراودی کے کنارے فرنگی جرنیلوں سے بھی اپنی مردانگی کا لوہا منوا لیا تھا۔ اسے اس تلخ حقیقت کا احساس تھا کہ جموں سے ہماری توجہ ہٹ جانے کے باعث بھارت نے وہاں اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخائر وافر جمع کر لیے تھے۔ جنرل جانتا تھا کہ باقاعدہ فوج کے ہر جوان کے پاس ایک سو راؤنڈ ایمونیشن ہوتا ہے۔ سو راؤنڈ فی جوان بریگیڈ ریزرو ہوتا ہے اور سو راؤنڈ فی جوان ڈویژن ریزرو۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود تھی کہ بھارت میں اسلحہ بنانے کی فیکٹریاں کام کر رہی ہیں۔ اگر دس ہزار مسلح قبائلی کو فی جوان ایک مہینے کیلئے سو

راؤنڈ بھی دیئے جاتے تو تین مہینوں کیلئے اس لشکر کو کم از کم 30 لاکھ راؤنڈ درکار تھے جبکہ لبریشن کمیٹی کا کل سرمایہ محض 2 لاکھ راؤنڈز تھا جن سے کم از کم آدھے ان قبائلیوں کو درکار تھے جو سری نگر کی طرف بڑی تیز رفتاری سے پیش قدمی کر رہے تھے۔

جنرل طارق نے اپنی تمام تر توجہ اب سری نگر کی طرف مرکوز کر دی تھی کیونکہ اب وہ سوائے اس محاذ کے اور کسی محاذ سے کوئی توقع نہیں رکھ سکتے تھے۔

آج بھی وہ اسی بات کا جائزہ لینے سری نگر کی طرف جا رہے تھے کہ قبائلی مجاہدین نے جو اسلحہ سری نگر پر قبضہ کرنے کے لیے مانگا تھا، وہ انہیں ملا بھی ہے یا نہیں۔ دن کے وقت کشمیر میں سفر کرنا قریباً ناممکن ہو چکا تھا کیونکہ سارا دن مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں بھارتی طیارے مجاہدین کے اڈوں اور شہری آبادیوں پر گولہ باری کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے شام ڈھلے کوہالہ سے سرحد کو عبور کیا۔ 20 میل تک ان کا سفر جیپ میں خاموشی سے جاری رہا۔ سڑک کے بائیں کنارے پر دریائے جہلم کی سرکش موجیں آزادی کے نغمے الاپتی ان کی ہم سفر تھیں۔ دونوں اطراف پھیلا گندمی اور سبز سلسلہ ہائے کوہ ایک شان تمکنت سے ایستادہ، آزادی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ پہاڑی ڈھلوان پر بچی درختوں کی قطاریں اور ان کے پتوں پر رقص کناں ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں اب شہدائے آزادی کے مقدس لہو میں غسل کرنے لگی تھیں۔

کوہساروں کے طویل سلسلے اس امر کے غماز تھے کہ ان کے دامن میں بسنے والے کسانوں، گڈریوں، باغبانوں اور فوجیوں نے ان کی لاج رکھی ہے۔ یہاں کے مکینوں نے اپنی کم سامانی، نارسائی اور کمتری کو خاطر میں لائے بغیر مادر گیتی کی صدا پر لبیک کہا اور اپنی زمین، کھیتوں، کھلیانوں، دریاؤں، کوہساروں اور ندی نالوں کی عصمت کی پاسداری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ وہ جان سے گزر گئے، لیکن اپنے لہو کے چراغ جلا گئے تاکہ ان کی روشنی میں آنے والی نسلیں آزادی سے پروان چڑھتی رہیں۔

یہاں دشمن کی مدافعت کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا اور دور دور تک پھیلے جھونپڑوں اور کچے مکانوں کے مکین اب اس قابل ہو گئے تھے کہ آزاد فضاؤں میں سکھ کا سانس لے سکیں اور ایک باوقار زندگی ان کا حصہ بنے۔

............☆☆☆............

مظفر آباد تک راستے میں بھی ہولناک اور پراسرار سکوت طاری رہا، لیکن مظفر آباد پہنچتے ہی ایک ہلچل اور گہما گہمی انہیں نظر آئی۔ لاریوں میں ٹھسے قبائلی مجاہدین جنگ کشمیر میں شرکت کرنے کے لیے سری نگر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ تازہ کمک تھی جسے بارہ مولا پہنچ کر جنگ میں شمولیت اختیار کرنا اور وہاں پہلے سے موجود مجاہدین کا ساتھ دینا تھا مگر سری نگر سے قریباً پچاس میل دور اوڑی کے نزدیک پل ٹوٹا ہوا تھا۔

یہ پل پسپا ہوتی مہاراجہ کی فوج نے پٹھانوں کی یلغار کی رفتار سست کرنے کے لیے توڑ دیا تھا، لیکن مقامی مجاہدین نے فوراً اس کا حل تلاش کر لیا۔ انہوں نے پہاڑوں کے درمیان قریباً ڈیڑھ میل لمبی کچی سڑک بنا کر پیش قدمی کرتے مجاہدین کی یہ مشکل حل کر دی۔

اس راستے سے نکل کر قبائلی عقابوں کی طرح مہاراجہ کی (اپنی دانست میں محفوظ) فوج پر جھپٹے اور وہاں بمشکل ہی کوئی خوش قسمت فوجی جان بچا کر بھاگ پایا تھا۔ ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ ان کے محاذ پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈوگرہ فوج وہاں سے پسپائی اختیار کر لیتی تھی۔

ڈوگرہ فوجی ''مقابلہ'' نہیں ''مدافعت'' کر رہے تھے تا کہ وہ محفوظ طریقے سے پسپا ہوتے ہوئے سری نگر تک پہنچ جائیں اور ان کا کم از کم جانی نقصان ہو اور وہاں سے تازہ کمک حاصل کر کے وہ دوبارہ پوری شدت سے قبائلی مجاہدین پر حملہ آور ہوں۔

مظفر آباد سے قریباً اسی میل دور ''وادی کشمیر کا دروازہ'' بارہ مولا واقع ہے جس کا زیادہ تر رقبہ میدانی ہے۔ یہ شہر سیاحوں کی جنت تھا، لیکن بھارتی فضائیہ کی پچھلے دو روز کی بمباری اور پسپا ہوتی ڈوگرہ فوج نے اسے آثار قدیمہ کے کھنڈرات میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ مجاہدین یہاں 26 اکتوبر کو پہنچ گئے تھے اور 35 میل دور واقع مہاراجہ کا محل سری نگر میں دریا کے کنارے بانہیں پھیلائے ان کا منتظر تھا۔ بھاگتی ہوئی خوفزدہ ڈوگرہ افواج میں ہرگز اتنا دم خم باقی نہ تھا کہ وہ ان کے آڑے آئیں۔ منزل نظروں کے سامنے تھی، حوصلہ مضبوط، مورال بڑھا ہوا اور دشمن پر کاری ضرب لگانے کا بہترین موقع میسر تھا، لیکن جاہ و منصب کی خواہش کا برا ہو کہ اس نے ان سربلندوں کے بڑھتے قدم وہیں روک لیے۔

تاریخ حریت کا وہ سیاہ باب 26 اکتوبر 1947ء کی شام یہاں لکھا گیا جو ہمیشہ آزادی پسندوں کو خون کے آنسو رلائے گا۔

میجر خورشید انور نے جو قبائلی مجاہدین کا کمانڈر تھا، جب سری نگر کو پکے ہوئے پھل کی طرح قبائلی مجاہدین کی گود میں گرتے دیکھا تو کمزور انسانی فطرت کا شکار ہو کر خود غرضی کی دلدل میں پھنس گیا۔ اس نے مجاہدین کو وہاں منصوبہ بندی کا بہانہ کر کے روک لیا اور خود کشمیری لیڈروں کو یہ پیغام بھیج کر وہاں بلایا تا کہ وہ اسے آ کر بتائیں کہ نو آزاد مملکت کی بندر بانٹ میں اسے کتنا حصہ ملے گا اور کشمیر کی حکومت میں اس کی پوزیشن کیا ہو گی؟

دو دن اس سودا بازی اور سیاست گری کی نذر ہو گئے اور 28 اکتوبر کو جب اسے ہوش آیا تو ایک سو طیارہ بردار جہازوں میں ٹھسی بھارتی فوج اس کے تصوراتی پایہ تخت سری نگر اور بارہ مولا کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

مجاہدین نے حسب روایت جان توڑ حملہ کیا۔ یہ حملہ 29 اکتوبر کی شام کو کیا گیا، لیکن اب مقابلے پر بہترین اور جدید ہتھیاروں سے لیس مسلح فوج تھی جسے زبردست فضائی برتری حاصل تھی۔ حملہ پسپا کر دیا گیا اور پٹھان اپنے زخمی اور لاشیں ساتھ لے کر پیچھے ہٹ آئے۔

جب جنرل طارق سری نگر پہنچے تو لڑائی اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔ سارا شہر فائرنگ کے دھماکوں سے گونج رہا تھا، لیکن محاذ جنگ ابھی دور تھا۔ انہوں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور اس سڑک پر آگے بڑھنے لگے جو سری نگر کو جاتی ہے۔

یہ خدشہ ان کے ذہن میں پھن پھیلائے کھڑا تھا کہ اس سڑک پر بھارتی فوج بھی قابض ہو سکتی ہے کیونکہ ابھی صورت حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ ان کو آخری اطلاع یہی دی گئی تھی کہ شہر کے باہر دور اوپر کے پہاڑوں میں جنگ جاری ہے۔ وہ جیپ کی بتیاں بجھائے ہوئے اب آہستہ آہستہ چلتے بارہ مولا سے 10 میل آگے آ چکے تھے، پھر ایک جگہ رات کے اندھیرے میں جلتے الاؤ کی روشنی نے انہیں رک جانے پر مجبور کر دیا۔

تجدید عہد

رات کے دوسرے پہر لالٹین کی بتی کی لو اس نے بڑھا دی تھی اور بے چینی سے نو وارد کا منتظر تھا۔ بالآخر وہ لمحہ بھی آ گیا جب اسے دروازے پر مخصوص دستک سنائی دی۔ نو وارد نے دروازے کو ایک خاص انداز سے تین مرتبہ بجایا تھا۔

''کون؟'' ممدو گوجر نے دروازے کی جھری سے منہ لگاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''مہمان'' جواب میں ایک لفظ کے سوا اسے اور کچھ سننے کو نہ ملا۔ دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے اگلا کوڈ دہرایا۔ ''کہاں سے آنا ہوا؟''

''جموں'' دوسری طرف سے پھر ایک ہی لفظ پر اکتفا کیا گیا۔

ممدو نے دروازے کی کنڈی گرا دی۔

''صاعقہ'' نو وارد نے کہا جس کا سارا چہرہ سیاہ رنگ کے کپڑے میں ڈھکا تھا۔

''صاعقہ'' ممدو گوجر نے پکارا اور آنے والے نے ''السلام وعلیکم'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنا چہرہ ننگا کر دیا۔

''امیر خان'' بے اختیار ممدو کے منہ سے نکلا۔

''ممدو...... میرے یار!'' امیر خان اس سے بغل گیر ہو گیا۔

......دونوں ہی اس حسن اتفاق پر خدا کے شکر گزار تھے۔ آج قریباً سال بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی...... آخری ملاقات ممدو کو کل کی طرح یاد تھی۔ دونوں انڈین آرمی سے اکٹھے فرار ہو کر برما میں سبھاش چندر بوس کی ''آزاد فوج'' میں شامل ہوئے تھے۔ جہاں جاپانیوں نے ٹریننگ دے کر انہیں واپس ہندوستانی فوج کو سبوتاژ کرنے اور وہاں سے اطلاعات حاصل کر کے ''جاف'' (جاپان انٹیلی جنس) کو پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ دونوں نے اپنا کام کلکتہ کی گودی میں کام کرنے والے مزدوروں کا بھیس بدل کر بڑے شاندار طریقے سے انجام دیا تھا یہیں سوئے اتفاق سے نبی خان صوبیداروں سے ٹکرا گیا جو نگر نگر گھوم کر سبھاش چندر بوس کی طرز پر مسلمان افسروں کی مدد سے ایک انقلابی فوج تشکیل دینے کے خبط میں مبتلا تھا۔ نبی خان جموں کا رہنے والا تھا۔ جلد ہی وہ آپس میں گھل مل گئے۔ نبی خان کی جہاندیدہ نظروں نے جانے ان میں کیا دیکھ لیا تھا کہ وہ انہی کا ہو کر رہ گیا۔

ہر روز شام کے بعد وہ لوگ ایک پارسی کے چھوٹے سے ہوٹل کے محفوظ کیبن میں اکٹھے ہوتے جہاں ایک عالم کی سیاست زیر بحث آتی۔ دونوں دوست یہ بات شدت سے محسوس کرتے کہ نبی خان جب عالم اسلام کا ذکر کرتا تو حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتا۔ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی

دگرگوں حالت زیر بحث آنے پر تو اس کی حالت دیدنی ہوتی۔

......اس کے اسی ''جذبہء وطنیت'' سے متاثر ہو کر ایک روز جب امیر خان نے اس کے سامنے ''آزاد ہند فوج'' کا ذکر چھیڑا تو نبی خان کے لئے جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

اس نے دو تین ملاقاتوں ہی میں دونوں کے جذبہ آزادی کو ایک واضح سمت کی نشاندہی کر دی اور ایک روز جب اس نے کھل کر اپنے مقاصد ان کے سامنے بیان کیے تو دونوں نے بے اختیار اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس پر اپنی طرف سے بہت بڑا انکشاف کیا کہ ان کا تعلق آزادی ہند فوج سے ہے، لیکن یہ کہہ کر تو نبی خان نے ان کے ارمانوں پر گویا اوس ہی ڈال دی کہ وہ انہیں روز اول سے جانتا ہے......اس نے اپنی بات کی سچائی کے ثبوت میں جب انہیں ان کے پچھلے آٹھ دس روز کے معمول سے آگاہ کیا تو دونوں اس کی خداداد ذہنی صلاحیتوں کے گرویدہ ہو کر رہ گئے۔

نبی خان نے ان کا باقاعدہ تعاقب کر کے نہ صرف کلکتہ میں ان کا ''رنگ'' ڈھونڈ لیا تھا بلکہ یہاں ان کے ''ذرائع'' بھی اس کی نظر میں آ چکے تھے۔

اس روز وہ تینوں پارسی کے تندور نما ہوٹل سے اٹھ کر ایک ''کھولی'' میں آن بیٹھے جو نبی خان کی ملکیت تھی۔ یہاں آ کر ان پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ نبی خان یہاں منوہر لال سوامی جی کے نام سے مشہور ہے اور ارد گرد کی قریباً سبھی ''کھولیوں'' میں اس کے چیلے رہتے ہیں وہ لوگ اس کی پوجا ایک گرو کے سمان کرتے تھے۔

''کسی بات پر حیرت کا اظہار نہ کرنا...... یہ بھی اپنی عادت بنا لو۔'' نبی خان بولا۔ ''یوں تو تم بھی سابقہ رائل ملٹری انٹیلی جنس (M-1) اور موجودہ جاپانی محکمہ جاسوسی کے تربیت یافتہ ہو، پھر بھی ممکن ہے کچھ باتیں تمہارے لئے چونکا دینے والی ہوں۔

......یہ تھا وہ پہلا آرڈر جو مستقبل میں کشمیر کو ڈوگرہ اور انگریز سامراج کی ریشہ دوانیوں سے نجات دلانے کا عزم لے کر میدان عمل میں اترنے والی تنظیم ''صاعقہ'' کے پہلے سربراہ نے انہیں دیا تھا۔

وہ ساری رات تینوں نے گفتگو اور بحث و تمحیص کی بھینٹ چڑھا دی۔ نبی خان نے انہیں اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد بھی کشمیر کے مسلمان کبھی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ الا یہ کہ وہ آزادی کے حصول کے لئے ہتھیار نہ اٹھا لیں۔

''میں نے پندرہ سرفروش اکٹھے کر لیے ہیں۔'' نبی خان نے انہیں بتایا۔

''کون ہیں وہ؟'' دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں......!'' نبی خان نے ایک لمبا سانس لیا۔ ''میں تمہیں یہی بتانے جا رہا تھا کہ ہماری تنظیم کی بنیادیں اس اصول پر رکھی جا رہی ہیں کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے تعارف حاصل نہیں کریں گے...... جہاں ایک دوسرے سے تعارف ناگزیر ہو وہاں البتہ دوسری بات ہے۔ پھر اصل بات تو ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد ہے اس کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے کہ کچھ کرنے سے پہلے ہی تنظیم اپنی موت آپ نہ

مر جائے؟ یہ سوچنا میری ذمہ داری ہے کیونکہ جن لوگوں کے خلاف ہم نبرد آزما ہونے جا رہے ہیں' میں نے یہ فن جاسوسی اور تخریب کاری انہی کے درمیان انہی کی سرزمین پر رہ کر انہی سے سیکھا ہے۔"

......دونوں ہونقوں کی طرح نبی خان کا چہرہ تک رہے تھے جو اس لمحے انہیں کسی اور ہی دنیا کا پراسرار بندہ نظر آ رہا تھا۔

"ہاں دوستو! ہم چونکہ مستقبل میں ایک نیا اور اٹوٹ رشتہ قائم کرنے جا رہے ہیں' اس لئے تمہیں کسی حد تک اپنا تعارف ضرور کرواؤں گا میں نے گستاپو ایم۔ آئی اور رائل انڈین انٹیلی جنس سبھی کے لئے کام کیا ہے' لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ میں دشمن کا داؤ اسی کے خلاف استعمال کرنے کے فن سے آگاہی حاصل کر سکوں اور آج جب مجھے قدرت نے کسی قابل کیا ہے تو جان سے گزر جانے کا عزم لے کر............ برصغیر کی گلی گلی کوچے کوچے میں ان طالع آزماؤں کی تلاش کر رہا ہوں جو اپنوں اور پرایوں کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہیں مگر جن کے دل تو زندہ ہیں' لیکن جن کی تلواریں زنگ آلود اور بازو شل ہو چکے ہیں۔"

رخصت کے وقت جب تینوں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنا تن من دھن مادر کشمیر کے لئے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ لے کر نذر کرنے کا حلف اٹھایا تو صاعقہ کے کمانڈر نے انہیں کہا تھا۔

"آج کے بعد میں تمہیں اس بستی میں کبھی نظر نہیں آؤں گا۔ تم یہ بھی بھول جانا کہ نبی خان نام کا کوئی آدمی تم سے کبھی ملا تھا۔ ہاں فی الوقت تمہیں اسلحہ حاصل کرنا ہے جس کے حصول کی ترکیب سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے اور آئندہ تم جہاں بھی رہو گے' میں خود ہی تم سے رابطہ پیدا کر لوں گا۔"

پھر تینوں نے ہاتھ پھیلا کر خدائے بزرگ و برتر کے حضور کامیابی کی دعا کی اور ایک دوسرے کو "فی امان اللہ" کہہ کر اپنی اپنی راہ لی۔

............☆☆☆............

دوسری جنگ عظیم اور آزاد ہند فوج کے خاتمے تک نبی خان نے صاعقہ کے جانثاروں کی صرف ذہنی اور جسمانی تربیت ہی کی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ عملی میدان میں کود پڑے اس نے صاعقہ کے مختلف کمانڈروں کو ذمہ داریاں سونپ کر انہیں مادر کشمیر کی طرف روانہ کر دیا۔

تقسیم ہند کے اعلان تک صاعقہ کے مٹھی بھر سرفروش سارے کشمیر میں پھیل کر اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے۔ فی الوقت انہیں 'انتظار کرو اور دیکھو' کی پالیسی اپنانے کی ہدایت کی گئی تھی اس کے بعد انہیں اپنی اصلیت کو چھپائے رکھتے ہوئے مقامی آزادی پسندوں کے ساتھ عملی جدوجہد میں شامل ہونے کا حکم ملا۔ یہ ان لوگوں کی تربیت تھی جس نے انہیں جلد ہی مجاہدین کے نزدیک ممتاز کر دیا۔

انہیں سربلندوں میں سجاول اور حسین خان بھی شامل تھے۔

ممدو کو جب پونچھ میں قیام کرنے اور ڈوگرہ چھاؤنی کو دودھ سپلائی کرنے کا حکم ملا' تب اسے علم ہوا کہ مجاہدین میں حسین خان کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے' لیکن ابھی تک اسے حسین خان سے براہ راست ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حسین خان کو یہاں اس کی موجودگی کا علم نہیں ہے اسے تو صرف سجاول کا پتہ تھا یا پھر اس درخت کی سیدھ میں شمال کی جانب رکھے بڑے سے پتھر کا' جو شہر سے باہر جنگل کو جانے والے

راستے کے ایک کونے میں تیز رو نالے کے کنارے تن تنہا جانے کب سے کھڑا اپنے نگر کے مکینوں کی بے بسی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ سجاول کی طرف سے اسے جو پیغام زبانی یا تحریر کی صورت میں ملتا' ممدو اسے بڑے سے پتھر کے نیچے دبا کر چلا آتا اور اگلے روز وہیں سے دوسرا حکم وصول کر لیتا۔ انٹیلی جنس کا یہ محفوظ طریقہ جو وہ لوگ پیغامات کی منتقلی کے لئے استعمال کرتے ہیں' نبی خان نے ہی انہیں بتایا تھا۔

کبھی کبھی یہ پراسرار طریقہ اسے الجھانے لگتا' لیکن جب اس کے پردہ ذہن پر نبی خان کی شبیہہ اترتی تو اس کی ساری جھنجلاہٹ اور الجھن یکسر غائب ہو جاتی اور وہ پوری طرح مطمئن ہو کر اپنے کام میں جت جاتا اسے نبی خان سے ایک بے نام سی عقیدت ہو چلی تھی اور عقیدت کا یہ رشتہ ہر نئی صبح بیدار ہونے پر ممدو گوجر کو گہرا اور اپنے اندر ہی اندر دھنستا دکھائی دے رہا تھا۔

پچھلے دو ڈھائی سال میں اس کی ملاقات نبی خان سے بمشکل تین چار مرتبہ ہوئی تھی' لیکن اسے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے نبی خان کی پراسرار اور طلسماتی قوت کی حامل آنکھوں نے مسلسل اسے اپنی زد میں رکھا ہوا ہے۔

سجاول مقامی تھانے کا سپاہی تھا اور کبھی کبھی ممدو گوجر حیران رہ جاتا تھا کہ آخر سجاول نبی خان سے کیسے ٹکرا گیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر خود بخود مطمئن ہو جاتا کہ بظاہر نبی خان کے لئے کسی دوسرے عالم کی مخلوق سے کوئی تعلق پیدا کر لینا بھی کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔

اعلان آزادی سے پہلے ہی کشمیر کی سیاست کے دھارے نے جو اچانک پلٹا کھایا اور جس طرح انگریز اور ہندو کی ملی بھگت نے اسے پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی جھولی میں ڈال دیا تھا' اس بات نے اس کی نظروں میں نبی خان کی اہمیت کئی گناہ بڑھا دی تھی۔ اسے رہ رہ کر کلکتہ کی ساحلی آبادی کی وہ کھولی یاد آنے لگتی جہاں کبھی گورو منوہر لال نے اسے اور امیر خان کو ہو بہو مستقبل کی یہی تصویر دکھائی تھی۔

''ظالم کے اندازے کتنے صحیح تھے..........!''

..........☆☆☆..........

پچھلے دنوں جب وہ سجاول کا ایک خط رات کے اندھیرے میں اس پتھر کے نیچے رکھ کر آیا تھا تو اس کا جواب اسے تین روز بعد ملا تھا۔ اس دوران سجاول کی طرف سے ''رپورٹ'' بند ہو گئی تھی۔

..........اور اس خبر نے ممدو گوجر کو خاصا پریشان کر دیا تھا کہ سجاول گرفتار ہو چکا ہے۔ سجاول کی گرفتاری کے بعد سے اسے اپنے گرفتار ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ گو کہ سجاول کو اس کی قیام گاہ کا علم نہیں تھا' لیکن پونچھ کوئی ایسا بڑا شہر بھی نہیں تھا کہ اسے ڈھونڈا ہی نہ جا سکے..........ان کی تنظیم کے کسی باقاعدہ رکن کی یہ پہلی گرفتاری تھی۔

ممدو کو امید یہی تھی کہ اب اسے یہاں سے کہیں اور چلے جانے یا روپوش ہونے کا حکم ملے گا' لیکن یہ دیکھ کر وہ کچھ حیران اور پریشان بھی ہوا کہ اسے امیر خان کی آمد کا ''مژدہ'' سنا کر اس کو بتائے گئے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔

اور آج امیر خان آ گیا۔

''کہاں غائب رہے اتنے دن؟'' قہوے کی پیالی میں تیسری مرتبہ قہوہ انڈیلتے ہوئے اس نے اپنے دیرینہ دوست کو مخاطب کیا۔

''یہیں سری نگر میں.......... ! پھر یکا یک مجھے گلگت پہنچنے کا حکم ملا لمبی کہانی ہے یار پھر کبھی سناؤں گا۔'' اس نے گہری سانس لی اور یوں بیزاری کا اظہار کیا جیسے اس موقع پر وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

ممدو نے یہ بات محسوس کر لی تھی اسی لئے اس نے نہایت غیر محسوس انداز میں گفتگو کا رخ بدل کر کلکتہ کی باتیں شروع کر دیں۔ رات کا دوسرا پہر ہو چلا تھا' لیکن نیند دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے سے ''مطلب کی بات'' شروع کرنے کی توقع لگائے ہوئے تھے لیکن دونوں ہی جیسے گفتگو کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر ممدو گوجر نے ہی ہمت کی۔ ''مجھے مرکز کی طرف سے بڑی غیر مبہم سی ہدایات ملی ہیں تم شاید بہتر بتا سکو۔'' اس نے امیر خان کو مخاطب کیا۔

''ممدو.......... !'' امیر خان نے پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے الٹا ہاتھ مونچھوں پر پھیرا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی جسے وہ اب تک ختم نہیں کر سکا تھا۔ ''میرے ساتھ یہاں دس جانباز آئے ہیں آٹھ مقامی ہیں دو سرینگر سے۔ کل تم مجھے بھی اپنے ساتھ چھاؤنی لے جاؤ۔ مقامی ذرائع سے یہی اطلاع ملی ہے کہ رام سنگھ سجاول کو چھاؤنی میں لے آیا ہے۔

.... بظاہر تو وہ مسلمانوں پر اعتماد کرتا ہے' لیکن اصلیت کا علم اسے ہو چکا ہے اسے اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ پولیس میں موجود نوے فیصد مسلمانوں کے دل مجاہدین کے ساتھ اور زبانیں مہاراجہ کے ساتھ ہیں۔ خصوصاً زہراں اور شیرو کے فرار کے بعد سے تو اس کا انسپکٹر میر پر بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی موت کے بعد یہاں ہندو انسپکٹر کو لایا گیا ہے۔ حالانکہ عموماً یہاں مسلمان انسپکٹر ہی رہتا تھا' اور اگر رام سنگھ اسے تھانے میں رکھتا تو ہمارے لئے معاملہ زیادہ مشکل نہیں تھا' لیکن اب بات دوسری ہے۔'' اس نے رک کر لمبا سانس لیا اور اپنی کہی باتوں کا رد عمل ممدو کے چہرے پر تلاش کرتا ہوا دوبارہ گویا ہوا۔ ''ہمیں اصل میں دو کام کرنے ہیں ممدو بھائی۔''

ممدو جواب میں ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''ایک تو سجاول کو ان موذیوں کے پنجے سے نکالنا ہے اور حسین خان کی بات پوری کرنی ہے۔''

''کونسی بات؟'' ممدو نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس نے میجر رام سنگھ کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ پونچھ سے جلدی نہ چلا گیا تو وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔''

''لیکن اس کے لئے یہ کام اتنا مشکل..........''

''ہاں اس کے لئے یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔'' امیر خان نے اس کی بات کاٹی۔

''لیکن حالات اتنی تیزی سے بدل گئے ہیں کہ اس کے لئے اس معاملے کی طرف توجہ دینا اب ممکن نہیں رہا۔ اچانک ہی بھارتی فوج نے مداخلت کی اور نبی خان نے اسے جموں بلا لیا۔''

''ٹھیک ہے امیر خان۔'' ممدو کی آواز اس لمحے کچھ بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ ''بخدا تم کبھی مجھے پیچھے نہ پاؤ گے۔ میں اس راستے پر پیش آمدہ قیامتوں سے خبردار ہونے کے بعد ہی اس پر چلا تھا۔''

''میرے خیال سے اب تھوڑا آرام کر لیں' صبح اٹھ کر تم نے بھینسیں بھی دوہنی ہیں اور شاید آٹھ بجے تک دودھ بھی پہنچانا ہے۔'' امیر خان نے بالآخر کہا۔

''نیند تو اب ہے نہیں اور رات بھی بمشکل ایک پہر باقی ہوگی۔ خیر تم کہتے ہو تو کمر سیدھی کر لیتا ہوں۔'' اس نے اپنا دیوار سے لگا سر چارپائی پر رکھے سرہانے پر دھر لیا اور رضائی اوڑھ لی۔ اس کی مخالف سمت ویسی ہی ایک چارپائی پر بیٹھے امیر خان نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔

............☆☆☆............

پونچھ سے بڑی سڑک کے ذریعے بارہ مولا کی طرف سے کشمیر جانے کے بجائے انہوں نے ایک ذیلی راستہ اپنایا تھا اور اب وہ لوگ گلمرگ کے راستے سری نگر جا رہے تھے جہاں سے انہیں ایک خصوصی بندوبست کے بعد جموں کی طرف سفر کرنا تھا۔

اس خصوصی ''بندوبست'' کا علم سوائے حسین خان کے اور کسی کو نہیں تھا اور ابھی تک نبی خان کی طرف اسے ایسی کوئی ہدایت بھی نہیں ملی تھی کہ وہ ''صاعقہ'' کو مجاہدین میں متعارف کروائے۔ بسا اوقات اسے نبی خان کی جانب سے ایسے احکامات خاصی جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتے تھے' لیکن ایک تو اس نے نبی خان کی ''صاعقہ'' کے کمانڈر کی حیثیت سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ آج تک اس نے نبی خان کے جس فیصلے کو اپنی دانست میں غلط سمجھا' وہ خلاف توقع صحیح ثابت ہوا تھا۔

کبھی کبھی تو حسین خان کو اپنی سوچ سے وحشت ہونے لگتی تھی اور آج بھی اس پر کچھ ایسی ہی کیفیت سوار تھی اس نے خیالات کی یورش سے بچنے کے لئے اپنی سوچ کا رخ بدلا اور اپنے ساتھیوں پر نظر دوڑائی۔ وہ لوگ پچھلے تین دن سے متواتر سفر کرتے آ رہے تھے اور سری نگر کے باہر مقیم تھے۔ اپنا اسلحہ انہوں نے تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح اپنے گرم کپڑوں میں چھپا رکھا تھا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے تعاقب میں سفر کرتے یہاں تک پہنچے تھے۔ حسین خان کا ذہن نہ چاہتے ہوئے بھی ''شیرو'' پر اٹک جاتا تھا ایک عجیب سی خلش اسے کبھی کبھی کچوکے دینے لگتی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے شیرو کو اپنے ساتھ لا کر اس نے شیرو کی ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

رات خاصی بیت چلی تھی اور انہیں اپنے عقب سے کبھی کبھی رائفل یا اسٹین گن کے فائر ہونے کی آواز سنائی دیتی۔ رائفل کا دھماکہ اس امر کی نشاندہی کے لئے کافی ہوتا تھا کہ رات کی تاریکی میں بھی پٹھان اپنے شکار سے غافل نہیں اور گشت پر موجود سپاہیوں میں سے جو بدقسمت بھی ان کی رینج میں آ جاتا' اسے قید حیات سے نجات دلائے بغیر نہیں رہتے تھے۔

دور کہیں کسی بھارتی فوج کے سیکشن نے ''روشنی راؤنڈ'' فائر کیے۔ شاید انہیں حملہ آوروں کی کسی ''پٹرول پارٹی'' کا شک گزرا ہوگا اگرچہ وہ لوگ میدان سے خاصی دور تھے اور بالکل محفوظ' پھر بھی حسین خان نے اشارے سے سب کو کسی آڑ میں ہو جانے کے لئے کہا تھا۔ اس نے شیرو کو اپنے پاس بلا لیا...... دونوں اپنے ساتھیوں سے قدرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔

سری نگر کی سردی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی' لیکن مستقبل کے خدشات اور آنے والے حالات کے متعلق سوچ نے وہاں سردی کا احساس ختم کر دیا تھا۔ ان لوگوں کو یہاں آ کر علم ہوا تھا کہ انہیں یہاں سے بھیس بدل کر مختلف ٹولیوں کی شکل میں سفر کروایا جائے گا۔

ان کا بھیس کیا ہوگا؟ کون سا روپ دھارنا ہوگا انہیں؟ اس بات کا علم سوائے حسین خان کے اور کسی کو نہ تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' حسین خان نے اس کے چہرے پر سرسری نظر دوڑائی۔ ''کوئی یاد تو نہیں آ رہا؟'' اس نے بڑی شفقت سے شیرو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں چاچا.............. میں ابھی اتنا بزدل نہیں ہوا کہ............''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا شیرو۔ میں تمہیں ہی نہیں تمہارے اسلاف کو بھی جانتا ہوں۔'' حسین خان نے بڑی تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

لیکن شیرو محسوس کر رہا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ واقعی سری نگر پہنچتے تک اس کا جوش خاصا ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور اب اسے رہ رہ کر زہراں یاد آ رہی تھی۔ روانگی کے وقت اس کا برتاؤ زہراں سے کتنا ''جارحانہ'' تھا۔ اس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔ شیرو نے سوچا۔ ''اسے زہراں سے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ آخر وہ ایک عورت ہے اور ایسی عورت جو بدقسمتی سے شیرو سے محبت کرتی تھی۔''

''ہم لوگ جموں کب جائیں گے؟'' شیرو نے گفتگو کا موضوع بدلنے ہی میں عافیت جانی۔

''شاید کل رات کو روانگی ہو۔'' حسین خان نے اس کا فرار محسوس کر لیا تھا۔

''سنا ہے جموں کے پورے صوبے میں بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمان مارے گئے۔'' شیرو نے بری کڑوی سی بات کہہ دی۔

''ہاں.............! بدقسمتی سے وہاں ہمارے ساتھی منظم نہیں تھے اور ڈوگروں نے بھی ہماری کم تعداد سے فائدہ اٹھایا............ پاکستان کی طرف سے آنے والے سکھوں نے تو..............'' حسین خان نامکمل بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اس نے شہر کی سمت سے آنے والے راستے پر ایک ٹارچ کو تین مرتبہ مخصوص انداز سے جلتے بجھتے دیکھ لیا تھا۔ ''تم ذرا یہیں ٹھہرو.............. میں ابھی آیا۔''

.... وہ شیرو کو شش و پنج میں مبتلا چھوڑ کر تیزی سے اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا۔

حسین خان نے پستول کو فائرنگ پوزیشن میں کر کے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا' لیکن اس کا یہ ہاتھ اس کمبل میں چھپا ہوا تھا جس نے اس کے سارے جسم کو ڈھانپ کر سردی کا زور خاصا توڑ دیا تھا۔

دوسری جانب اس کی آمد کو شاید محسوس کر لیا گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے سامنے قریباً پندرہ گز دور دوبارہ اسی ٹارچ کو جل کر بجھتے دیکھا۔ اس مرتبہ ٹارچ سے اسے بائیں سمت اشارہ کیا گیا تھا۔

ابھی وہ بمشکل دس گز ہی آگے بڑھا تھا جب اس کے عقب میں ایک تیز سرگوشی گونجی۔

''ہالٹ!''

حسین خان انہی قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فرنٹ کہنے ہی پر اکتفا کیا تھا۔ ہاتھ کھڑے نہیں کیے تھے۔

''پہچان......؟'' وہی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''مسافر......!''حسین خان نے زیر لب کہا۔

''منزل......؟''سوال ہوا۔

''نامعلوم......!''اس نے اگلا کوڈ دہرایا۔

''صاعقہ......؟''اس کے عقب میں بولنے والا مطمئن ہو کر اس کے سامنے نمودار ہوا۔

''صاعقہ......؟''حسین خان نے پستول جیب میں رکھ کر اپنا ہاتھ تھامنے کے لئے آگے بڑھا دیا۔

دونوں چاند کی ملگجی روشنی میں ایک دوسرے کی شکل با آسانی دیکھ سکتے تھے ان کے عقب میں اب فائرنگ کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔شاید قبائلیوں نے رات کے اندھیرے ہی میں سری نگر کے مضبوط دفاع پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سری نگر کا بے قاعدہ اور کئی میل لمبا دفاعی پر یمیٹر بھارتی فوج کی مکمل گرفت میں تھا اور اس کی ابتدائی تین پلٹنوں نے جو اپنے ساتھ بھاری توپ خانہ لے کر آئی تھیں'بارہ مولا سے اس سمت آنے والی سڑک پر تھوڑے فاصلے پر رکاوٹیں کھڑی کر کے دفاعی مورچے قائم کر لئے تھے۔ان مورچوں کا تحفظ بھارتی توپ خانے کی فیلڈ گنیں کر رہی تھیں۔

نووارد حسین خان کے لئے اجنبی تھا۔اسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ''صاعقہ''اپنے قدم مضبوط کر رہی تھی اور اب نا آشنا چہرے بھی اس میں نظر آنے لگے تھے۔

''میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں پونچھ کے جیالوں نے جس دلیری کا مظاہرہ کیا ہے'اس نے سارے کشمیر کے مسلمانوں کا مورال بلند کر دیا ہے۔''

شکریہ دوست۔ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اپنی اپنی جگہ کوئی بھی کمی نہیں کر رہا۔''حسین خان نے جواب دیا۔

''نبی خان اور آپ کے دوسرے ساتھی آپ کے منتظر ہیں۔راستہ محفوظ ہے۔اطمینان سے چلے آئیے۔''نووارد نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم ٹھہرو'میں اپنے ساتھی کو لے کر آتا ہوں۔حسین خان نے نووارد سے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں میں موجود تھا۔''میں شیرو کے ساتھ جا رہا ہوں۔''اس نے اپنے گرداگرد بیٹھے کشمیری مجاہدین سے خطاب کیا۔''تم لوگوں کو پیش آمدہ حالات کے متعلق ہدایات دی جا چکی ہیں۔ہم لوگ پونچھ سے یہاں تک اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر آئے ہیں۔ہماری نیتوں کا خدا گواہ ہے اگر میرے ساتھ دھوکہ ہو جائے اور تمہاری طرف آنے والوں میں شیرو یا میں شامل نہ ہوں تو بزدلوں کی طرح ہتھیار پھینک کر گرفتار نہیں ہونا۔لڑتے ہوئے بارہ مولا کی طرف پسپا ہو جانا۔اگر دشمن اتنا موقع بھی نہ دے تو اپنے شمال کی سمت پسپائی کرتے ہوئے عقب سے بھارتی فوج کو جا لینا۔اس طرح تمہارا مرنا بھی انشاء اللہ مبارک ثابت ہوگا۔بخدا اگر تم میں سے کوئی نامراد بن کر لوٹا تو اپنی ماؤں بہنوں کو تم مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہو۔وہ تمہیں کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گی......................فی امان اللہ۔''وہ شیرو کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے کی چادر میں رینگ گیا۔

اس نے شیرو کو بھی صرف''مقامی مجاہدین''کا حوالہ دیا تھا۔''صاعقہ''سے باقاعدہ تعارف کی ذمہ داری اس نے نبی خان ہی پر ڈالی تھی۔

نوواردان کے آگے آگے چل رہا تھا اور دونوں اس کے پیچھے دبے قدموں محتاط اور خبردار چلے آ رہے تھے۔ سری نگر کی گلیاں، محلے مہاراجہ اور بھارتی فوجیوں کے ساتھ ساتھ اب جعلی شیر کشمیر شیخ عبداللہ کے قائم کردہ ''امن بریگیڈ'' کے رضا کاروں سے بھی جنہیں ''ہوم گارڈز'' کا نام دیا گیا تھا، اٹے نظر آنے لگے تھے ساری رات وہ لوگ مقامی غیر مسلموں کی حفاظت کے لئے ان کے گھروں اور کاروباری مراکز کے گرد اگرد مسلح گشت کرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف کشمیر کے ہر اس علاقے میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ان کے سروں کی فصل بڑی بے رحمی سے کٹ رہی تھی اور کشمیر کا بناسپتی شیر سری نگر کے مسلمانوں کے سامنے نام نہاد امن اور بھائی چارے کا ڈھنڈورا پیٹ کر اس خون مظلوماں کو ''قیام امن'' کے لئے ضروری قرار دے رہا تھا۔ تب کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ آخر قربانی کے بکرے بے گناہ مسلمان ہی کیوں بنیں؟ اگر امن کی کالی ماتا کو خون کی بھینٹ چڑھانا ضرور ہی تھا تو کیوں نہ ان کشمیری پنڈتوں اور ڈوگروں کا بلیدان دیا جائے، جو ظالم ہوتے ہوئے بھی مظلوم تھے۔

علی الصبح جب کشمیر کے ننگے حسن پر چھائے بدبختی کے کہرے کی چادر میں سے سورج کی لہو رنگ کرنیں اپنا راستہ بنانے کی سر توڑ کوششیں کر رہی تھیں اور کسی نزدیکی شوالے کا گھنٹہ زور زور سے بج کر فضا میں پھیلی نحوست کا چار چاند لگا رہا تھا تو سری نگر کے ایک گنجان آباد علاقے ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ میں بنی بظاہر ایک بیکری کی دکان کے باہر سردی میں ٹھٹھرتے تین کشمیری مجاہد اپنے سر بلند عزائم کو عملی روپ دینے کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دکان کے دروازے پر بنا ایک چھوٹا سا چوکور لکڑی کا تختہ اپنی جگہ سے پھسلا۔ کسی پر تفکر ماتھے پر پھیلی ہوئی گہری لکیروں تلے گھنی بھنوؤں میں دھنسی دو سرخ آنکھوں نے بیرونی ماحول کا جائزہ لیا۔ ''نوواردوں'' سے خفیہ الفاظ کا تبادلہ کیا اور مطمئن ہونے کے چند ہی لمحے بعد دروازہ کھول کر انہیں نگل لیا۔

..........☆☆☆..........

پونچھ مجاہدین کے مکمل محاصرے میں تھا اور عملاً شہر میں انہی کی حکومت قائم تھی۔ صرف دفاعی نوعیت کے اہم مقامات اور جیل تھانے وغیرہ ابھی تک ڈوگرہ سامراج کی گرفت میں تھے۔

..........شہر کے عین وسط میں قائم ایک عارضی چھاؤنی کے باہر دو کشمیری گوجر جن کے کندھوں پر دودھ کے پیتل کے بڑے بڑے برتن رکھے تھے، آ کر ٹھہر گئے۔

''سلام صاحب جی.....؟'' ممدو گوجر نے بیرل کے سامنے اونگھتے سکھ حوالدار کو مخاطب کیا۔

''اور سنا بھئی ممدو۔ کیا حال ہے۔'' دودھ میں پانی ڈالا یا ابھی ڈالے گا؟'' پہرے پر موجود حوالدار نے حسب معمول رٹے رٹائے فقرے دہرائے۔

''مہاراج جی! ساری زندگی حرام نہیں کھایا۔ اب تو قبر میں ٹانگیں لٹک رہی ہیں۔'' ممدو نے ہمیشہ والا جواب دہرایا۔

''اوئے یہ کون ہے تیرے ساتھ'' حوالدار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی اہمیت جتائی۔

''رشتے دار سردار جی اپنا۔ ادھر جموں میں تھا بے چارہ۔ میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ڈر کر میرے پاس بھاگ آیا ہے۔''

ممدو نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

''اوئے ادھر ہی کہیں مرکھپ جاتا۔ سالو! اب تمہارا پاکستان تو بن گیا ہے' پھر یہ مسلے یہاں کیوں مرنے آ رہے ہیں۔ سیالکوٹ کیوں نہیں چلے جاتے؟'' حوالدار کے سامنے کھڑے سنتری نے مداخلت کی۔

ممدو نے محسوس کیا کہ اس کی بات سن کر حوالدار کو دکھ ہوا۔ ''رلیا رام! زیادہ بک بک نہ کیا کر۔ فوجی بن فوجی اور ڈسپلن سیکھ۔ جب افسر کسی سے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں بکواس نہیں کیا کرتے...... میں نے بھی پندرہ سال فوجی نوکری کی ہے' جھک نہیں ماری اگر تیری سیاست بند نہ ہوئی تو سالے پٹھو لگوا دوں گا۔ یاد رکھیو......!'' حوالدار نے سنتری کو اس بری طرح لتاڑا کہ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''شما کردو حوالدار جی۔'' اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ باندھے۔

''جا یار ممدو۔ اس سالے براہمن کی اولاد نے تو سارے موڈ کا صبح ہی صبح بیڑہ غرق کر دیا۔ جانے باقی سارا دن کیسے بسر ہو گا؟'' سکھ حوالدار نے ممدو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ سردار جی۔'' امیر خان نے جو اس کے پیچھے تھا' حوالدار کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا جو سنتری کو رائفل سیدھی کر کے فوجیوں کی طرح پہرہ دینے کا حکم دے رہا تھا۔

ان کا رخ چھاؤنی کے میس کی طرف تھا۔ راستے کے دونوں اطراف میں فوجی ٹرک کسی بھی خطرناک اور ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار کھڑے تھے۔ ان کے گرد اگرد سردی سے ٹھٹھرتے ڈوگرہ فوجی اپنی رائفلیں دونوں ٹانگوں کے درمیان کھڑی کیے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ زور زور سے رگڑتے ہوئے ان میں سے بجلی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میس کے باہر ہی انچارج دوارکا داس اس کا منتظر تھا۔ ''آؤ میاں۔ رات کیا چڑھا لی تھی؟ آنکھیں بڑی چڑھی ہوئی ہیں۔'' اس نے بغیر دعا سلام کے ممدو پر حسب سابق طنز کیا۔

''توبہ توبہ مہاراج جی!'' ممدو نے دودھ کا برتن برآمدے میں رکھتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''کس حرام شے کا نام لے دیا صبح ہی صبح۔ وہ تو بھائی جموں سے آیا تھا بے چارہ۔ ادھر حالات ذرا خراب ہی ہیں ہم دونوں رات گئے تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے بڑی دیر بعد ملے ہیں نا۔'' ممدو نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے امیر خان کے تعارف کے مرحلے سے بھی جان چھڑا لی۔

''ابے کیا بات کرتا ہے جموں کی؟'' کس کی مجال ہے کہ وہاں سر اٹھائے؟ اپنی بھارتی سینا آ گئی ہے وہاں۔ وہ تو یہاں سالے مسلے اکڑتے پھرتے ہیں ورنہ تو سارے کشمیر میں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ممدو کے کندھے پر حسب عادت زور سے ہاتھ مارا اور گویا ہوا۔ ''بس بیٹا! دو چار روز ہی کی بات ہے۔ پھر دیکھنا یہاں بھی فوج کے پہنچتے ہی سب سالے ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ان لوگوں کو علم تھا کہ ممدو گوجر مسلمان ہے۔ وہ اسے کٹر نیشنلسٹ کشمیری سمجھتے تھے اور بلا تکلف اس کے سامنے راز کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ دوارکا داس نے بھارتی فوج کی آمد کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو علم تھا کہ مار دھاڑ کرتی بھارتی سینا اب پونچھ اور راجوڑی کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ وہ لوگ راستے میں اپنی پوزیشن مستحکم کرتے اور ممکنہ یورش کو کچلنے کے امکانات پر مکمل نظر رکھنے کے بعد ہی آگے بڑھتے تھے تا کہ ان کا عقب مجاہدین کے حملوں سے محفوظ رہے۔ جہاں کہیں بھی

بھارتی فوج پہنچتی، سب سے پہلے وہ مقامی مسلمانوں میں سے سرکردہ اور پاکستان کے حمایتی افراد کو کسی نہ کسی بہانے صاف کر دیتی۔ اس کے بعد مضبوط مورچہ بندیاں قائم ہوتیں۔ مقامی نظم ونسق کا کنٹرول بھارتی فوج کا افسر سنبھالتا اور وہاں ''مارشل لاء'' کی سی صورت قائم کرنے کے بعد ہی وہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔

دودھ ماپنے والا پیمانہ اور خالی برتن وہ لوگ کچن کے باہر برآمدے ہی میں لے آئے تھے۔ ممدو گوجر تو ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا جبکہ امیر خان کی بے قرار نظروں نے ماحول کا گہرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی بے چین نظروں کا فوکس جلد ہی کچن سے دس بارہ گز دور بنی کوٹھڑیوں کی اس قطار پر فکس ہو گیا جہاں معتوب فوجیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ''اگر سجاول یہیں زیر عتاب ہے تو اسے اس وقت ان ہی کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں ہونا چاہیے'' اس نے سوچا۔

ٹھٹھرا اور سہما ہوا سورج اب پونچھ کی پہاڑیوں اور مرغزاروں پر کرنیں بکھیرنے لگا تھا۔ برآمدے کے سامنے سورج کی پہلی کرنوں کا رقص جاری ہو چکا تھا۔

''بھائی صاحب......!'' گوجر نے اچانک گھوم کر امیر خان کو مخاطب کیا۔ ''یہاں پالے میں کھڑے کیوں اپنی قلفی جما رہے ہو؟ وہاں سامنے دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ابھی لالہ جی چائے پلاتے ہیں۔ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر پئیں گے۔ بڑا لطف رہے گا۔ کیوں لالہ جی مہاراج......!'' اس نے دوارکا داس کی طرف دیکھ کر خوامخواہ دانت نکال دیئے۔

''تم لوگوں کی مانگنے کی عادت نہ گئی۔'' دوارکا داس نے باورچی خانے میں کسی کو آواز دے کر ان کے لئے چائے لانے کو کہا۔ اس کے طنز کی کاٹ بڑی گہری تھی' لیکن کیا مجال جو ایک شکن بھی کہیں ممدو یا امیر خان کے ماتھے پر نمودار ہوئی ہو...... دونوں ''بے شرمی'' سے دانت نکال رہے تھے۔

پھر ممدو تو لالہ دوارکا داس کے ساتھ پاؤ سیر کا جوڑ توڑ کرنے لگا اور امیر خان آہستہ آہستہ کوٹھڑیوں کے آگے پھیلتی دھوپ کی طرف بڑھنے لگا۔ دن کا اجالا پھیلنے اور ''ناشتے'' کا وقت ہونے کی وجہ سے اسے اپنے قرب وجوار میں کہیں کوارٹر گارڈ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شاید ان لوگوں کو کم از کم یہاں کسی ''غیر معمولی صورت حال'' کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں تھا۔

کوٹھڑیوں سے کچھ فاصلے پر فوجی ضرور آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے' لیکن اس طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ امیر خان بڑی بے تابی سے اس احاطے میں گھسنے کے مواقع تلاش کر رہا تھا' لیکن کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کسی بھی وقت کسی کے اس طرف آ نکلنے سے اندر داخل ہونے اور کوٹھڑیوں میں جھانک کر دیکھنے کے تمام مواقع ضائع ہو جاتے اور تیزی سے بدلتی صورت حال کے پیش نظر کسی بھی گھڑی کچھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ ''پھر خدا جانے ایسا موقع میسر بھی آئے گا یا نہیں۔'' وہ بڑی کشمکش و پیچ میں تھا۔

سامنے برآمدے میں اسے ممدو گوجر کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں دوارکا داس کا دھیان اسی طرف لگائے رکھنے پر صرف کر رہا تھا۔ محض ایک لمحے کے لئے امیر خان نے کچھ سوچا' پھر اس کے قدم بے اختیار اسی کوٹھڑیوں والے احاطے کی طرف اٹھ گئے۔

اس احاطے کے تین اطراف میں کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سامنے کی سمت اندر جانے کا راستہ ہونے کی وجہ سے خالی تھا اور وہاں دروازہ نام کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلے شاید یہ کوٹھڑیاں گھوڑوں کے اصطبل کا کام دیتی ہوں گی' لیکن اب ڈوگرہ فوج نے انہیں ''کوارٹرز'' میں بدل دیا تھا اور یہ سیل سزا یافتہ قیدیوں کے لئے مخصوص ہو گئے تھے۔

امیر خان نے ازار بند ڈھیلا کر لیا تھا اور بظاہر وہ پیشاب کرنے کے ارادے سے اس طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف بنے دس سیلوں میں سے نو خالی تھے، آخری سیل جو ایک قطار کے کونے پر بنا تھا' وہیں امیر خان کی مراد بر آئی' جب سجاول کو اس نے کوٹھڑی کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔

......اس کے ہونٹ تشدد کی وجہ سے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ہونٹوں کی سطح پر بعض جگہ اب بھی سیاہ رنگ کے خون کے دھبے جمے صاف نظر آ رہے تھے...... چہرے پر پڑے نیل اب سرخی مائل سے سیاہی مائل ہو رہے تھے اور چہرے کی سوجن کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنی آنکھیں بھی زور لگا کر کھلی رکھنی پڑتی تھیں۔ کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں جسم پر لٹک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ٹپکتی وحشت پر نظریں ٹھہرتی نہیں تھیں' لیکن اس کی آنکھوں کی چمک ابھی ماند نہیں پڑی تھی، جوں کی توں باقی تھی۔

''سجاول!'' امیر خان کراہا۔

سجاول اس کی آواز پر چونکا اور اسے یوں آنکھیں مل کر دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ ''خدائے بزرگ و برتر کی قسم! میجر رام سنگھ پر ایسی ''صاعقہ'' گرے گی کہ اس کے گھناؤنے عزائم سمیت اسے بھسم کر ڈالے گی۔'' اس نے سجاول کے نزدیک آتے ہی کہا۔ ''صاعقہ'' دشمن کا مقدر ہے۔ سجاول کے لہجے کا وقار بھی اس کے عزم کی طرح قائم دائم تھا۔

بمشکل ایک منٹ کے بعد ہی دونوں میں ایک منصوبہ طے پا چکا تھا۔

......گفتگو کے خاتمے تک امیر خان نے شلوار کا ازار بند ہاتھوں میں پکڑے رکھا تھا' پھر وہ اسی پوزیشن میں آگے بڑھ گیا اور جب وہ فراغت پا کر کھڑا ہوا تو ایک سنتری اس کی طرف رائفل تانے اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

............☆☆☆............

جنرل طارق رکنے یا افسوس کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ رات کے دوسرے ہی پہر بارہ مولا سے روانہ ہو گیا۔ اس کی گاڑی کا رخ سری نگر کی طرف تھا جہاں اب قبائلیوں نے حملے شروع کر دیئے تھے، لیکن بہت وقت ضائع کرنے کے بعد۔

بریگیڈیئر عثمان کی قیادت میں بھارتی پلٹنیں دھڑا دھڑ کشمیر میں اترنا شروع ہو گئی تھیں۔ کشمیر تک زمینی راستے سے آنے کا معاملہ ہوتا تو شاید وہ لوگ کبھی اتنی جلدی کامیابی حاصل نہ کر پاتے، لیکن پاکستان کے برعکس بھارت کے حصے میں ایک مضبوط، منظم اور مکمل ایئر فورس آئی تھی۔

رائل انڈین ایئر فورس بظاہر تو برطانوی ہوائی فوج کا بیڑہ تھا' لیکن 45ء کے بعد سے ہندوستان کی حد تک اس پر عملاً حکمرانی بھارتی غیر مسلموں کی تھی۔ مسلمان کے نعرہ پاکستان نے جب حقیقت کا روپ دھارنا شروع کیا تو چانکیہ کی روحانی اولاد نے اسی وقت سے اس مسلم مملکت کی

تباہی کا سامان کرنا شروع کر دیا تھا جو ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔

ایک سازش کے تحت جس میں ان لوگوں کو فرنگیوں کی مکمل آشیر واد حاصل تھی، ہندوستان بھر کے قریباً تمام ایئر ہیڈ کوارٹرز، سلیکشن سینٹرز اور بھرتی کے دفاتر ہندو افسران کے قبضے میں دے دیئے گئے۔ تمام بھارتی افسران نے اس بات کا عزم کر رکھا تھا کہ وہ کسی مسلمان کو پائلٹ نہیں بننے دیں گے۔ انگریز افسران تک ہمیشہ غلط اطلاعات پہنچائی جاتی تھیں۔ 1946ء تک ایئر فورس کے تمام میسوں میں ایئر مینوں کے لئے ایک ہی کھانا پکتا تھا اور گوشت حلال ہو کر آتا تھا' لیکن 1946ء میں جب مسلم لیگ نے عروج حاصل کیا اور کانگریس کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ پاکستان بن کر رہے گا تو ہندو سکھ ایئر مینوں نے ہڑتال کی دھمکی دے کر اپنے لئے ''جھٹکے کا گوشت'' منگوانا شروع کر دیا اس بات پر احتجاج کرنے والے مسلمان ایئر مینوں کا کورٹ مارشل ہوا اور ان میں سے بیشتر کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔

برصغیر میں فضائی تربیت کے لئے دو مراکز قائم کیے گئے۔ ابتدائی تربیت کے لئے انبالہ اور اعلیٰ تربیت کے لئے جودھ پور، تقسیم ملک کے بعد یہ دونوں فضائی تربیتی مراکز بھارت کو مل گئے جہاں ٹریننگ سے متعلق تمام ضروری اور جدید ترین آلات موجود تھے۔

ایک سازش کے تحت قریباً تمام اہم اسکواڈرن بھارتی ہوائی اڈوں پر منتقل کر دیئے گئے تھے۔ ابتداء میں پاکستان کو چند ٹمسٹ طیارے دے کر ٹرخا دیا گیا۔ زمینی اسٹاف نہ ہونے کے برابر تھا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والے ایئر فورس کے ملازمین کی تعداد کو جنوبی ہند کے دور دراز اسٹیشنوں پر ڈیپوٹ کر دیا گیا تھا اور ملک تقسیم ہوتے ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچنا بھی ان کے لئے مسئلہ بن گیا تھا۔

سوائے پشاور کے جہاں مسلمان افسران زیادہ تعداد میں تھے' باقی تمام فضائی اڈوں مثلاً ماری پور، ڈرگ روڈ، چک لالہ، رسالپور وغیرہ ویران پڑے تھے۔ وہ ATC (ایئر ٹریفک کنٹرول) بلڈنگیں یا ایک آدھ ناکارہ طیارہ ہی چند ایسی نشانیاں رہ گئی تھیں جو ان کے ''ایئر فورس اسٹیشن'' ہونے کی نشاندہی کرتی تھیں۔ روانگی کے وقت غیر مسلم ایئر مین طیاروں کے سپیئر پارٹس نکال کر انہیں اپنے ساتھ ہی بھارت لے گئے تھے۔ اس طرح انہوں نے یہاں بچ جانے والے جہازوں کو عملاً ناکارہ کر دیا اور جو انجن صحیح سلامت بچے' انہیں وہ لوگ جاتے جاتے کباڑیوں کے ہاتھ فروخت کر گئے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مضبوط ہوائی اڈے' تربیتی مراکز' ہواباز اور طیارے منظم اور مضبوط نظام کے ساتھ بھارتی فضائیہ کے پاس موجود تھے۔ کشمیر میں ''مداخلت'' کا بہانہ ہاتھ آتے ہی ونگ کمانڈر مہر سنگھ تمام بھارتی فضائیہ کو حرکت میں لے آیا اور دیو ہیکل ڈکوٹا جہازوں میں بھر بھر کر بھارتی ہواباز اپنی آرمی کو سری نگر اور جموں پہنچانے لگے۔ ان فوج بردار طیاروں کی حفاظت کے لئے اس دور کے لڑاکا طیارے ہری کین اور اسپٹ فائر بھی ان کے ساتھ ساتھ پرواز کیا کرتے تھے۔

ایک طرف تو ایئر فورس نے بار برداری کا ذمہ اٹھایا اور دوسری طرف وہ لوگ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑے اور ان کی ''ناقابل علاج'' بمباری نے قبائلیوں کے قدم روک دیئے۔ ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ یہ لوگ اکثر گجرات کے نواحی علاقوں بلکہ مری تک پر بمباری کر کے چلے جاتے تھے۔ ہمارے پاس اول تو ان کے مقابلے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اگر پاس کچھ تھا تو پاکستان ایئر فورس ان کے خلاف کسی

کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتی تھی کیونکہ اس سلسلے میں حکومت کے دوٹوک اور سخت احکامات موجود تھے۔

جنرل طارق کی موجودگی بارہ مولا میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ انہیں علم تھا کہ مقامی غداروں نے یہ اطلاع آگے پہنچادی ہوگی اور صبح ہوتے ہی بھارتی فضائیہ کے طیارے چیلوں کی طرح آسمان کو بھر دیں گے اور وہ جنرل کو مارنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگادیں گے' لیکن سری نگر تک پہنچنا ان کے لئے بہت ضروری تھا کیونکہ ابھی تک محاذ کی صورت حال صرف کانوں سنی تھی' آنکھوں سے وہ اب دیکھنے جا رہے تھے۔

رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر سے دس میل دور مجاہدین کی ایک چوکی کے پاس رک گئے۔ جہاں قبائلی مجاہدین اگلے روز علی الصبح حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے یہیں پہنچ کر جنرل کو ''اندرون خانہ'' حالات کا علم ہوا اور اس تلخ حقیقت کا ادراک بھی کہ اب قبائلی مجاہدین کا مقابلہ ڈوگرہ فوج سے نہیں بلکہ بھارتی مسلح افواج سے ہے۔ جس نے ہوائی اڈے اور سری نگر پیریمیٹر کے گرداگرد مضبوط مورچہ بندیاں کر لی ہیں۔

جنرل نے وہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے آگے سفر کرنے کا قصد کیا اور صبح طلوع ہونے سے پہلے وہ چوتھے سنگ میل پر کھڑے تھے جہاں سے سری نگر صرف چار میل دور تھا۔

سڑک کے گرداگرد بھارتی فوج نے مورچے سنبھال لئے تھے۔ ان لوگوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر کے مورچے قائم کر لیے تھے۔ بڑا خطرہ انہیں سری نگر کے اندر سے حملے کا تھا' لیکن اس طرف سے شیخ عبداللہ نے انہیں مکمل اطمینان دلا رکھا تھا اور اپنے عقب کے اس طرح محفوظ ہونے سے بھارتی فوج کا مورال آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔

قبائلیوں نے سری نگر پر بجائے سامنے سے حملہ کرنے کے دائیں بائیں پہلو سے داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انہوں نے یہ طریقہ آزمایا بھی' لیکن قدرت بھی شاید ادھر مہربان تھی کہ سری نگر کے مضافات میں کھڑے پانی نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس طرح دشمن کو ایک قدرتی آڑ میسر آ گئی۔ مجاہدین پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے ایک انتہائی قدم اٹھایا۔ وہ لوگ بھارتی فوج کے بالکل سامنے سے حملہ آور ہوئے' لیکن سامنے سے آنے والے مارٹر اور ہیوی مشین گن کے فائر نے اور پیچھے سے آنے والے توپ خانے کی گولہ باری نے ان کے اس حملے کو بری طرح ناکام بنا دیا۔

جنرل طارق آنکھوں سے دوربین لگائے ایک قدرے محفوظ آڑ میں کھڑے میدان کارزار کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے قبائلی مجاہدوں کے پلٹنے اور جھپٹنے کے کئی مظاہرے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے' لیکن آج ان کے انداز ہی نرالے تھے۔ اپنے اسلاف کی روایت دہرانے کے لئے وہ جان سے بھی گزر رہے تھے۔

عین ان لمحات میں جب قبائلی مجاہدین پسپائی اختیار کر رہے تھے اور سورج سری نگر کی پہاڑیوں پر آگ بکھیر رہا تھا ہوائی اڈے کی طرف سے ''ٹمسٹ'' اور ''اسپٹ فائر'' نمودار ہوئے۔ ونگ کمانڈر مہر سنگھ بذات خود اس حملے کی قیادت کر رہا تھا اس کے علم میں محاذ پر جنرل طارق کی موجودگی آ چکی تھی اور اس بات کا علم بھی اسے تھا کہ جنرل کے اپنے بھی اس کی مدد کو نہیں آئیں گے اور یہاں موجود قبائلیوں کی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں یا ایک آدھ مشین گن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

اس نے فتح کے نشے کو دو آتشہ کرنے کے لئے بیک وقت قبائلیوں اور جنرل طارق مشترکہ شکار کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب اپنے اس فیصلے کو عملی

جامہ پہنانے کے لئے اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ حملہ آور ہوا تھا۔ جنرل طارق نے کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے لئے وہاں سے بارہ مولا کی طرف لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ابھی وہ اپنی جیپ کے نزدیک ہی پہنچے تھے جب آسمان بھارتی طیاروں کی چنگھاڑ سے لرزنے لگا۔

ونگ کمانڈر مہر سنگھ نے شاید ان کی جیپ پہچان لی تھی اور وہ پیش آمدہ فتح کے نشے سے سرشار اب خاصی نیچی پرواز کرتا جیپ پر راکٹ پھینکنے آ رہا تھا۔

جنرل کے لئے یہ کوئی نیا کھیل نہیں تھا۔ محض چند لمحوں میں وہ تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے طیاروں کی آواز سنتے ہی جیپ سے باہر چھلانگ لگائی اور ڈرائیور کو جیپ بھگا لے جانے کا حکم دیا۔ خود وہ لڑھکنیاں کھاتے نزدیکی درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

ونگ کمانڈر مہر سنگھ کا طیارہ اپنے پیچھے گولیوں کی قطار بناتا جیپ پر آ رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے نزدیک آنے کا موقع دیئے بغیر ایک جھٹکے سے موڑ کاٹا اور جیپ کو انتہائی خطرناک انداز سے بائیں طرف لڑھکا دیا' مہر سنگھ چکرا گیا۔ اس کو سامنے کی بلند و بالا پہاڑی اپنے نزدیک آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے بائیں ہاتھ لگی اسٹک کو اس نے یک دم سیدھا کر کے طیارے کو جھٹکے سے اوپر اٹھانا چاہا۔ طیارے کا منہ اوپر کو اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا ایک قبائلی مجاہد جانے کب سے اس ''ساعت'' کا منتظر تھا۔ اس کی رائفل کی تین گولیاں بیک وقت اسکرین سے ٹکرائیں' جن سے دو اسکرین کو توڑ کر مہر سنگھ کے جسم میں گھس گئیں۔

دماغ میں پھٹنے والی گولی نے اس کا سر توڑ دیا اور بھارت کا مایہ ناز ونگ کمانڈر جس نے کشمیر پرائیر فورس کا سایہ کر کے اسے مظلوموں کے ہاتھ جانے سے بچا لیا تھا' کوئی کارنامہ انجام دیئے بغیر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ ''لیڈر'' کی موت نے ''فارمیشن'' کے باقی طیاروں کو لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل طارق چھلانگ لگا کر جیپ میں جا بیٹھا۔ انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھالی تھی اور روانگی سے پہلے اس بات کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح وہ چند بکتر بند گاڑیاں یہاں تک لے آئیں اور ان میں سوار کر کے مجاہدین کو سری نگر میں داخل کر دیں تو شاید تاریخ کا دھارا اپنا رخ بدل لے۔ انہیں ہر صورت میں یہ بکتر بند گاڑیاں حاصل کرنا تھیں اور یہی ارادہ لے کر وہ راولپنڈی کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔

.........☆☆☆.........

نبی خان نے بذات خود ان کا استقبال کیا تھا۔ اس نے ان پچاس مجاہدین کو ''ہوم گارڈز'' کے لبادے میں جموں تک پہنچانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایک پلان اس نے حسین خان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں کو اب دو حصوں میں بٹ کر سفر کرنا تھا۔

نبی خان کی مسحور کن شخصیت کا جادو شیرو پر چل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نبی خان نے بالآخر اسے ''صاعقہ'' سے متعارف کروا دیا تھا اور تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے بعد جب دوسری طرف حسین خان ایک بھرپور نیند سے لطف اندوز ہو کر اب بیدار ہو چکا تھا' شیرو نے ''صاعقہ'' کے لئے مر مٹنے کا حلف اٹھا لیا تھا۔ اسے مرعوب کرنے کے لئے یہی بات کافی تھی کہ حسین خان تنظیم کا خاصا پرانا جاں نثار ہے جس نے آج تک اپنی وابستگی کا کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا تھا۔

''میرا خیال ہے اب تم آرام کرو'' نبی خان نے اسے کہا۔ ''ہم لوگ شام کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔

''میں ذرا ''امراکدال'' تک ہو آؤں۔ ایک عرصہ ہو گیا سری نگر میں آئے ہوئے۔ لوگوں کے خیالات بھی دیکھ لوں گا۔'' حسین خان نے نبی خان کی طرف دیکھا۔

''جیسی تمہاری مرضی' لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ حالات اب توقع سے بڑھ کر خطرناک ہو گئے ہیں اور دوپہر تک ہر صورت میں لوٹ آنا۔''

''فی امان اللہ'' کہہ کر حسین خان باہر نکل آیا۔

ان دنوں امراکدال کے بازاروں میں یہ بات عام تھی کہ شیخ عبداللہ کو دو کروڑ روپے اور کشمیر میں وزارت عظمیٰ کے عوض کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ پیش کش اتنی پرکشش تھی کہ شیخ کے لئے انکار کی گنجائش رہ ہی نہیں گئی تھی۔

............حسین خان امراکدال کے قہوہ خانے میں بیٹھا ریڈیو پر خبریں سن رہا تھا۔ سری نگر کے مسلمانوں کے لئے اب اس کے سوا اور کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا تھا کہ ہر روز بارہ بجے ریڈیو سے خبریں سن کر اپنا دل جلایا کریں۔

خبروں کے خاتمے پر حسب معمول قہوہ خانہ سیاسی اکھاڑہ بن گیا۔ بظاہر تو حسین خان ہونٹوں سے قہوے کی پیالی لگائے بیٹھا تھا' لیکن اس کا دھیان لوگوں کی گفتگو کی طرف تھا۔ اچانک وہ چونکا۔ ہوٹل کے دروازے سے اس کا دیرینہ رفیق قیوم داخل ہو رہا تھا جس نے سی آئی ڈی کے لئے اچھے خاصے کارنامے انجام دیئے تھے اور جو حسین خان کی اصلیت سے بھی واقف تھا۔

............حسین خان جانتا تھا کہ یہاں ہوٹل میں بھی یقیناً اس کے ساتھی موجود ہوں گے کیونکہ خصوصاً سری نگر میں ایسے حالات پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ اس نے چاہا کہ قیوم سے نظریں بچا کر نکل جائے اور اس ارادے سے وہ اٹھا اور ہوٹل کے کاؤنٹر کی طرف چل دیا' لیکن ابھی وہ کاؤنٹر پر پیسے دے کر گھوما ہی تھا کہ قیوم کی نظریں اس سے ٹکرا گئیں۔ ''تم............تم یہاں بھی آ گئے۔'' حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے قیوم اس سے مخاطب ہوا۔ ''اب زیادہ چالاکی نہ دکھانا۔'' اس نے اپنے ہولسٹر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے حسین خان کو حکم دیا۔

حسین خان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ محض ایک لمحے کی غفلت بھی اسے لے ڈوبے گی۔ اس نے قیوم کو ہولسٹر میں ہاتھ ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ یہاں بھی وہ سرکاری وردی میں تو گھومنے سے رہا۔

بجلی کی سی پھرتی سے حسین خان نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈالا اور حیرت زدہ قیوم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' جب اس نے اپنے سینے کی طرف پستول کی نالی اٹھی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے یکے بعد دیگرے دو شعلے اس کی طرف لپکے۔ حسین خان کے نشانے کے متعلق دم توڑتے قیوم کو کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ خود حسین خان بھی جانتا تھا کہ ایک گولی ہی اس کے انجام کو کافی ہے' لیکن وہ قیوم کو اتنی مہلت بھی دینے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بھی اس کا نام لینے کے قابل رہ جائے۔ اس نے قیوم کے دل کا نشانہ لیا تھا اور یکے بعد دیگرے دونوں گولیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں ایک دوسرے سے محض دو انچ دور لگی تھیں آخری میز کے کونے میں بیٹھے قیوم بٹ کے دونوں ساتھیوں نے ریوالور نکالے لیکن انہیں اپنے ریوالور استعمال کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا کیونکہ اسی کمرے میں داخلے کے دروازے سے لگے ایک شخص نے کسی میکانکی عمل کے تابع ایک ساتھ ہی ان پر گولیاں برسائیں تھیں۔ دونوں کچھ کرنے کی حسرت دل ہی میں لیے ٹھنڈے پڑ گئے۔ ''حملہ آور'' حیرت زدہ اور سہمے ہوئے لوگوں کو کچھ سوچنے یا کرنے کا

موقع دیئے بغیر بڑی پھرتی سے باہر نکلا اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔

یہ نبی خان تھا جو حسین خان کی مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔

فائرنگ کی آواز پر لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔ انہوں نے پستول ہاتھ میں پکڑے کسی کو بازار میں بھاگتے دیکھا.............لیکن یہ سارا معاملہ پلک جھپکتے...........ہی رونما ہو گیا تھا اور ان پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ کسی نے قاتل کا تعاقب کرنا تو ایک طرف رہا' سی آئی ڈی کے دم توڑتے انسپکٹر......قیوم تک پہنچنے کی زحمت تک گوارا نہ کی اور پھر ہوٹل کا مالک ہی جرأت کر کے اٹھا۔

وہ قیوم کی سرکاری حیثیت سے واقف تھا۔ اس نے مزید ہمت کا مظاہرہ کیا اور مضروب پر جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔ قیوم کی نیم مردہ آنکھوں نے جب ایک سائے کو خود پر جھکتے دیکھا تو اس کے منہ سے بمشکل ''ح......ح......'' ہی نکل پایا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

حسین خان اس کا انجام دیکھنے کیلیے وہاں رکا نہیں تھا۔ قہوہ خانے کے گرد اگرد بڑھتے ہوئے ہجوم میں سے وہ بڑی تیزی سے راستہ بناتا بیکری کی دکان کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا اور جب وہ بیکری کی دکان تک پہنچا تو نبی خان اور شیرو کو اپنا منتظر پایا۔

''تمہاری خبر تم سے پہلے ہی تیز رفتاری سے چل کر ہم تک پہنچ گئی حسین خان......!'' نبی خان نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔

''الحمدللہ کہ......ایک غدار تو اپنے انجام کو پہنچا۔'' حسین خان نے اپنے کندھے پر دھری چادر کو ایک طرف رکھا اور سکون کی لمبی سانس لی۔

''انسپکٹر قیوم ہماری لسٹ پر تھا حسین خان۔'' نبی خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''جلد یا بدیر اس کو اپنے انجام تک پہنچنا ہی تھا۔''

''خس کم جہاں پاک۔'' شیرو قریب سے بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔ سی آئی ڈی انسپکٹر کی موت ان لوگوں کو چوکنا کر دے گی۔ ایک لحاظ سے تو یہ اچھی بات ہے کہ دشمن خوف زدہ ہو جائے، لیکن اس طرح بھارتی فوج ہوشیار ہو جائے گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' حسین خان بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہی تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں بیکری کی دکان سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے چہرے سردی کے بہانے قریباً ڈھانپ رکھے تھے۔ ان کی منزل سری نگر ہی کا ایک اور محلہ تھا جس کے ایک محفوظ مکان میں ''کشمیر ہوم گارڈز'' کے افسران کی وردیوں میں ملبوس تین سرفروش ایک پلاننگ کے تحت حسین خان اور شیرو کا انتظار کر رہے تھے۔

سورج ڈھلنے سے پہلے ہی وہ لوگ ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پونچھ سے آنے والے مجاہدین مختلف ٹولیوں کی شکل میں ہوم گارڈز کا روپ دھارے اپنے کمانڈر کے حکم کے منتظر سری نگر شہر میں موجود تھے۔

ان لوگوں کو تین مختلف ٹولیوں میں بٹ کر جموں کی طرف سفر کرنا تھا۔ وہ ہوم گارڈز کی جس کمپنی میں شامل ہوئے تھے، اسے جموں سے کچھ پیچھے ہی بٹوٹ نامی ایک صحت افزا قصبے میں پہنچ کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ یہاں سے ان لوگوں کو ''امن وامان'' قائم کرتے ہوئے جموں تک پہنچنا تھا۔

اگلے روز علی الصبح شیرو اپنے دس ساتھیوں کے ہمراہ ایک ٹرک میں بانہال کے سلسلہ ہائے کوہ کی طرف جا رہا تھا......ان کی کمانڈ ایک ڈوگرہ صوبیدار کے ہاتھ میں تھی اور ان لوگوں کو بٹوٹ جا کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ حسین خان اس سے الگ ایک گروپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

......روانگی سے پہلے نبی خان نے اسے سینے سے لگا کر اور اس کی پیٹھ تھپک کر کہا تھا۔ ''میرا دل گواہی دینے لگا ہے کہ کشمیر اب ضرور آزاد ہو جائے گا۔''

''انشاء اللہ......انشاء اللہ'' وہاں موجود بھی لوگ یک زبان پکارے۔

علی الصبح جب وہ لوگ بادامی باغ کی فوجی چھاؤنی سے روانہ ہو رہے تھے تو شیرو سرمئی اجالے کے پس منظر سے جھانکتے بانہال کے سلسلہ ہائے کوہ پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا۔ ''زہراں اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟'' کئی خیال بیک وقت اس کے ذہن میں آئے۔ اس نے سوچا۔ ''جب جموں سے وہ فاتح بن کر لوٹے گا تو اس کے ساتھ یقیناً پونچھ کو دشمن کے خونی شکنجے سے نجات دلا چکے ہوں گے۔ تب اس سے مل کر زہراں کتنی خوش ہو گی۔'' زہراں سے ملاقات کے تصور نے اس کی رگ رگ میں ایک نشہ سا بھر دیا۔ سرشاری اور سرمستی کی ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری ہوگئی۔

ذرا سی دیر میں پہاڑیوں کے دامن سے ایک سرد اور شفاف صبح طلوع ہونے لگی۔ برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر کرنوں کے الاؤ دہکنے لگے تھے۔ برف پر پڑنے کے بعد کرنوں کی چمک آنکھیں خیرہ کیے دیتی تھیں۔ سورج کی اولین کرنوں کے ساتھ ہی کونجوں کی ایک ڈار ان کے سروں پر سے دوسری طرف نکل گئی۔ شیرو نے اس وقت کونجوں پر نظریں جمائے رکھیں جب تک کہ وہ سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی دھند میں غائب نہ ہوگئیں۔

............☆☆☆............

''کون ہو تم؟'' سنتری نے رائفل امیر خان کی طرف چھتیائے ہوئے پوچھا۔

''م......م......مہاراج جی۔'' امیر خان ہاتھ باندھ کر گھگھیایا۔ ''میں ممدو کا بھائی ہوں۔''

''کون ممدو؟'' سنتری نے آنکھیں نکالیں۔

''وہ......وہ جی......وہ سامنے کھڑا ہے۔'' امیر خان نے خوفزدہ ہونے کی شاندار اداکاری کرتے ہوئے لنگر خانے کی طرف اشارہ کیا۔

سنتری نے ایک دو لمحے کچھ سوچا' پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ''چلو میرے ساتھ' کون ہے ممدو؟''

اس نے امیر خان کو آگے آگے چلنے کا حکم دیا اور خود گالیاں دیتے ہوئے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ رائفل پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس نے امیر خان کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اسے زوردار لات رسید کر کے اپنے غصے کو کسی قدر ٹھنڈا ضرور کر لیا تھا اور اچانک حملے سے کچھ ایکٹنگ کے بل بوتے پر امیر خان نے گرتے ہوئے باقاعدہ قلابازی بھی لگا دی تھی۔ پھر اٹھ کر دوبارہ ہاتھ باندھ کر گھگھیاتے ہوئے اس کے آگے آگے چلتے ہوئے اسے لنگر کے نزدیک لے گیا جہاں ممدو کھڑا اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

''ابے گدھے کہیں کے۔ تجھے کس نے کہا تھا وہاں مرنے کو۔'' ممدو نے سنتری کے کچھ کہنے سے پہلے ہی امیر خان پر چڑھائی کر دی۔

''میں وہاں پیشاب کرنے گیا تھا۔ تم نے اسی طرف تو......'' امیر خان نے قریباً روہانسی آواز میں کہا۔

''اب جاہل کی اولاد۔ میں نے اس طرف کہا تھا'' ممدو نے ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کیا جہاں فوجیوں کے لئے ٹائلٹ بنے ہوئے تھے۔ لنگر کے باہر موجود لوگ اور سنتری باری باری ان دونوں کے منہ دیکھ رہے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابھی ممدو غصے سے بے قابو ہو کر اسے دو چار چانٹے جڑ دے گا۔

''شما کرنا مہاراج جی۔'' وہ اس سنتری سے مخاطب ہوا۔ ''جاہل ہے کم بخت۔ کچھ نہیں پتہ اسے۔''

''اس کی جہالت تو ساری نکل جاتی مسلے۔'' سنتری نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''شکر کرو رات کا نہیں' دن کا وقت تھا ورنہ پہلے اسے گولی مارتا پھر اس کی لاش سے دریافت کرتا۔''

''لاشیں بولا نہیں کرتیں مہاراج جی۔'' ممدو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس کی اس بات پر سب نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور سنتری کھسیانا ہو کر وہاں سے واپس اس طرف روانہ ہو گیا جہاں سجاول ''صاعقہ'' کی موجودگی کا اشارہ پا کر خود کو نئے جنم میں سانس لیتے محسوس کر رہا تھا۔

..........☆☆☆..........

دودھ کے خالی برتن اٹھائے ہوئے دونوں جب اکٹھے ہی باہر نکل رہے تھے تو ان کے سامنے ایک تیز رفتار جیپ اندر داخل ہوئی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر میجر رام سنگھ گردن تانے بیٹھا تھا۔

......جیپ بڑی تیزی کے ساتھ ان کے قریب سے گزری تھی اور پھر پہیوں کے چرچرانے کی آواز سے دونوں ہی دہل کر رہ گئے۔ انہوں نے جیپ کو رک کر تیزی سے ریورس ہوتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔

اگر امیر خان اپنے ہوش و حواس قائم رکھ کر اچانک ہی پیچھے نہ ہٹ جاتا تو میجر رام سنگھ اسے کچل کر رکھ دیتا۔ اس نے دونوں کے بالکل آگے جیپ لا کر اس طرح کھڑی کی تھی کہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے میجر رام سنگھ سے ان کا فاصلہ بمشکل دو تین گز ہی رہ گیا تھا۔

رام سنگھ کی شکل پر نظر پڑتے ہی ممدو گوجر کا ہاتھ پہلے ماتھے تک گیا پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''ست سری اکال سردار صاحب۔'' وہ میجر رام سنگھ کو سردار صاحب ہی کہا کرتا تھا۔ امیر خان نے بھی اس کی تقلید میں یہی عمل دہرایا۔

''یہ کون ہے؟'' میجر رام سنگھ کی آواز میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ممدو گوجر کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ تیزی سے دوڑ گئی۔

''بھائی ہے میرا سردار صاحب۔'' اس نے اپنا لہجہ حتی المقدور ہمت کر کے نارمل رکھا۔

''پہلے کبھی دیکھا نہیں'' رام سنگھ نے اب اپنی نظریں امیر خان کی طرف گاڑ دیں جو کن انکھیوں سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ جموں میں رہتا تھا میجر صاحب جی'' ممدو گوجر کے حواس قائم تھے۔ ''اب بلوے کے بعد میرے پاس آ گیا ہے۔ اب یہی دودھ لے کر آیا کرے گا مہاراج جی۔ میں تو مال ڈنگر کی سیوا ہی کیا کروں گا۔ اسی لیے اسے لنگر خانہ دکھانے لایا تھا۔''

میجر رام سنگھ کے متوقع سوالوں سے بچنے کے لئے ممدو نے اپنی دانست میں پیش بندی کر لی تھی۔

''ہوں......!'' رام سنگھ نے ہنکارا بھرا ''اس کے بیوی بچے کہاں ہیں؟''

''میری طرح چھڑا چھانٹ ہے مائی باپ۔ ہم غریب لوگ شادیاں کہاں کرسکتے ہیں حضور۔ دو وقت کی اپنی ہی روٹی پوری ہو جائے تو لاکھ شکر ادا کرتے ہیں مولا کا۔'' ممدو کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

میجر رام سنگھ نے ٹکٹکی باندھ کر اسے گھورا' پھر کچھ کہے سنے بغیر اسی آندھی اور طوفان کی سی رفتار سے جیپ آگے بڑھا لے گیا۔

''یہی ہے وہ بھیڑیا۔'' ممدو نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''خدائے وحدہ لاشریک کی قسم! آج کے بعد پھر کوئی رات اس کی زندگی میں نہیں آئے گی۔ اس کی موت اتنی اذیت ناک ہوگی کہ بزدل راجہ کے محلات کی دیواروں پر بھی لرزہ طاری ہو جائے گا۔''

''ایسا ہی ہوگا میرے دوست۔ ایسا ہی ہوگا۔ بخدا ہم اسے کل کی مہلت نہ دیں گے۔'' ممدو نے شدت جذبات سے امیر خان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

دونوں اب چھاؤنی کے دروازے سے باہر نکل آئے تھے اور ان کا رخ ممدو گوجر کے گھر ہی کی طرف تھا۔

سلگتی آہیں

دونوں ایک تہہ خانے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔لالٹین کی روشنی نے ماحول کی پراسراریت کو دوچند کر دیا تھا۔

......پچھلے دوروز سے زہراں نے بمشکل اس سے دوتین فقرے ہی کہے تھے۔اس نے مسلسل خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور شرفو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیسے بہلائے۔

اس کے دوست نے زہراں کی ذمہ داری سونپ کر دراصل شرفو کو زبردست امتحان میں ڈال دیا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے یہاں تک کا سفر اس کے لئے طلسمات کا سفر تھا۔اس مختصر سے سفر میں اس کو اسرار و رموز کے کئی جہانوں سے آگاہی ہوئی تھی۔اس سے پہلے اس کی زندگی کا مقصد صرف تعلیم حاصل کرنا اور پھر کشمیر کو آزاد کروانا ہی تھا۔

لیکن آج......!

آج جب اس نے زہراں کو اتنے قریب سے دیکھا تو لاکھ ضبط کے باوجود وہ بے خودی کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔اس نے بہت عرصہ پہلے ایک دفعہ زہراں کو دیکھا تھا' تب وہ وہ ایسی نہیں تھی۔نہ اسے دیکھ کر یوں کبھی شرفو کو اپنے خون کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اس جذبے کو کن معنوں سے تعبیر کرے۔

کیا وہ زہراں کی محبت کا اسیر ہو گیا ہے؟ یہ خیال ہی اس کے لئے اتنا وحشت ناک تھا کہ اس کے لئے اس مفروضے پر سوچنا ہی عذاب دہ تھا۔شرفو نے چاہا کہ کسی طرح بھی اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر باہر نکال دے' لیکن جب کبھی اس نے یہ ارادہ کیا' ایک صدا اس کے اندر سے اٹھتی جو اسے منافق اور جھوٹے ہونے کا طعنہ دینے لگتی۔

......زہراں اس کے دوست کی منگیتر تھی۔وہ دوست جس نے شرفو کے لئے کبھی جان سے گزر جانے میں بھی بخل کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ایک ایک کر کے اسے تمام گزرے واقعات یاد آنے لگے تھے اور یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی' کل ہی کی بات تو تھی۔

''کیا میں اتنا کمزور انسان ہوں کہ انسانیت کی سطح سے بھی نیچے گر کر رہ گیا ہوں؟'' اس نے سوچا اور اسے خود پر رحم آنے لگا......اسے خود سے ایک لمبی ڈوئل لڑنا پڑی لیکن پاپی من تھا کہ اسے کسی پل چین ہی نہیں لینے دیتا تھا۔

''میں مر جاؤں گا' خود کو گولی مار لوں گا لیکن یہ شیطانی جذبہ کبھی مجھ پر غالب نہ آئے گا۔'' اس نے اپنے آپ کو کوسا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

''جہاں ان لوگوں کا قیام تھا یہ جگہ ابھی تک اس لئے محفوظ تھی کہ جنگ کا دائرہ ابھی محدود تھا' لیکن کسی بھی لمحے لڑائی یہاں تک پھیل سکتی تھی۔نورولی نے حسین خان کی خصوصی ہدایت کے پیش نظر اس بات کا خیال رکھا تھا۔کہ شرفو کو کسی ''حساس مقام'' پر جانے سے بچایا جائے۔اس نے

زہراں کی حفاظت کیلئے ایک بوڑھی عورت کو بھی وہاں رکھا ہوا تھا جو زہراں کا خیال اپنی بیٹیوں کی طرح رکھ رہی تھی...... لیکن زہراں......

زہراں تو جیسے اس عالم میں تھی ہی نہیں...... لالہ اور شیرو کی ماں کی موت نے اس کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر شیرو یہاں ہوتا تو کوئی اور بات تھی۔ شاید وہ اس کے زخموں پر اپنی محبت کا پھایا رکھ سکتا۔ یہاں کون تھا جو اس کے دکھ کو جان پاتا؟ ایک بوڑھی مجاہدہ تھی اور دوسرا شرفو اور جس طرح دن رات شرفو نے اس کا دل بہلانے کے لیے اپنے سے جتن کر ڈالے تھے، اس پر وہ دل سے شرفو کی عزت کرنے لگی تھی۔ اسے یہ نوجوان واقعی غیر معمولی نظر آ رہا تھا۔ چپ چاپ سا تنہا سا۔ ''یہ جنگ و جدل اس کے بس کا روگ کہاں تھا؟'' زہراں سوچتی لیکن پھر خود ہی اسے جواب مل جاتا کہ آج کشمیر کا جو سپوت ہتھیار نہیں اٹھا سکتا، وہ بے غیرت ہے۔ اس نے پچھلے دو روز سے یہاں درجنوں ایسے زخمیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا جن کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا محال تھا، لیکن لڑ رہے تھے۔

یہ شاید مجاہدین کا کوئی خفیہ مرکز تھا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد انہیں دوبارہ محاذ پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

.........☆☆☆.........

شرفو جب خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا تو اس غار نما کوٹھڑی کا سناٹا اسے ڈسنے کو آنے لگا۔ وہ بوڑھی عورت جو اس کی خدمت پر مامور تھی، تھوڑی دیر پہلے ہی حسب معمول نزدیکی گاؤں سے دودھ لینے چلی گئی تھی۔ ماحول کی یکسانیت سے اسے اب ہول آنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ اس وقت عموماً نورولی وہاں اس کی خیریت دریافت کرنے آیا کرتا تھا۔ وہ ہر ملاقات پر دو باتیں شیر محمد کے متعلق بھی اسے سنا دیا کرتا اور اتنے وثوق سے زہراں کا دل رکھنے کے لئے جھوٹ بولتا کہ وہ اسے بالکل اپنا جانے لگتی۔

زہراں کی نظریں دور اس راستے پر لگی تھیں جو شہر سے اس طرف آتا تھا۔ پھر اس نے حد نظر پر ایک نقطے کو ابھرتے دیکھا اور جب آنکھوں پر دونوں ہاتھوں کا سایہ کر کے اس سمت نظر جمائی تو نقطے نے مجاہدین کے مقامی کمانڈر نورولی کی شکل اختیار کر لی۔

زہراں کے دل کی دھڑکنوں نے اس کے ساتھ ہی اپنی رفتار تیز کر لی۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' اس نے زہراں کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں چاچا'' زہراں نے آج پہلی مرتبہ اسے روئے بغیر جواب دیا تو نورولی کو ایک گونہ اطمینان سا ہوا۔

''شیرو جلد ہی جموں سے لوٹ آئے گا۔ ابھی ابھی اس کے دستے کی طرف سے ایک مجاہد خبر لے کر آیا ہے۔ بس تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے بیٹی۔ پھر تم دیکھنا۔ ہم سب آزاد ہوں گے۔ یہ ہمارے پہاڑ، دریا، درخت، وادیاں، یہ فضائیں، ہمارا کشمیر جنت نظیر آزاد ہوگا۔''

......نورولی نہ جانے جوش میں اور کیا کیا کہہ جاتا' لیکن جلد ہی اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہو گیا اور وہ خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شرفو اسے اس طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے رائفل اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور گولیوں کے پٹے ایک دوسرے کو کراس کرتے ہوئے اس کے سینے پر نمایاں تھے۔

''میں اب یہاں نہیں رہوں گا چاچا'' اس نے نورولی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

''خیریت......؟''نورولی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس ماحول سے۔یوں بے عملوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے آخر میں کب تک بیٹھا رہوں گا...... میرا یہ مقام نہیں چاچا نورولی۔''

جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی کہ نورولی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں سمجھتا ہوں بیٹا''اس نے شرفو کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

''تمہارے جذبات مجھ سے چھپے نہیں'لیکن ابھی تمہیں اس لڑائی کے جہنم میں'جو ختم ہوتے نظر نہیں آ رہی'جھونکنے کا وقت نہیں آیا۔یقین جاننا جب کبھی ایسا موقع آیا'تمہارے سارے ارمان نکل جائیں گے۔ابھی انتظار کرو اور دیکھو۔''

''لیکن یہ ظلم ہے چاچا۔میرے ساتھی محاذ پر مر رہے ہیں اور میں یہاں روٹیاں توڑ رہا ہوں۔میرا دوست شیرو سینکڑوں میل دور جموں میں دشمن سے برسرِ پیکار ہے اور میں یہاں......''۔

......وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔شدت جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا۔نورولی نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا'پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر آگے بڑھ گیا۔

..........☆☆☆..........

شرفو نے اپنی دانست میں یہ باتیں تخلیے میں کہی تھیں'لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ جس پتھر کی اوٹ میں وہ دونوں محوِ گفتگو تھے'اس کے ایک کونے سے ٹیک لگائے زہراں نے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

''شرفو یہاں سے کیوں جانا چاہتا ہے؟''اس نے سوچا:''شاید میری وجہ سے'میری مسلسل سوگواری سے تنگ آ کر۔''وہ خود کو قصوروار گرداننے لگی۔''اسے کیا حق حاصل تھا کہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ رلاتی پھرے'لیکن اگر شرفو بھی چلا گیا تو کون اس کی غم گساری کرے گا یہاں اس بھرے پرے پونچھ میں وہی تو اس کا سب سے نزدیکی عزیز تھا۔باقی سب تو ایک ایک کر کے ختم ہو چکے تھے......ایک جو تھا اس کی خبر بھی نہیں تھی۔''نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نادیدہ طاقت کے انتہائی مجبور کرنے پر وہ خواب کی سی حالت میں چلتی ہوئی شرفو کے سامنے آن کھڑی ہوئی جو پہاڑی کے دامن میں بہتے چشمے کے کنارے ایک درخت سے ٹیک لگائے اپنی گود میں رائفل رکھے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتے پانی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''کیا مجھ سے بہت تنگ آ گئے ہو شرفو؟''اس کی آمد سے بے خبر شرفو اچانک اس کی آواز پر چونکا۔

اس نے گردن دوسری طرف موڑی تو زہراں کو اپنے سامنے پایا جس نے اپنے بکھرے بالوں کو سلیقے سے باندھ کر خود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا'لیکن جس کے جسم سے خارج ہوتی ہوئی برقی رو چادر چاک کرتی ہوئی باہر نکل کر شرفو کے دل و دماغ میں اندر ہی اندر گھستی چلی جا رہی تھی۔وہ پل دو پل سے زیادہ اس کے چہرے پر نظریں نہ جما سکا اور بے اختیار اس نے گردن جھکا لی۔

''میں نے تمہیں تنگ بھی تو بہت کیا ہے۔''زہراں نے خود ہی دوسری بات بھی کہہ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

شرفو نے جواب میں کچھ کہنا چاہا' لیکن اس کا تو جیسے حلق سوکھ کر رہ گیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اب کبھی بول ہی نہیں پائے گا۔ ''بتاؤ نا شرفو! کیا دکھ دیا ہے میں نے تمہیں؟ ایک تم ہی ہو اور یہاں کون ہے میرا؟''

شرفو کو زہراں کی بات نے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ زہراں کو کیسے بتاتا کہ پچھلے دو تین روز سے جو اذیت ناک جنگ اس کے اندر چھڑی ہوئی ہے 'اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ محاذ پر لڑتا ہوا شہید ہو جائے۔

''نہیں زہراں۔'' اس نے حوصلہ کیا ''اگر تم ایسی بات سوچو گی تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ میں تو صرف اس لئے کہہ رہا تھا کہ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہوں۔ میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ مجھے شرم آنے لگی ہے خود سے۔''

زہراں نے دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اب نمی تیرنے لگی تھی۔ ''شاید بے چارے کو میرے دکھ نے غمگین کر دیا ہے۔'' اس نے سوچا وہ اس سے زیادہ بہتر جواز ان آنسوؤں کا اور کیا تلاش کر سکتی تھی۔ ''دیکھو شرفو! تم شیرو کے دوست ہو اور مجھے بے حد عزیز' لیکن میں تمہارے لئے کوئی مجبوری نہیں بننا چاہتی۔ اگر تمہیں میری حفاظت کے خیال سے یہاں رکھا گیا ہے تو مطمئن رہو۔ تمہارے دوست کی غیرت پر کوئی جیتے جی ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔ جاؤ اور غاصبوں کو بتا دو کہ تمہاری رگوں میں بھی بڑا غیرت مند خون دوڑ رہا ہے اور تم آزادی کے لئے بہت کچھ قربان کر سکتے ہو' حتیٰ کہ اپنے دوست کا پیار بھی۔''

اس لمحے زہراں جوالا مکھی بن چکی تھی...... اس کی آنکھوں سے اٹھنے والے شعلوں کی لپیٹیں شرفو کے دامن دل تک آ پہنچیں تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے' زہراں پر وقار چال چلتی وہاں سے واپس ہو گئی۔

شرفو میں اتنی ہمت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ واپس جاتی زہراں کو نظر بھر کے دیکھ بھی سکتا۔

وہ چپ چاپ اٹھا، اپنی رائفل سنبھالی اور مجاہدین کے نزدیکی ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

..............☆☆☆..............

پونچھ خاصا بڑا شہر اور مہاراجہ کے دور میں ''پونچھ جاگیر'' کا دار الخلافہ بھی تھا۔

......اس جاگیر کے علاقے میں غیر مسلموں کی تعداد 39 ہزار اور مسلمان کی تعداد 3 لاکھ 82 ہزار تھی۔ اس جاگیر کے قریباً 31 ہزار مسلمان انڈین آرمی میں صرف اس مقصد کے لئے بھرتی ہوئے تھے کہ وہاں سے ٹریننگ اور اسلحہ حاصل کر کے مہاراجہ کے خلاف جہاد آزادی میں شامل ہوں۔

جنگ آزادی کے طبل پر پہلی ضرب بھی یہیں لگی اور یہی تھے وہ سر بلند جو جنگ آزادی کا ہر اول دستہ بنے انہوں نے محض چند ہفتوں کی جان توڑ لڑائی کے بعد ڈوگرہ فوج کے چھکے چھڑا دیئے اور اسے پونچھ شہر میں محصور کر کے اپنا حصار اس کے گرد اگرد تنگ کرنے لگے۔ اس دوران مہاراجہ کا بھارت سے الحاق رنگ لایا اور بھارتی فوج نے کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی محاصرہ کرنے والوں پر آتش و آہن کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔ شہر کے اندر موجود مسلمان چھاپہ مار کارروائیاں کر کے دشمن کو کہیں بھی جم کر بیٹھنے کا موقع نہیں دے رہے تھے جب کہ شہر کے باہر سے مجاہدین کے حملے مسلسل جاری تھے۔

بھارتی فوج کی آمد کے ساتھ ہی ڈوگروں کی قوت مدافعت جو دم توڑنے لگی تھی' نئی زندگی پا گئی اور انہوں نے شہر کے گرداگرد راکٹوں اور گولیوں کی بارش میں بارودی سرنگوں کا جال پھیلا دیا۔

پونچھ کی وہ چھاؤنی جہاں سجاول کو قید رکھا گیا تھا' کوئی باقاعدہ چھاؤنی نہیں تھی۔ وہاں تو ایسی درجنوں چھاؤنیاں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ دراصل وہ مراکز تھے جہاں سے نکل کر فوجی مجاہدین پر حملے کرتے اور پھر واپس آ جاتے تھے۔

وہ رات کشمیر کی سردیوں سے ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں سے ایک تھی جب پونچھ کے ایک محلے کے مکان سے ایک پراسرار سا سایہ برآمد ہوا۔ نووارد نے اپنے دائیں بائیں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لیا۔ اس کے گرداگرد اندھیرے نے اپنی سیاہ کالی چادر تان رکھی تھی اور اس پر مستزاد وہ کہرہ تھا جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

......دور کہیں دھماکوں کی مسلسل آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ دھماکے اب چونکہ روزمرہ کا معمول بن چکے تھے، اس لئے مقامی آبادی ان کی عادی بن گئی تھی۔ عموماً بھارتی توپ خانہ شام ڈھلتے ہی مجاہدین کے ٹھکانوں پر گولہ باری شروع کر دیتا۔ اس طرح وہ شہر میں مجاہدین کے ممکنہ داخلے کے لئے پیش بندی کر دیتے اور گولہ باری کا یہ سلسلہ صبح ہونے تک جاری رہتا۔

نووارد دبے پاؤں چلتا گلی کی نکڑ تک پہنچ گیا تھا۔ گلی کی نکڑ پر رک کر اس نے اپنے سامنے پھیلے گھور اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کی، لیکن سوائے گہری دھند اور سخت ٹھنڈک کے، جو اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تھی، اسے اور کسی ذی ہوش کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہی عمل اس نے گلی کی دوسری نکڑ تک جا کر دہرایا اور یہاں بھی اسے صورت حال جوں کی توں نظر آئی۔

یوں بھی اب رات کو چھاپہ ماروں کے ممکنہ جوابی حملوں کے پیش نظر فوج کی پٹرولنگ پارٹیاں گشت کے لئے ذرا کم ہی شہری آبادی کی طرف نکلا کرتی تھیں۔ خصوصاً مسلمانوں کے محلوں کی طرف تو شام کے بعد کوئی فوجی بھولے سے بھی پھٹکنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

مطمئن ہو کر نووارد اندر چلا گیا جہاں مکان کے ایک تاریک کمرے میں لالٹین کی انتہائی مدھم روشنی میں اس جیسے چار اور ہیولے اس کے منتظر تھے۔ دروازے کے قریب رک کر اس نے ہاتھ سے ایک مخصوص اشارہ کیا۔ ایک سائے نے نیم روشن لالٹین کو پھونک مار کر بجھا دیا اور باقی اپنا اپنا اسلحہ سنبھالتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان سبھوں نے گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اور اپنے چہروں کو انہوں نے اس طرح چھپا رکھا تھا کہ سوائے آنکھوں کے چہرے پر اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ سب اندھیرے کا حصہ بنے ایک دوسرے پر نظریں رکھے فوجی ترتیب سے مل کر چل رہے تھے۔ ایک نے ڈسچارجر کپ اٹھا رکھا تھا، دوسرے کے پاس ہلکی مشین گن تھی اور اسٹین گنیں تو سبھی نے اپنے اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھیں۔ ان کے چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سب کسی خصوصی تربیت یافتہ فوج کا حصہ ہیں۔

ممدو گوجر سب سے آگے تھا۔ وہ ان سب لوگوں کو بڑی حفاظت سے اس چھاؤنی تک لے آیا تھا جو ان کا ہدف بننے والی تھی...... چھاؤنی سے کچھ دور ہی رک کر وہ لوگ کسی اشارے کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک کی نظریں بار بار گھڑی کی سوئیوں پر جاتی تھیں ایک دو مرتبہ تو اس نے بے

چینی سے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا بھی تھا، پھر جیسے ان سب کی مراد بر آئی۔ دور اندھیرے کی چادر سے ایک شعلہ لپکا اور یکے بعد دیگرے وقفے وقفے سے جلنے کے بعد بجھ گیا۔

ممدو گوجر نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب بندروں کی طرح پھرتی سے چھلانگیں لگا کر وہاں سے غائب ہو گئے۔ انہوں نے ممدو گوجر کے گرداگرد پوزیشنیں سنبھال لیں، لیکن اس طرح وہ سب وہاں زمین پر موجود ہریالی ہی کا حصہ نظر آ رہے تھے...... ان کے غائب ہوتے ہیں ممدو گوجر نے اپنی جیبی ٹارچ سے وہی سگنل دیا تو تھوڑی دیر ہی بعد ایک سایہ وہاں موجود تھا۔

نزدیک پہنچ کر جب اس نے نووارد کو پہچان لیا تو ہاتھ کے مخصوص اشارے کیے "سیف سگنل" دیا اور اس کے ساتھ اٹھ کر قریب آ گئے پھر وہ سب نیم دائرے کی شکل میں نووارد کے گرداگرد بیٹھ رہے۔ امیر خان کی نظریں جب اس کے چہرے پر پڑیں تو اسے یاد آ گیا کہ اس نے آج صبح ہی جب وہ ممدو گوجر کے ساتھ چھاؤنی میں دودھ لے کر گیا، اسے دیکھا تھا لیکن کس روپ میں؟ یہ اسے یاد نہیں رہا تھا۔

"قریباً پچاس ساٹھ سپاہیوں کی ایک کمپنی میجر رام سنگھ کی قیادت میں وہاں موجود تھی۔ سجاول بھی وہیں ہے میں نے اس تک منصوبہ پہنچا دیا ہے۔" اس نے سرگوشیوں میں خطاب کا۔ پھر وہ انہیں فوجیوں کی پوزیشن سمجھانے لگا۔

"ٹھیک ہے دوست۔ اب تم چلو۔" امیر خان بولا۔

"خدا حافظ۔" کہہ کر نووارد جس طرح آیا تھا اسی طرح غائب ہو گیا۔

............☆☆☆............

اس کی روانگی کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی وہ لوگ بھی وہاں سے اٹھ کر چل دیے...... ان کی کمان امیر خان نے سنبھال لی تھی۔ مسلسل اندھیرے میں چلتے رہنے کی وجہ سے اب ان کی آنکھیں کسی قدر دور دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔

چھاؤنی سے کچھ ہی دور وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک نے جس کے ہاتھ میں ڈسچارجر کپ تھا، وہاں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ یہ جگہ چھاؤنی سے بمشکل پندرہ بیس گز دور تھی اور یہ امر ان کے لئے باعث رحمت تھا کہ یہاں سرچ لائیٹ موجود نہ تھی، نہ ہی چار دیواری میں کوئی "چیک پوسٹ ٹاور" بنایا گیا تھا۔ رک جانے والے کو امیر خان نے ہاتھ کے مختلف اشاروں سے سمجھایا اور باقی ساتھی اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

روانگی سے پہلے امیر خان نے اپنے پستول پر سائیلینسر فٹ کر لیا تھا اور وہ ان سب کے آگے چل رہا تھا۔ ان کا رخ اس دروازے کی طرف تھا جو ایک طرح سے چھاؤنی کا عارضی دروازہ تھا اور جس کے باہر بیریئر کے ایک کونے پر بنے لکڑی کے ایک کیبن میں دو سنتری سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ انہیں اصولاً تو اٹھ کر گشت کرنا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لی تھی کہ جب سے شیرو فرار ہوا ہے، میجر رام سنگھ لاکھ چوکنا اور ہوشیار رہنے کے باوجود کبھی رات کے وقت چھاؤنی کے بیرونی دروازے تک آنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیتا۔ اس کے ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی کہ...... اگر وہ رات کو کبھی کہیں باہر نکلا تو مجاہدین اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں گے۔

چاروں زمین سے چپکے کیڑوں کی طرح رینگ رینگ کر اس طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے کرالنگ کرنے کا انداز بھی بالکل کمانڈوز جیسا

تھا، پھران میں سے دوتو کٹ کر الگ ہوگئے جب کہ امیر خان اور ممدو اس لکڑی کے کیبن کی طرف رینگنے لگے جہاں آنے والی قیامت سے بے خبر دونوں سنتری رم کے اس بوتل سے جی بہلا رہے تھے، جو ان میں سے ایک کسی طرح جیب میں چھپا کر یہاں لے آیا تھا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کی متضاد سمت میں لیٹے تھے...... امیر خان کی نظریں لکڑی کے کیبن پر جمی ہوئی تھی اور دائیں ہاتھ میں پکڑے پستول کی نال اس طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسکیم کے مطابق جب ممدو گوجر نے کیبن کی اپنی سمت والی دیوار کو آہستہ سے ٹھوکر لگائی تو اندر بیٹھے دونوں سنتری یوں بدکے جیسے انہیں کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔

''کچھ سنا؟'' ایک نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

''ہاں...... ہاں! کچھ بات ضرور ہے۔'' دوسرے کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

''لیکن یار...... یہ اس وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔'' وہ بولا۔

''کہیں میجر صاحب ہی نہ ہوں۔'' دوسرے نے اندیشہ ظاہر کیا۔

دونوں کا خیال چھاپہ ماروں کی طرف نہ گیا کیونکہ ابھی تک ان کی دانست میں وہ لوگ اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ اس طرح چھاؤنیوں پر بھی گھات لگا سکیں۔ دونوں اسی خیال سے سہم گئے کہ میجر رام سنگھ تک ان کی ڈیوٹی سے غفلت کی رپورٹ پہنچ گئی ہے اور وہ خود اچانک چھاپہ مارنے آیا ہے۔

وہاں ایک کونے میں رکھے لکڑی کے بکس میں رم کی بوتل چھپا کر دونوں ہی اپنی اپنی رائفلیں سنبھالتے افراتفری میں باہر نکلے کہ اپنی ڈیوٹی پر مستعد ہو جائیں۔ امیر خان کو بس اتنا ہی کافی تھا کہ ہدف نظر آ جائے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کا نشانہ کبھی خطا ہوا ہو۔ وہ اندھیرے میں صرف آواز پر نشانہ لگانے کا ماہر تھا۔ محض دو سیکنڈ کے وقفے سے دو گولیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں لپکیں اور بوکھلائے ہوئے سنتری باری باری اپنے سینوں کے بائیں طرف ہاتھ رکھے کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ صرف ٹریگر دبنے کی ہلکی سی آواز دو مرتبہ امیر خان کے پستول سے برآمد ہوئی تھی۔

دونوں بجلی کی سی پھرتی سے دم توڑتے سپاہیوں کے سروں پر پہنچ گئے تھے اور اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا ان کے منہ سے کوئی آواز نکلے ،انہوں نے دونوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیئے۔

......پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ چاروں دیواروں سے چمٹے اندر داخل ہو رہے تھے اور ان میں سے ایک مشین گن والے کو ایک محفوظ پوزیشن میں لٹا کر آگے بڑھ گئے...... یہ مشین گن عین اس بیرک کے سامنے نصب کی گئی تھی، جہاں سپاہی سو رہے تھے۔ اب انہیں یہاں گشت پر موجود پہرے داروں سے نمٹنا تھا۔

امیر خان ان سے الگ ہو کر ان کوٹھڑیوں کی طرف نکل گیا جہاں سجاول کو اس نے صبح بند دیکھا تھا۔ ممدو گوجر اور اس کے دوسرے ساتھ نے بھی مشین گن والے سے ہٹ کر اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور اب ان سب کو محض اپنے اس ساتھی کے اشارے کا انتظار تھا جو انہیں اطلاع دے کر واپس یہاں آ گیا تھا۔

......بالآخر وہ ساعت سعید بھی آ گئی۔ بیرک کے دروازے کے سامنے لگے ''الارم'' کے پاس انہوں نے ایک سائے کو کھڑے دیکھا یہ الارم آگ لگنے کے خطرے کے پیش نظر بجایا جاتا تھا۔ سائے نے الارم کا بٹن دبایا اور انتہائی تیز ہوٹر بجنے لگا۔

......بیرک میں آگ لگنے کی اطلاع سے افراتفری پھیل گئی۔ سپاہی ہوٹر کی آواز پر چیختے چلاتے باہر لپکے جہاں ہلکی مشین گن نے انہیں چاٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان پر مختلف اطراف سے پوزیشنیں بدل بدل کر پھینکے گئے دستی بموں نے قیامت ڈھا دی۔ مجاہدین کے اس دلیرانہ شب خون نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ صرف ڈیوٹی پر موجود سپاہی ہی ایسے تھے جو کارروائی کر سکتے تھے، لیکن انہیں ابھی یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ حملہ آور ہیں کدھر؟ وہ گولی چلائیں تو کس پر؟

..........☆☆☆..........

امیر خان دیوار سے چمٹا اس طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے فائرنگ اور مرنے والوں کی چیخ پکار سے گھبرا کر باہر نکلتے گارڈ کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ بے چینی سے اس لمحے کا منتظر تھا جب یہاں موجود پہرے دار اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے یہاں سے باہر نکلے، لیکن اس کم بخت نے شاید باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی یا پھر اسے میجر رام سنگھ کی طرف سے بڑی سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں، وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

امیر خان کے اعصاب انتظار کی شدت سے تڑخنے لگے تھے۔ اس نے مزید انتظار کا عذاب مول لینے کی بجائے آگے بڑھ کر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا وہ کوٹھڑیوں کے کنارے تک آ گیا جہاں اس کا غازی مرد......سجاول خان زندگی اور موت کی سرحدوں پر لٹکا اپنے جیالے ساتھیوں کا منتظر تھا۔

ابھی تک امیر خان کو یہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آ رہا تھا، پھر جیسے خود بخود وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا اور گارڈ کی چالاکی کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں موجود پہریدار مضبوط اعصاب کا مالک ہے اور اپنے ساتھیوں کی طرح بوکھلا کر باہر بھاگنے اور حملہ آوروں کی گولیوں کا شکار بننے کی بجائے وہ یہاں چھپ کر حملہ آوروں کا منتظر تھا تاکہ اچانک اندر گھس آنے والوں پر نشانہ آزما سکے۔ اسے شاید سجاول خان کی خصوصی اہمیت کا احساس تھا اور یہ اندازہ بھی اس نے لگا لیا تھا کہ حملہ آوروں نے یہ سارا شور شرابہ محض سجاول خان کو دشمن کی قید سے رہا کروانے کے لئے پھیلایا ہے۔

امیر خان جاپان انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ اور پیشہ ور کمانڈو تھا۔ اس نے اچانک اپنے قدم آگے بڑھائے اور اپنے سامنے دو تین گز کے ایریا میں تیزی سے پاؤں زمین پر مارے جن سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا ہے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اسے ایک سیل کے سامنے بھاگ کر دوسری طرف جاتا ہوا گارڈ دکھائی دے گیا۔

آدمی خطرناک حد تک چالاک تھا۔ گو کہ وہ امیر خان کے دھوکے میں آ گیا تھا، لیکن اس نے بھی ایک چال چلی تھی اور ایک طرف سے دوسری طرف بھاگ کر تیزی سے اس طرح نکل گیا جیسے وہ بھی اپنی موجودگی کا دھوکہ دے کر وہاں آنے والے کو سامنے آنے پر آمادہ کر رہا ہو۔

پھر ان دونوں میں ایک دوسرے کو دھوکا دے کر مارنے کا مقابلہ شروع ہو گیا اور دو ہی منٹ بعد اس مقابلے کا اختتام امیر خان کے پستول

سے نکلی گولی نے کر دیا۔ گارڈ کے کندھے کے بائیں طرف دو گولیاں ایک دوسرے سے محض تین چار انچ کے فاصلے پر لگیں اور وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ہی پستول امیر خان کے ہاتھ سے جیب میں پہنچ گیا اور اس نے اسٹین گن سنبھال لی۔ بجلی کی سی پھرتی سے وہ اس کوٹھڑی کے سامنے جا پہنچا جہاں اس کے خیال میں سجاول کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب اس نے سجاول کو وہاں سے غائب پایا۔ امیر خان دیوانہ وار ایک ایک کوٹھڑی میں جھانکتا پھرا اور ہلکان ہوتا رہا۔ آخر ایک کوٹھڑی کے فرش پر اسے گوشت کا ڈھیر سا بنا نظر آیا، لیکن اس کے جسم میں جنبش نہیں ہو رہی تھی۔

امیر خان نے اسے آواز دے کر مخاطب کرنے کی بجائے اسٹین گن کا برسٹ مار کر کوٹھڑی کا تالا کھولا اور اندر جا گھسا۔ ان کا جاں نثار ساتھی بمشکل کروٹ لے کر سیدھا ہوا۔ امیر خان نے جھک کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں تو کھلی تھیں، لیکن چہرہ تشدد اور مار پیٹ سے بری طرح سوج چکا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ کر نیلے ہو گئے تھے۔

......اس لمحے جو کربناک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی، اس نے امیر خان کے جسم میں چنگاریاں دوڑا دیں۔ اس کی آنکھوں کی تیزی سے بدلتی رنگت کا احساس اتنے اندھیرے میں بھی سجاول خان محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے زمین پر گرے سجاول کو کندھے پر اٹھایا اور باہر کو لپکا، لیکن...... ابھی وہ کوٹھڑیوں والے احاطے کے بمشکل باہر ہی پہنچا تھا۔ کہ اسے ایک جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں، بڑی تیزی رفتاری سے اس طرف آتی دکھائی دی۔ اتنے اندھیرے میں اتنی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنا کسی عام آدمی کا کام نہیں تھا۔ یا تو یہ شخص پاگل ہے یا پھر جیپ اس کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔

''کہیں میجر رام سنگھ ہی نہ ہو؟'' اس نے سوچا کیونکہ اس افراتفری کے عالم میں وہی ایک شخص تھا جو اپنے ''شکار'' کی فکر کر سکتا تھا۔ اپنی دانست میں شاید وہ اس لیے اس طرف آ رہا تھا کہ حملہ آوروں کے سجاول تک پہنچنے سے پہلے پہلے یا تو وہ اسے گولی مار دے یا پھر یہاں سے چپ چاپ نکال کر کسی محفوظ مقام پر لے جائے۔

میجر رام سنگھ کا خیال دل میں آتے ہی ایک مسکراہٹ خود بخود امیر خان کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اس نے بڑی احتیاط لیکن پھرتی سے سجاول کو ایک کوٹھڑی کے آگے بنے برآمدے میں اس طرح لٹا دیا کہ نزدیک آنے پر ہی وہ نظر آ سکتا تھا اور خود وہ اس احاطے میں داخل ہونے والے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور دھڑکتے دل سے انگلی ٹریگر پر جمائے وہ آنے والے کا منتظر تھا۔

......دوسرے ہی لمحے جیپ کے بریک دور سے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی امیر خان کو جھٹکے سے جیپ رکنے کا احساس ہوا اور اس نے اپنی سمت آتے قدموں کی آواز سنی...... آنے والا ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھے جیپ سے اتر کر بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا ریوالور امیر خان کو بخوبی نظر آ رہا تھا۔

اور جیسے ہی وہ اس سے چند گز آگے نکلا۔ امیر خان پکارا۔ ''ہالٹ!''

''فرنٹ!'' آنے والے کے منہ سے نکلا اور اپنی دانست میں اس نے انتہائی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرے جھک کر اس کی طرف

گھومنے کی بھرپور کوشش کی تھی......وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا،لیکن یہ ایک الگ بات ہے کہ جیسے ہی اس کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا،اسٹین گن کے پورے برسٹ نے اسے چھلنی کر کے رکھ دیا۔

آنے والے کو تڑپنے یا آواز نکالنے کی مہلت بھی میسر نہ آئی۔امیر خان نے آگے بڑھ کر زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''میجر رام سنگھ'' وہ بڑبڑایا۔''بخدا!تم ایسی ہی موت کے مستحق تھے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سجاول کو میجر رام سنگھ کی اسی جیپ میں پچھلی سیٹ پر لٹائے بڑی احتیاط سے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

......دھماکوں اور چیخوں کی آوازیں رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگی تھیں۔

اس کے ساتھیوں نے بھی ''شکار کھیلنے'' میں کسی بخیلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

......جیپ اس نے بیرونی دروازے کے ایک طرف کھڑی کر دی اور خود اس سے ہٹ کر اسٹین گن تان کر کھڑا ہو گیا۔اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور تین چار منٹ بعد ہی باقی تینوں ساتھی بھی اس تک پہنچ گئے۔واپسی کا سفر انہوں نے اسی جیپ میں کیا۔

جیپ ''ڈسچارجر کپ'' والے ساتھی کے نزدیک جا کر ٹھہر گئی،جس نے انہیں دیکھتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔''کپ'' سے نکلنے والے بم بڑی نفاست سے ایک ترتیب کے ساتھ پہلے سے مقرر کردہ ٹارگٹ پر گر رہے تھے۔......ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ''چاند ماری'' کی مشق کر رہا ہو۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چھاؤنی سے شعلے بلند ہو کر آسمان کو چھونے لگے۔انہی شعلوں کی روشنی نے ماحول کو ننگا کر دیا تھا۔اور وہ جلد از جلد اس ''برہنگی'' سے نجات پانا چاہتے تھے۔

جیپ بڑی تیزی سے واپس بھاگ رہی تھی۔''صاعقہ'' کے جانباز،میجر رام سنگھ کو موت کی نیند سلا کر اور اس کی ''چھاؤنی'' کو نیست و نابود کر کے اپنے ساتھی کو اس کے خونی پنجوں سے چھین لائے تھے۔

لہو کا چراغ

جنرل طارق نے اس واضح حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ جب تک قبائلیوں کو بکتر بند گاڑیاں نہ دی گئیں ان کے لئے اس قیامت کی گولہ باری سے گزرنا ناممکن ہوگا کیونکہ بھارتی فوج نے سری نگر کے اردگرد اپنی قلعہ بندیاں مستحکم کر لی تھیں اور ان کی ایئر فورس کھل کر میدان میں آ چکی تھی۔

قبائلی حملہ آوروں نے دشمن کی پلٹنوں پر سامنے سے بڑا تیز اور جان توڑ حملہ کیا تھا کیونکہ دشمن کے پہلو یا بارش کی وجہ سے کھڑے جانے والے پانی نے بالکل محفوظ کر دیئے تھے لیکن اپنی لاکھ جواں مردی کے باوجود وہ سری نگر کا دفاعی حصار نہ توڑ سکے کیونکہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس شہر کے اندر سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی تھی اور سری نگر میں موجود بھارتی افواج کو شیخ عبداللہ کی مہربانیوں کے طفیل بالکل محفوظ "عقب" میسر آ گیا تھا۔

جنرل طارق بڑی تیز رفتاری سے بھاگم بھاگ راولپنڈی پہنچا تاکہ کم از کم دو بکتر بند گاڑیاں ہی مجاہدین کے لئے حاصل کر سکے۔ اس کی پہلی ملاقات کرنل مسعود سے ہوئی جنہوں نے اپنے جذبہ جہاد سے سرشار جنرل طارق کو پوری بکتر بند رجمنٹ دینے کی یقین دہانی کروا دی۔ اس حوصلہ افزائی نے جنرل طارق کا سیروں خون بڑھا دیا، لیکن یہ خوشی بالکل عارضی ثابت ہوئی کہ ایک طرف تو رجمنٹ کو خفیہ طور پر تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا جب کہ دوسری طرف وقت قیامت کی چال چل گیا۔ جب...... "سیاست کے فرزانوں" تک ان "دیوانوں" کی تازہ واردات کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے سر پیٹ لیا اور فوراً شور مچاتے جنرل طارق کی طرف دوڑے...... ان سب کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا:

"انڈیا ہم پر حملہ کر دے گا...... انڈیا ہم پر حملہ کر دے گا۔"

بے چارے جنرل طارق کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میدان جنگ کا جیالا جرنیل حیرت اور افسوس سے کار پردازان سیاست کے منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کر ڈالی کہ ان "مدبروں" کو سمجھا سکے کہ یہ مفروضہ محض ان کے خوف کی پیداوار ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں اور پھر عالم افراتفری میں جبکہ دونوں ممالک ابھی اپنے انتظامی مسائل بھی حل نہیں کر پائے، یہ کیسے ممکن ہے کہ بھارت کھلی جنگ چھیڑنے کی حماقت کر سکے؟ لیکن کسی نے اس "دیوانے" کی آواز پر کان نہ دھرے۔

توڑے دار، تھری ناٹ تھری کی رائفلیں، اسٹین یا برین گنیں بھارتی فوج کے آگے بھلا کیا حیثیت رکھتی تھیں، انہوں نے آسمان اور زمین سے قبائلی مجاہدین پر جہنم کے دہانے کھول دیئے اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود جنرل طارق کو دو تین روز بعد ہی یہ جاں گسل خبر بھی سننے کو مل گئی:

"قبائلی رات ہی رات میں سری نگر سے 65 میل پیچھے ہٹ آئے ہیں۔"

یہ سانحہ 5 نومبر کو رونما ہوا اور 7 نومبر 1947ء کو بھارتی کمانڈر نے دعویٰ کیا۔ "ہم نے بارہ گھنٹے کی خون ریز لڑائی کے بعد 500 قبائلی ہلاک کر کے انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہے۔"

اس شدت کا جھوٹ شاید اس سے پہلے اس خطے میں کبھی نہیں بولا گیا تھا۔ قبائلی تو دو روز پہلے ہی 5 نومبر کو پسپا ہو گئے تھے' البتہ انہوں نے اپنے کچھ آدمی دشمن کو ''مصروف'' رکھنے کے لئے ضرور پیچھے چھوڑ دیئے تھے تاکہ وہ آسانی سے پسپا ہو سکیں جنگی تاریخ سے متعلق معمولی شدبد رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ قبائلی کبھی کھلی جنگ کرتے ہی نہیں۔ وہ شب خون مارتے ہیں' گوریلا حملہ کرتے ہیں یا پھر ''سنائپرز'' ہوتے ہیں یعنی ان کا ایک آدھ آدمی چھپ کر دشمن کے ایک آدمی کو مار ڈالتا ہے اور وہ ''سنائپنگ'' اتنی شاندار کرتے ہیں کہ دشمن فوج چکرا کر رہ جاتی ہے۔

یہ لوگ فوج کی ''ریئر گارڈ'' کو ''مین باڈی'' سے کاٹ کر اسے بڑی بے بسی کی موت مار ڈالتے ہیں۔ دشمن کنوائے پر گھات لگانا اور بھاگ جانا ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔ یہ لوگ نہ تو دفاع میں بیٹھی فوج پر حملہ آور ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ پسند کرتے ہیں کہ قلعہ بند ہو کر کسی کو خود پر حملہ آور ہونے کی اجازت دیں۔ ہر دو صورتوں سے یہ احتراز برتتے ہیں۔

یہ لوگ ''فوج'' کو اپنی مرضی کے محاذ پر لا کر اس پر حملہ آور ہوتے ہیں اور مرکزی کمان نہ ہونے کی وجہ سے ''انفرادی جنگ'' لڑتے ہیں۔ ان کے طریق کار اور صدیوں کی جنگی روایات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے اپنی 500 لاشیں پیچھے چھوڑی ہوں کیونکہ قبائلی کبھی ہجوم کی صورت میں حملہ آور ہوتے ہی نہیں۔ ان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ محاذ پر تو وہ جیسے تیسے لڑ ہی رہے تھے، عقب سے بھی انہیں کوئی موثر مدد حاصل نہ تھی...... آخر وہ رکتے بھی تو کس برتے پر؟

سری نگر سے یہ لوگ پسپا ہو کر بارہ مولا پہنچے اور یہاں بھی جب انہیں اس بات کی کوئی امید نظر نہ آئی کہ پاکستانی افواج ان کی مدد کو آئیں گی تو وہ راتوں رات پیچھے ہٹتے ہوئے ''اوڑی'' تک آ پہنچے۔ اوڑی سری نگر سے 65 میل دور اور بارہ مولا سے تیس میل پیچھے ہے۔

............☆☆☆............

یہ تمام تلخ حقائق جنرل طارق کے سامنے تھے اور ہزار طرح کی سوچیں بھی......!

......لیکن اسی شام ان کے مکان پر 6 نومبر کی رات کو کشمیر کی جنگ آزادی کے بڑے بڑے جغادری لیڈر بڑی امیدیں لیے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ ہر صورت جہاد جاری رکھنا چاہتے تھے جب کہ حکومت کی فوج کو سختی سے غیر جانبدار رہنے کی ہدایات بھی پیش نظر تھیں۔

ان کشمیری لیڈروں کو کسی ایسے فوجی کی تلاش تھی جو اپنی جان اور مستقبل داؤ پر لگا کر ان کے مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد کو آگے بڑھے اور پٹھانوں کے خالی کردہ محاذ کو سنبھالے۔ یہ لوگ اس سے پہلے آرمی کے قریباً سب ہی سینئر کمانڈروں سے مظلوم کشمیریوں کی مدد کرنے کی اپیل کر چکے تھے اور اب ہر طرف سے مایوس ہو کر اس بخت آور جرنیل کے پاس آ گئے تھے جو اپنے خون جگر سے تاریخ کے اوراق پر وہ لہورنگ کہانی لکھ رہا تھا جو نسلیں اپنی آنے والی نسلوں کو تبرکاً منتقل کیا کرتی ہیں۔

وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے......اور آخر ہوا کی لہروں میں ارتعاش ہوا۔ ''میں جاؤں گا وہاں...... میں لڑوں گا...... میں اکیلا ہی لڑوں گا۔ خدا کی قسم! جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے' بھارتی فوج کو آزاد کشمیر پر قبضہ نہیں کرنے دوں گا۔'' جنرل طارق نے چٹان کے سے مضبوط عزم سے انہیں مخاطب کر کے ان کے مردہ چہروں پر زندگی کی لہر دوڑا دی۔

اور پھر 7 نومبر کی شام ایک اسٹیشن ویگن جو جنرل طارق کا ہیڈ کوارٹر بھی تھی اور جس میں ایک وائرلیس سیٹ، دو رضا کار سگنلز اور کیپٹن تسکین الدین موجود تھے، تاریخ حریت کا نیا باب رقم کرنے کے لئے محاذ کی طرف روانہ ہوگئی۔

......ان کے سنگ سنگ ان ہزاروں لاکھوں مجبور اور بے کس انسانوں کی دعائیں بھی تھیں جو اپنے پیاروں کو شہید کروا کے جانے کب سے کسی طارق بن زیاد کے منتظر تھے۔

طارق بن زیاد کا سپاہی جنرل طارق ان کے دلوں کو ایک ولولہ تازہ بخشتا میدان کارزار کی طرف رواں دواں تھا۔

..........☆☆☆..........

اوڑی وہ لوگ آدھی رات کے بعد پہنچے تھے۔ فضا میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ بھارتی بمباروں نے سارا علاقہ کھنڈرات میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک مکان بھی ایسا نہیں تھا جس کی چھت ان کی وحشیانہ بمباری سے محفوظ رہی ہو۔ ایک جگہ جنرل طارق کو کچھ لاریاں کھڑی دکھائی دیں۔ قریب ہی جھونپڑیوں میں قبائلی لشکر مقیم تھا۔ جنرل کو میجر خورشید کی تلاش تھی جو یہاں سے کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچ کر تازہ ترین اطلاع ملی کہ راتوں رات ایک بھارتی بریگیڈ بارہ مولا پہنچ گیا ہے جس کا فاصلہ یہاں سے بمشکل 30 میل مکمل پہاڑی علاقہ تھا جس کے عین درمیان سے ایک سڑک گزر کر اوڑی تک آتی تھی۔ ایسا علاقہ قبائلی جنگجوؤں کے لئے بالکل مناسب تھا۔ سڑک دونوں اطراف سے بند تھی۔ ایک طرف تو درختوں اور جھاڑیوں سے اٹی ہوئی پہاڑیاں تھیں جب کہ دوسری طرف تیز رفتار جہلم کی سرکش موجیں۔

......دریا پر ایک پل اوڑی سے قریباً پندرہ سولہ میل دور بنا ہوا تھا، لیکن پیدل گزر کر فوجی گاڑیاں اور بھاری اسلحہ یہاں سے پار نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ سڑک ٹیڑھی میڑھی تھی اور راستے میں جگہ جگہ رسوں کے بنے ہوئے جھولا نما پل موجود تھے۔

ہر پل پر دشمن کیلئے رکاوٹ کھڑی کی جا سکتی تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر "پکٹوں" کے ساتھ ایڈوانس کرنا بھارتی لشکر کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کیونکہ قبائلیوں کی موجودگی میں "پکٹیں" باندھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کیلئے بے تحاشا نفری درکار تھی تا کہ زیادہ سے زیادہ جوانوں کو مروا کر ایڈوانس کیا جا سکے۔

جنرل نے یہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے فوراً اور راتوں رات آگے بڑھ کر راستے میں آنے والے ایک اہم پل کو اڑانے کا پروگرام بنایا تا کہ دشمن کی پیش قدمی رک جائے انہیں دفاعی مورچہ بندیاں قائم کرنے کی مہلت نصیب ہو۔

یہاں ڈائنامیٹ تو نہ مل سکا البتہ پٹرول کے چند کنستر اور گینتیاں ہاتھ لگ گئیں۔ جنرل نے کسی نہ کسی طرح وہاں سابقہ آئی این اے (انڈین نیشنل آرمی) کے رضا کار جو جہاد کشمیر میں شامل تھے، اکٹھے کئے اور بے سروسامان رضا کاروں کے اس مختصر سیکشن کے ساتھ پل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ راتوں رات دشمن کے گشتی دستوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ لوگ آخر پل تک پہنچ ہی گئے۔

جنرل نے سب سے پہلے بڑھ کر ایک گینتی اٹھائی۔ اس کے ساتھ ہی باقی مجاہدین گینتیاں سنبھالتے ہوئے پل پر ٹوٹ پڑے اور صبح ہونے تک ان لوگوں نے وہاں اتنا بڑا شگاف ڈال دیا تھا جس کے نتیجے میں پل پر سے گزرنا ممکن نہیں رہا تھا، لیکن پل کے نیچے سے جو نالہ گزرتا تھا وہ اتنا گہرا نہیں تھا کہ دشمن کے لئے موثر رکاوٹ بن سکتا۔ جنرل طارق نے یہاں چند رضا کاروں کو بٹھا دیا۔

......واپسی پر جنرل نے دفاعی مورچوں کے لئے مختلف مقامات کا انتخاب بھی کرلیا اور اوڑی واپس پہنچ کر جنرل نے کسی نہ کسی طرح ٹیلی فون کے پرانے تار جو ابھی سلامت تھے، جوڑے اور سواتی فوج کو بذریعہ ٹیلی فون مدد کا پیغام بھی بھیجا' لیکن دوسری طرف سے جواب آیا: ''یہاں سے سواتی فوج کا کمانڈر فوج سمیت واپس جا چکا ہے۔''

جنرل بے بسی سے ہاتھ ملنے کے سوا اور کیا کرتا؟ مگر......اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور ایک آدمی سوات کی طرف بھیج دیا جو یہاں سے تین سو میل دور تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو رضامند کر کے واپس لے آؤ۔ اس طرف کمک کے لئے آدمی دوڑا کر جنرل طارق پھر قبائلیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جیسے ہی اس نے ان لوگوں سے اپنا تعارف کروایا' انہوں نے جنرل پر تنقیدی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ سچ کہہ رہے تھے پاکستان نے انہیں قربانی کے بکرے بنا کر یہاں بھیج دیا ہے اور خود پاکستانی فوج انہیں ایک توپ بھی نہیں دے سکتی۔ جنرل نے انہیں بہت سمجھایا' لیکن وہ لوگ سیاست اور مکاری کرتے تھے' نہ ہی سیاست اور مکاری پر یقین رکھتے تھے۔

طارق بن زیاد کا سپاہی اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ صرف سات مجاہد تھے۔ جنرل کا اسٹاف آفیسر اور سگنلز وائرلیس سمیت واپس جا چکے تھے۔ بارہ صدیاں پہلے جبرالٹر کے ساحل پر طارق بن زیاد نے اپنے جہاز جلا کر ''موت یا فتح'' کا نعرہ لگایا تھا۔ جنرل طارق بھی اپنی کشتیاں پھونک کر یہاں آیا تھا اور وہ آبرومندانہ واپس جانا چاہتا تھا۔ یوں بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ دینا اس کے اسلاف کی روایت نہ تھی۔ اس نے اپنی مختصر سی فوج کا جائزہ لیا جو پاک فوج کے ایک میجر' دو ریٹائرڈ سابق آئی این اے کے صوبیداروں، لطیف افغانی نامی ایک سیاسی کارکن' دو ڈرائیور' باورچی تین سویلین اور ان کے بڑے بھائی پر مشتمل تھی اور درجن رائفلیں اور ایک مشین گن اس فوج کا اسلحہ تھا۔ یہ تھی مختصر اور نامکمل جمعیت جس کے ساتھ جنرل طارق بھارتی فوج کے ایک بریگیڈ سے ٹکرانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یوں واپس جانے کے لئے نہیں آیا'' اس نے بڑے جذباتی لہجے میں اپنے سپاہیوں سے کہا۔

''ہم سب یہیں ایک ساتھ مر جائیں گے۔ ہم سب......'' ان میں سے ایک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

............☆☆☆............

ان کا سیکشن کمانڈر چھمن داس مہاراجہ کی فوج کا سابقہ صوبیدار آگے ٹرک میں ہندو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ باقی تمام سیکشن پیچھے سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ شیرو کے پہلو میں موجود غلام محمد بھی مہاراجہ کی فوج کا سابقہ حوالدار تھا' لیکن تھوڑے ہی عرصے کی ملاقات میں اس نے شیرو کو اپنا معتقد کر لیا تھا۔ وہ بظاہر تو ان پڑھ نظر آتا تھا' لیکن اس کی باتیں بڑے پڑھے لکھے عالموں جیسی تھیں۔

''میں پچھلے ہفتے جموں سے واپس آیا ہوں۔'' اس نے خاموشی کو توڑا۔

''پھر؟'' شیرو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ تم ہو کہاں کے رہنے والے؟'' اس نے اچانک ہی شیرو سے پوچھ لیا اور شیرو کا خیال نبی خان کی طرف چلا گیا جس نے روانگی کے وقت اسے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے پونچھ کے ساتھیوں کے علاوہ اور کسی کو اپنا رازدار نہ بنائے۔

''میں پونچھ سے آیا ہوں'' شیرو نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

''پونچھ سے؟'' غلام محمد کو حیرت ہوئی۔ ''تم سے کس گدھے نے کہا تھا یہاں سرینگر آنے کے لئے؟ ادھر مظفر آباد کی طرف نکل جاتے۔'' اس کے لہجے میں حقارت اور طنز نمایاں تھا۔

''نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔'' شیرو نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''پھر تو تم بہت مطمئن ہو گئے ہو گے یہ نوکری پا کر؟'' اس کے لہجے کی کاٹ بڑی گہری تھی۔

''تم جموں کی کیاں بات کر رہے تھے؟'' شیرو نے چاہا کہ موضوع بدل کر اس سے جان چھڑا لے۔

''ہاں جموں......!'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ادھر جموں کے سارے صوبے میں تمہیں شاید ہی کوئی مسلمان زندہ ملے گا۔ جموں، کھٹوعہ، اودھم پور، رام نگر اور ریاسی کے شہروں میں ہندوؤں نے بھارتی فوج کی مدد سے انہیں چن چن کر مار ڈالا ہے۔ وہ مظفر آباد اور بارہ مولا کی شکست کا بدلہ لے رہے ہیں ان سے اور اب تو وہاں ہندو ہی ہندو رہ گئے۔ کتنے بے وقوف ہیں ہم لوگ جو انہیں اپنے مسلمان بھائیوں سے صلح صفائی کی تلقین کرنے جا رہے ہیں۔ سنو!'' اس نے شیرو کی طرف جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''وہاں صلح صفائی اور بھائی چارے کے لئے اب ہندوؤں کے درمیان کوئی مسلمان باقی ہی نہیں بچا۔ یہ نعرہ اب کھوکھلا اور بے بنیاد بن چکا ہے۔ نیشنل کانفرنس کے سیاسی عقیدے سری نگر ہی میں پنپ سکتے ہیں جہاں شیخ عبداللہ سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح جس طرف چاہے، ہانک کر لے جائے۔ وہاں جموں میں امن امن کی رٹ بے معنی ہے۔''

''چاچا غلام محمد'' شیرو نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا۔ ''میں سیدھا سادا سپاہی ہوں' کوئی سیاسی لیڈر نہیں کہ تمہاری باتوں کی تہہ تک پہنچ سکوں۔ میرا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے اور بس۔ جموں میں کیا ہوا؟ بٹوٹ میں کیا ہوگا؟ مجھے ان باریکیوں کا کیا پتہ!''

''اور ہاں'' حوالدار غلام محمد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ''یاد رکھو نفرت کا ردعمل صرف نفرت ہوتا ہے...... نفرت! جب بٹوٹ پہنچ کر یہ مسلمان بے چارے اپنے بھائیوں کا حال دیکھیں گے تو ہندوؤں کے لئے ان کے دل میں نفرت کا جذبہ اور مستحکم ہو جائے گا اور یہ نفرت صرف جموں یا بٹوٹ کے نہیں، سارے کشمیر کے ہندوؤں کے لئے ہوگی۔ تب کیا کرے گا یہ شیخ عبداللہ...... شیر کشمیر؟'' آخری الفاظ اس نے خاصے طنزیہ اور حقارت سے ادا کئے تھے۔

''تم یہ سب کچھ مجھے ہی کیوں سنا رہے ہو؟'' شیرو بالآخر پھٹ پڑا۔ سیکشن کے باقی تمام ہوم گارڈز انہیں چونک کر دیکھنے لگے۔

''سنو......'' حوالدار غلام محمد کی آواز خاصی بلند تھی وہ اپنے انجام سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ ''تم سدھن ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ وہاں تمہارا قبیلہ ہندوؤں کے ساتھ زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہا ہے اور تم یہاں منہ اٹھا کر امن قائم کرنے آ گئے ہو۔'' شیرو مسکرا کر چپ ہو رہا۔

ناسری نالے کے پاس پہنچ کر ٹرک رک گیا۔ شاید ان کا سیکشن کمانڈر پل کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

''وقت وقت کی بات ہے'' غلام محمد پھر بولنا شروع ہو گیا۔ ''یہیں 25 / اکتوبر کو مہاراجہ کو بھی جو سری نگر سے بھاگ کر جموں جا رہا تھا، اس

نے شاید اسی جگہ کھڑے ہو کر پوٹھوہار سے آنے والے سکھوں سے کہا تھا۔ ''خالصو! راج ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ہمت ہے تو بچالو۔'' اور جانتے ہو خالصہ جی نے راج دربار کو بچانے کے لئے کیا کیا؟'' اس نے شیرو کے کندھے پر ہاتھ مارا جو ترپال کو ایک طرف ہٹا کر باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''انہوں نے اس روز بھوٹ میں پہلا فساد کیا اور بے خبر اور نہتے مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ مظفر آباد اور راولپنڈی کے سکھوں نے اپنا سارا غصہ بھوٹ کے مٹھی بھر بے گناہ مسلمانوں پر نکالا۔ اب وہاں کیا رہ گیا ہے؟'' حوالدار غلام محمد خاموش ہو گیا۔ اس نے پچھمن داس کو اس طرف آتا دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ ان لوگوں کو تازہ ہدایات دینے آ رہا تھا۔

''تم لوگ ذرا 'وارم اپ' کرلو۔ ہم یہاں پانچ دس منٹ ٹھہریں گے۔''

تمام لوگ ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے اور ہاتھ پیر ہلا کر اپنے جمے ہوئے اعصاب اور جسموں کو حرارت پہنچانے لگے۔

......اس سیکشن میں صرف یہی تین آدمی، ڈرائیور، پچھمن داس اور غلام محمد ان کے لئے اجنبی تھے، باقی تمام لوگ وہی تھے جو پونچھ سے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے تھے۔ وہ سب شیرو کے صرف ایک اشارے پر کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ شیرو نے بھوٹ سے پہلے ہی کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر غلام محمد ان کے ساتھ نہیں تھا تو وہ ان کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انہیں یہی مشن سونپا گیا کہ ٹرک پر قبضہ کر کے اپنی اصلیت چھپاتے ہوئے وہ لوگ بھوٹ میں موجود بھارتی فوج پر نقب لگائیں۔

یہ دس منٹ شام کو پورے ہوئے۔ بعد میں بھوٹ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ یہاں خصوصی ہدایت کے تحت روکا گیا تھا کیونکہ مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے لئے بھوٹ کے نواحی دیہاتوں میں ''شکار'' موجود تھا اور وہ لوگ دوران شکار ہوم گارڈز کے اس سیکشن کو جس میں زیادہ مسلمان سپاہیوں کی ہے، یہاں بلا کر کباب میں ہڈی بنانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

............☆☆☆............

شام کے گہرے سائے بھوٹ کی نحوست کو چار چاند لگانے کے لئے اب آہستہ آہستہ اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔

......ابھی ان لوگوں نے ناسری نالہ عبور کیا ہی تھا جب اچانک ٹرک ایک دھچکے سے رک گیا۔ کسی نادیدہ خطرے کا احساس ہوتے ہی تمام سپاہی پھرتی سے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ باہر نیم تاریکی میں ایک دہشت ناک منظر ان کا منتظر تھا۔ سڑک کے کنارے خون میں لتھڑا ہوا ایک بچہ گرا ہوا تھا اور ایک نیم پاگل عورت کو ایک بوڑھے کشمیری نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا جو ڈرائیور اور پچھمن داس پر جھپٹ رہی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' حوالدار غلام محمد ان کے درمیان سے نکل کر آگے بڑھا۔ اس نے کشمیری زبان میں انہیں مخاطب کیا تھا۔ دونوں مقامی دیہاتی نظر آ رہے تھے۔

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں'' بوڑھے نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔ ''پاگل ہے یہ۔ پاگل ہے۔ آپ لوگ جائیں۔

''مار ڈالا...... ظالموں نے مار ڈالا ادھر بھدرواہ میں میری بیٹی چھین لی یہاں اس نے میرا بچہ مار ڈالا۔'' وہ گلا پھاڑ کر پچھمن

داس کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے چلا رہی تھی۔ بوڑھے نے اس کے منہ پر ہاتھ جما کر اس کی آواز بند کر دی۔ خوف اور دہشت سے اس کا رنگ پیلا پڑ رہا تھا جب کہ عورت بپھری ہوئی شیرنی نظر آ رہی تھی۔

معاملہ سب کی سمجھ میں آ گیا۔ اس بدنصیب کی لڑکی کو وہاں بے آبرو کر کے قتل کر دیا گیا تھا اور جب یہ جان بچا کر سری نگر کی طرف بھاگ رہے تھے ٹرک ڈرائیور نے لاپروائی سے اس کے بچے کو مار ڈالا۔ صوبیدار پچھمن داس اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''بکتی ہے سالی۔'' کہہ کر اس نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور عورت پر گولی داغ دی۔

بیک وقت دو فائر ہوئے تھے۔ ایک گولی پچھمن داس کے پستول سے نکلی اور پاگل عورت کے سینے میں لگی جسے بوڑھے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ خون میں بھیگ گئے۔ دوسرا فائر حوالدار غلام محمد نے کیا تھا۔ گولی صوبیدار پچھمن داس کی پشت پر لگی اور وہ منہ کے بل آگے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ معاملے کی نوعیت جان سکتے، شیرو نے گن کا بولٹ گرنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہوا اور گولی پچھمن داس کی کھوپڑی کو توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

ٹرک ڈرائیور نے اپنی اسٹین گن سیدھی کی ہی تھی کہ شیرو کی گن سے نکلی گولیوں نے اسے چاٹ لیا۔ سبھی لوگ بھونچکے سے وہاں کھڑے تھے۔ یہ سارا عمل اتنی تیزی سے اور اچانک انجام پایا کہ کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے کی مہلت بھی نہ ملی۔

سب سے پہلے شیرو ہی اس عورت پر جھکا جو اب بوڑھے کشمیری کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر جا پڑی تھی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور آنکھیں خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں اس سے پہلے کہ کوئی سپاہی اپنی بوتل سے پانی اس کے منہ میں ٹپکائے 'ایک ہچکی نے اس کی سانسوں کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔

''بخدا بے غیرتوں کے لئے پونچھ کی سرزمین بھی تنگ نہ تھی کہ ہم یہاں چلے آئے۔'' شیرو نے حوالدار غلام محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف مخاطب کیا۔ ''ہم لوگ یہاں آئے ہیں تو اس لئے کہ جس حد تک ممکن ہو دشمن کو نقصان پہنچائیں اور یہ تحریک صرف پونچھ ہی تک محدود نہ رہے، سارے کشمیر میں پھیل جائے۔''

چاچا غلام محمد نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بیک وقت محبت اور عقیدت کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ''میں فوج سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں بیٹا، لیکن ابھی ان ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ یہ بڑھ کر دشمن کا گلا گھونٹ سکیں۔ میں تمہارے جذبے کو سلام کرتا ہوں میں پونچھ کی ماؤں پر سلامتی بھیجتا ہوں جنہوں نے کشمیر کو ایسے غیرت مند سپوت دیئے۔ مجھے کبھی پیچھے نہ پاؤ گے۔''

''یہ سب ہمارے ساتھی ہیں اور پونچھ سے ہم اکٹھے آئے ہیں۔'' شیرو نے غلام محمد کو باقی مجاہدین کی طرف سے بھی مطمئن کر دیا۔

بوڑھے کشمیری کی داڑھی بھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ کبھی وہ بے بسی سے روتے روتے بچے کی لاش پر نظر ڈالتا، کبھی پاگل عورت کی لاش پر اور بچوں کی طرح سسکنے لگتا۔ پھر اچانک جیسے اسے چپ لگ گئی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی میلی کچیلی قمیض کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں رائفل چلانا جانتا ہوں۔'' اس نے شعلے برساتی نظروں سے شیرو کو مخاطب کیا۔

''اسے ایک دے دو۔'' دونوں لاشیں دفن کر دو اور ان دونوں کو اٹھا کر ان کھڈوں میں پھینک آؤ۔'' اس نے چھمن داس اور ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احکامات جاری کئے۔ ''ان کی تلاشی اچھی طرح لے لینا۔''

مرنے والوں میں سے ایک کی رائفل اور گولیوں کا پٹہ اس نے بوڑھے کشمیری کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''ہم ان دونوں کا انتقام بھارتی فوج سے ضرور لیں گے۔ بخدا انہیں ایسے ہزاروں معصوموں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہوگا۔''

سپاہیوں نے دونوں لاشیں کدالوں سے گڑھے کھود کر وہاں دفن کر دیں اور باقی دونوں کو گہری کھائی کی نذر کر دیا۔ اب ان سب کی کمان عملاً شیرو کے ہاتھ میں تھی۔ جسے حالات نے چند مہینوں ہی میں ایک عام سے نوجوان سے ایک پختہ کار سپاہی بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہوم گارڈز پر نظر ڈالی اور ان سے مخاطب ہوا۔

''دوستو! ہم پونچھ سے جو عزائم لے کر نکلے ہیں الحمدللہ آج وہ پورے کرنے کا موقع ہمیں مل رہا ہے۔ آؤ خدا کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب کرے اور ہم سرخرو ہو کر گھروں کو لوٹیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے جوانوں کو چھمن داس اور سکھ ڈرائیور کی موت کے متعلق وہ کہانی سمجھائی جو ان لوگوں نے آگے بیان کرنی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ حوالدار غلام محمد نے سنبھالی اور ٹرک بٹوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ احکامات کے مطابق ان لوگوں نے سری نگر سے آنے والی سڑک پر شہر کے باہر ہی بنے ڈاک بنگلے میں قیام کرنا تھا۔ اور امن وامان قائم کرنے میں ''مقامی پولیس'' کا ہاتھ بٹانا تھا۔ وہ اپنا راشن اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے۔ ڈاک بنگلے پر موجود انسپکٹر اشونی کمار ان کا منتظر تھا۔

''ناسری نالہ عبور کرتے ہوئے ہم پر اچانک حملہ ہوا اور ہمارے سنبھلنے سے پہلے ہی چھمن داس اور ڈرائیور مارے گئے۔ میرا نام پرتاب ٹھاکر ہے اور میں ہی اب اس سیکشن کا کمانڈر ہوں۔'' شیرو نے اشونی کمار کے کچھ پوچھنے سے پہلے ساری کہانی سنا دی۔

''کون تھے حملہ آور؟ یہاں سے تو کوئی......'' اشونی کمار کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

شیرو کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ایک لمحے کیلئے اشونی کمار کی آنکھوں میں جھانکا جو اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ ''یہ تمہارے سوچنے کا کام نہیں انسپکٹر۔ ہمارا سر درد ہے کہ وہ کون تھے۔ میرے خیال میں شاید وہ حملہ آور تخریب کار تھے۔'' اپنی کہی ہوئی بات کا ردعمل تلاش کرنے کے لئے اس نے دوبارہ انسپکٹر اشونی کمار کی آنکھوں میں جھانکا۔

''لیکن یہاں؟'' اشونی کمار نے حیرت سے کہا۔

''اچھا انسپکٹر! جے ہند۔'' شیرو نے مزید گفتگو سے بچنے کے لئے کہا۔

''مجھے اپنے جوانوں کے لئے لنگر کا انتظام بھی کرنا ہے۔'' اور وہ آگے بڑھ گیا۔

''جے ہند!'' انسپکٹر اشونی کمار کے منہ سے نکلا اور وہ بنگلے کی طرف جاتے شیرو کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

رات ایک پہر بیت چکی تھی۔ڈاک بنگلے کے ہندو چوکیدار نے ان کے کمرے میں ایک طرف لکڑیوں کا گٹھا لا کر رکھ دیا، پھر لکڑیاں آتش دان میں رکھ کر آگ سلگا کر وہ چلا گیا۔جاتے جاتے اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پہلے ہاتھ باندھے، پھر مسخروں کی طرح دانت نکال کر بولا۔

''مہاراج جی! یہاں سب سے قیمتی چیز لکڑی ہے۔اس موسم میں تو خاص طور پر۔باقی میرے لائق کوئی سیوا ہو تو ضرور بتایئے۔ ادھر گرمی کا سارا بندوبست موجود ہے۔دیہاتوں سے جو مسلمان چھوکریاں آئی ہیں نا، ایکدم پٹاخہ ہیں صاب...... ایک دم پٹاخہ۔وہ ادھر سونی لاج میں رہتے ہیں وہ لوگ۔

''بکومت اور دفع ہو جاؤ۔'' شیرو کا ساتھی ضبط نہ کر سکا۔

چوکیدار نے اس ڈانٹ کو صاب لوگوں کا ''نخرہ'' جانا اور ہاتھ باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔وہ پچھلے پندرہ سال سے اس ڈاک بنگلے کی چوکیداری کے ساتھ ساتھ یہاں آنے والے ''صاب لوگوں'' کی اسی طرح خدمات انجام دے رہا تھا۔اور اب کافی حد تک ان صاحبوں کے مزاج سے آشنا ہو چکا تھا۔

''صبح ہونے پر ہی حالات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے گا'' شیرو نے چٹختی لکڑیوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں اس کے بعد ہی کوئی منصوبہ بندی ہو گی۔میرے خیال سے ہم لوگوں کو جلد از جلد جموں کی طرف نکلنا چاہیے۔'' اس کے سری نگر والے ساتھی نے جواب دیا۔

دونوں لیٹنے کے ارادے سے کمرے کی دیوار کے ساتھ زمین پر بچھے اپنے بستروں کی طرف چل دیئے۔...... باقی گارڈز دوسرے کمروں میں موجود تھے۔

...... کسی ممکنہ ''شرارت'' کو شیرو نے نظر انداز نہیں کیا تھا وہ حوالدار غلام محمد کے زیر کمان دس جوان اس ڈاک بنگلے کے گرد اگرد باری باری پہرہ دے رہے تھے۔اس نے خود کو تو اشونی کمار کے سامنے ہندو ظاہر کر دیا تھا، لیکن اشونی کمار کو یہ علم تھا کہ باقی تمام ہوم گارڈز مسلمان ہیں۔یہاں یہ تاثر عام پایا جاتا تھا کہ شیخ عبداللہ اپنی سیاسی طاقت بڑھانے کیلئے ہوم گارڈز میں مسلمانوں کی تعداد بڑھاتا چلا جا رہا ہے اور اس بے چارے کے ''منصوبہ امن'' میں بھی متعصب ہندوؤں نے کیڑے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔

ساری رات شیرو پونچھ کے مرغزاروں میں زہراں کا تعاقب کرتا رہا۔کبھی وہ سیبوں سے بھرے درختوں کی جھکی ہوئی ڈالیوں سے کبھی کسی شوریدہ سر ندی کی لہروں کے دوش پر اور کبھی اس غار نما ٹھکانے پر پہنچ جاتا جہاں وہ ان لوگوں کو چھوڑ آیا تھا۔ہر جگہ، ہر موڑ پر زہراں کو اس نے اپنا منتظر پایا۔

آخر اس لمبی اور سرد رات کا خاتمہ ایک دھند اور کہرے لپٹے دن پر ہوا۔گارڈز ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ان دونوں کو مقامی پولیس حکام سے ملاقات کرنا اور اپنے ہیڈ آفس کو رپورٹ کرنا تھی۔کچھ یہی عزم لے کر وہ ڈاک بنگلے سے باہر نکلے تھے ان کا رخ ہوٹل کے اس واحد ہوٹل کی طرف تھا

جس کے مسلمان مالک کو قتل کر کے یہاں مہاجر سکھوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔

............☆☆☆............

ابھی دونوں بنگلے کی حدود ہی میں تھے کہ رات والا چوکیدار انہیں اپنی سمت آتا دکھائی دیا اس نے ایک فوجی کمبل اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ کر خود کو سردی سے بچانے کا خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔ شیرو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھی کو پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔

''جے ہند مہاراج جی!'' اس نے سرکس کے بندروں کی طرح ہاتھ باندھ کر دانت نکال دیئے۔

''کیسے ہو؟'' شیرو نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر جمائی۔

''کرپا ہے بھگوان کی مہاراج جی۔ ایک خبر سنانے آیا ہوں ابھی ابھی ایک آدمی پہنچا ہے بھدرواہ سے۔ ارے میں بھی کیا ہوں' پہنچا تو وہ مہاراج جی رات کو تھا' مجھے ابھی ملا ہے۔ ادھر جو کمپنی ہے نا ہوم گارڈز کی' اس نے اپنے پلاٹون کمانڈر کو مار ڈالا ہے' اس نے بڑی مکاری سے آنکھ دبائی اور بولا۔ ''بے چارہ ہندو تھا نا۔ یہ سالے مسلمان اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔ ایسے واقعات تو ہوم گارڈز میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تمام خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ وہ تو بھگوان بھلا کرے سنگھ (جن سنگھ) والوں کا' جو کشتواڑہ سے وہاں پہنچے اور انہوں نے راتوں رات مسلمانوں کا وہ حشر کیا کہ بس سالوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا۔ کچھ مال ادھر بھی پہنچا ہے مہاراج جی۔ ایک دم گرم مال ہے۔ کہیے تو آج ہی......'' اس نے دوبارہ اپنی ایک آنکھ دبائی۔ ادھر سونی لاج پر جو گارڈ انچارج ہے نا پولیس کا حوالدار بھوبت رائے۔ پکا یار ہے اپنا۔ بس آپ کے اشارہ کرنے کی دیر ہے مہاراج۔''

''اچھا...... اچھا اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ باتیں نہ کیا کرو۔'' شیرو نے وہاں سے آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ساتھی کے صبر کا پیمانہ اب چھلکنے کو ہے۔

''ایک بات ہے سرکار۔ ان مسلمانوں سے ذرا ہوشیار ہی رہیے گا۔ ہوم گارڈز والوں سے۔'' اس نے جاتے جاتے فقرہ ان کی سمت اچھال دیا اور ''جے ہند'' کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

''سونی لاج'' کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں کے کلیجے غم اور غصے کی شدت سے پھٹے جا رہے تھے' لیکن ابھی کچھ کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ شیرو کو نبی خان کا وہ جملہ اچھی طرح یاد تھا۔ ''تمہارا ایک غلط قدم نہ صرف ان سب لوگوں کو مروا دے گا بلکہ تحریک بھی اپنے ابتدائی مراحل میں زبردست سانحے سے دوچار ہو جائے گی اور جانے ہم یہ جھٹکا برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔''

دونوں سونی لاج کے قریب سے بغیر آواز پیدا کیے گزر گئے تھے اور ان کا رخ اب اس ہوٹل کی طرف تھا جسے مقامی لوگ ''ریفیو جی ہوٹل'' کہتے تھے ان کی آمد کی خبر ہوٹل میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ تبھی تو وہ موٹا سا سکھ سردار جو سامنے کاؤنٹر کے ایک کونے میں فوم کے ایک گدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا' انہیں دیکھتے ہی لپکا اور ان تک جا پہنچا۔

''ست سری اکال جی...... ست سری اکال! جی آیاں نوں! ہمارے تو بھاگ جاگ اٹھے' کیڑی کے گھر نارائن آ گئے مہاراج۔''

''چائے کے ساتھ جو بھی تمہارے پاس تیار ہے لے آؤ'' شیرو کے ساتھی نے اس کی مزید بکواس سے بچنے کے لئے جان چھڑائی۔

''اوئے نکے۔''اس نے وہاں موجود ایک لڑکے کو آواز دی۔

''آیا باپو جی۔''کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک سر نمودار ہوا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے اور پوریاں ان کی میز پر موجود تھیں۔اس دوران موٹا سکھ مسلسل ان کا دماغ چاٹتا رہا۔''ادھر مظفر آباد میں اپنا ہوٹل تھا جی' لیکن ایسا نہیں۔واہ گورو جی کی کرپا سے اس سے تین گنا بڑا ہوٹل مل گیا۔واہ مالکا تیری لیلا بھی نیاری ہے۔سنتے ہیں جی کہ اس کا مالک کوئی انور شاہ تھا۔اسے بلوائیوں نے مار ڈالا۔بڑے ظالم لوگ ہیں جی یہ ڈوگرے۔''وہ اپنی ترنگ میں کہہ تو گیا' لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔''کیا کریں جی۔وہ بھی مجبور ہیں بے چارے ادھر پٹھانوں نے بھی تو ان کے ساتھ برا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔مہاراج جی! ایک رات میں سات ہزار ڈوگرے تو انہوں نے بارہ مولا میں مار دیئے۔''

وہ نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔دونوں کے کان تو اس کی گفتگو پر ہی لگے تھے' لیکن ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔موٹے سردار کی گفتگو کا سلسلہ دو فوجیوں کی آمد پر ٹوٹا۔دونوں ایک ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔دکھائی دے رہا تھا کہ انہوں نے نشہ کر رکھا ہے۔

''کم بخت صبح ہی صبح آن مرے۔''سردار آہستہ سے بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔''واہے گورو......واہے گورو۔ست گرونانک تیری اوٹ۔''اس نے جاپ شروع کر دیا۔

''اوئے موٹے کیا ہے تیرے پاس؟''ان میں سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ابھی لاتا ہوں مہاراج جی۔''اس نے جان چھڑانی چاہی' لیکن وہ تو اس کی جان کو آ گئے تھے۔

''اوئے موٹے۔وہ سالا ہانجی لوگ کدھر ہے......ہانجی لوگ' جن کے پاس نرم اور گرم مال ہوتا ہے۔کشمیر کا ہانجی لوگ تو ادھر مہاراشٹر میں بہت مشہور ہے لیکن ادھر تو......''مرہٹہ حوالدار کی آواز نشے سے لڑکھڑانے لگی تھی' پھر نجانے انہیں کیا ہوا۔شیرو پر نظر ڈالتے ہی وہ نارمل ہو گئے۔شاید انہیں ہدایات ہی ایسی دی گئی تھیں۔موٹا سردار دوبارہ ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

''اوئے......کہاں مر گیا ہے اوئے تو......!''اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لڑکے کو آواز دی جس نے حسب سابق کاؤنٹر کے پیچھے سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا......''فوراً گرم پوریاں نکال صاحب لوگوں کے لئے......اور تازہ پتی کی چائے بنا کر لا۔''

''لایا سردار جی۔''لڑکا دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

''مہاراج جی! یہ جو سالا اشوئی کمار ہے نا......یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔بڑا بدمعاش آدمی ہے۔اس نے تو مہاجروں کے ناک میں دم کر رکھا ہے اور ہوم گارڈز والوں کا تو دشمن ہے دشمن......اسے ہر مسلمان پر شک رہتا ہے کہ وہ ڈوگروں کے خلاف ہے۔پہلے تو ہمارے پیچھے بھی کافی دیر تک لگا رہا......بڑی مشکل سے جان چھڑوائی ہے ہم نے اپنی۔''

''اچھا سردار جی۔ہم چلتے ہیں۔ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ادھر ڈاک بنگلہ میں ہم لوگ رہتے ہیں۔کوئی بات ہو تو چلے آنا......پرتاب ٹھاکر نام ہے میرا اور جو تمہارا اشوئی کمار ہے نا......اس سے تو میں نپٹ لوں گا۔''شیرو نے سردار کے''نا' نا''کرنے کے باوجود اسے بل ادا کیا اور

دونوں باہر نکل آئے۔

ہوٹل کے باہر دھند اور سورج کی طویل لڑائی اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی اور فضا میں دھند غائب ہو گئی تھی۔ ان کے چاروں اطراف سبزے پر شبنم کے قطرے اب بھی پھسلتے ہوئے کشمیر کی بدبختی پر آنسو بہا رہے تھے۔

کچے راستے پر بچھے درختوں کے شبنم میں بھیگے پتوں پر چلتے ہوئے جب وہ ڈاک بنگلے میں پہنچے تو ان کے فوجی بوٹ پانی سے بھیگے نظر آ رہے تھے۔ سونی لاج کے قریب سے گزرتے ہوئے نامحسوس طور پر ان کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ دروازے کے باہر حوالدار بھوپت رائے ایک چارپائی پر بیٹھا ٹھاٹھ سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ انہیں اس طرف آتے دیکھ کر ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار ماتھے تک سلام کرنے کے لئے اٹھ گیا' لیکن دونوں اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔

............☆☆☆............

سجاول کی حالت مسلسل اور بھرپور تشدد سے اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا بھی رہ سکے۔ یہ تو اس کی مضبوط قوت ارادی تھی جس نے کسی کمزوری کو اس کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا اور کسی نہ کسی طرح دو چار روز ہی میں وہ اپنے پاؤں پر نہ صرف کھڑا رہنے بلکہ چلنے کے قابل بھی ہو گیا تھا۔

میجر رام سنگھ کی موت کی خبر نے اسے خوشی کے بجائے مایوس کر دیا تھا۔ سجاول نے قسم کھائی تھی کہ وہ خود موذی کو اپنے ہاتھوں اس کے بھیانک انجام تک پہنچائے گا اور وہ اب اپنی اس قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا' مگر دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا کہ سجاول اور اس کے ساتھی سوائے بے بسی سے تماشا دیکھنے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔

پونچھ کی جاگیر کا دارالحکومت یہی پونچھ شہر تھا جس کی 3 لاکھ 82 ہزار مسلم اور 39 ہزار غیر مسلم آبادی زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہی تھی۔ اس شہر کی خصوصی جنگی اہمیت کے پیش نظر فوج کو سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مورچوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔ کوہالہ اور آزاد پتن سے دشمن کو رگیدتے ہوئے مجاہدین نے اسے پونچھ میں محصور کر دیا تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ سالم حویلی اور مینڈر کی تحصیلوں سے گزرتے راجوڑی تک آ گئے تھے۔ دشمن کے لئے پونچھ شہ رگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ شہ رگ کٹ جاتی لیکن اپنوں کی سیاہ کاریاں رنگ لائیں اور ایک شاندار فتح کا موقع جان بوجھ کر ہاتھ سے نکل جانے دیا گیا۔

یہ کشمیر کی تاریخ حریت کا وہ اندوہناک باب ہے جس پر ماضی کی گرد گہری ہوتی جا رہی ہے' لیکن جس میں چھپے المناک سوالوں کے جواب مورخ کو اس لئے بھی میسر نہ آ سکے کہ یہاں قاتل بھی اپنے ہیں اور مقتول بھی۔

ریاستی فوج پونچھ میں محصور جب بھارتی سورماؤں کی مدد پر کان اور آنکھیں لگائے بیٹھی تھی' ان دنوں آزاد کشمیر فرسٹ بریگیڈ کی نمبر چھ بٹالین کے ایک کمپنی کمانڈر امیر محمد خان جوراولہ کوٹ سے اپنا گھر بار لٹا کر یہاں پہنچے تھے' پلان کے مطابق اپنے ایک سو جوانوں کے ساتھ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شہر میں داخل ہو گئے۔ انہیں شہر میں چاروں طرف پھیل کر دشمن پر شب خون مارنا تھا۔ انگریزی فوج کے سابق صوبے دار اور "ملٹری کراس" یافتہ غازی امیر محمد خان نے اپنا فرض جی جان سے نبھایا اور وہ دشمن پر بے خبری میں ٹوٹ پڑے۔ ان کی تعداد دشمن کے

مقابلے میں بہت ہی کم تھی اور اسلحہ تو نہ ہونے کے برابر تھا' لیکن کشمیر کے ارجمند بیٹے آج مر جانے یا مار دینے کا عزم لے کر آئے تھے۔ دو گھنٹے تک انہوں نے زندگی اور موت کا معرکہ لڑا۔ شہر میں موجود موتی محل کے ایک کونے پر غازی امیر محمد خان شدید زخمی حالت میں بھی اپنے جوانوں کا خون گرماتے رہے لیکن...... منصوبہ ادھورا رہا۔ دوسری طرف سے عبدالقیوم خان نے جنہیں منصوبے کے مطابق شہر پر باہر سے چاروں اطراف سے حملہ کرنا تھا' حملہ نہ کیا۔ اس میں کیا مصلحت تھی؟ حملہ ملتوی کیوں کیا گیا؟ جب کہ شہر پونچھ کی فتح بمشکل گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی بات تھی۔ اس سوال کا جواب نہ ''مجاہد اول'' کے پاس ہے نہ ہی تاریخ کے پاس......!

غازی امیر خان اپنے درجنوں جوانوں کو شہید کروانے کے بعد علی الصبح لاشوں اور زخمیوں کو کندھوں پر اٹھائے واپس آ گئے کیونکہ اب شہر کے اندر لڑنا سوائے حرام موت مرنے کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

شہر کے اندر موجود مجاہدین اپنی معمولی رائفلوں اور ایک آدھ برین گن کے ساتھ دشمن پر ''سنائپنگ'' یا پھر اکا دکا معمولی نوعیت کے شب خون مارنے کے علاوہ اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

غازی امیر خان کے دلیرانہ حملے کی ناکامی کے فوراً بعد کشمیر اور بھارت کے الحاق کے تحت بھارتی فوجیں سارے کشمیر میں پھیل گئیں۔ پونچھ میں موجود ''لینڈنگ گراؤنڈ'' پر بھارتی فوجیوں سے بھرے باز اترتے اور چڑھتے رہے۔ معمولی رائفلیں ان کا کیا بگاڑ سکتی تھیں؟

پونچھ کے باہر مجاہدین کا محاصرہ اب خاصا سخت ہو گیا تھا' لیکن ایک روز جب زخمیوں اور بیماروں کو شہر سے نکالنے کے بہانے تھوڑی دیر کی فائر بندی عمل میں آئی تو بریگیڈیئر پریتم سنگھ کے زیر کمان بھارتی فوج کا پورا بریگیڈ بڑی ہوشیاری سے شہر میں داخل ہو گیا اور محاصرے پر موجود کشمیری فوج اس تماشے سے محظوظ ہوتی رہی۔

بھارتی بریگیڈ کے شہر میں داخل ہوئے ہی وہاں کا نقشہ بدل گیا۔ ان لوگوں نے شہر کے چاروں اطراف زبردست مورچہ بندیاں کر کے شہر کو اب ناقابل تسخیر قلعے میں تبدیل کر دیا تھا۔

............☆☆☆............

''حالات تمہارے سامنے ہیں دوستو'' امیر خان نے اپنے سامنے موجود پانچوں کو مخاطب کیا۔

''نبی خان نے آخری ہدایت یہی بھیجی ہے کہ ہم اپنی صوابدید کے مطابق کوئی فیصلہ کر لیں۔ ہمارے لئے سری نگر اور وہاں سے پھر جموں تک جانے کا بندوبست بھی ہو چکا ہے' اب میں معاملہ تم پر چھوڑتا ہوں۔''

''یہ آخری ضرب ضرور لگانی ہو گی امیر خان! سجاول کی کہی بات کے پیچھے کار فرما مضمرات کا امیر خان کو اندازہ تھا' پھر بھی اس نے ایک کمانڈر ہونے کی حیثیت سے اپنے باقی ساتھیوں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ وہاں موجود ہر شخص آتش فشاں پہاڑ کی طرح کسی بھی لمحے پھٹ جانے کو تیار تھا۔ پھر ایسے ''غنیمت'' مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا ان کے نزدیک کفران نعمت کے مترادف تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ ایک ''ہدف'' منتخب کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب وہ اس پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ان کا انتخاب

دریائے پونچھ کے کنارے دشمن کا ایک کیمپ تھا جہاں محفوظ بنکروں سے وہ لوگ مجاہدین پر دن رات آگ برسایا کرتے تھے۔

زمین پر ایک کاغذ بچھا کر امیر خان نے ماہر جرنیلوں کی طرح اس پر لکیریں کھینچ کر ان لوگوں کو اس مورچے کے ارد گرد موجود رکاوٹوں اور مشکلات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے ممدو گوجر کو یہ ڈیوٹی سونپی تھی کہ وہ کل رات کو اس علاقے میں ''ریکی'' کر کے دشمن کی پوزیشنوں کا ایک مرتبہ پھر قریب سے جائزہ لے لے تا کہ وہاں عمل میں آئی کسی بھی ممکنہ تبدیلی سے وہ لوگ آگاہ ہو سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنے پلان میں تبدیلی کر سکیں۔

دوسرے ہی روز پھر رات گئے وہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ممدو گوجر کے سامنے وہی نقشہ پھیلا ہوا تھا اور وہ اندازے سے پہلی لکیروں سے کچھ مختلف لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا ایک مرکزی نقطہ بہر حال تھا۔

''یہ ہے وہ مورچہ جہاں ان لوگوں نے ''میڈیم گن'' حال ہی میں نصب کی ہے۔'' اس نے امیر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جوشیلے لہجے میں کہا۔

''حیرت ہے۔ ''خچر باتری'' والے یہاں تک گن لے کر کیسے پہنچے ہوں گے؟ مجھے تو کوئی راستہ اوپر جانے کا نظر نہیں آرہا۔'' امیر خان بولا۔

''ایک جگہ میں نے ایسی تلاش کر لی ہے امیر خان۔'' ممدو گوجر بولا۔ ''جہاں سے ہم دوربین کے ذریعے اس ''بنکر'' کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم صبح اسے دیکھ لیں گے۔'' امیر خان بولا۔ ''تم لوگ کیا یہاں کے رہنے والے ہو؟'' اس دفعہ اس کے مخاطب وہ دو نو وارد تھے جو اس سے پہلے اس مہم میں اس کے ساتھ حصہ لے چکے تھے۔

اپنی تنظیم کے اصول کے مطابق اس نے ابھی تک تعارف حاصل نہ کیا تھا۔ آج ان کی تیسری ملاقات تھی۔ امیر خان شاید یہ بات دریافت نہ کرتا' لیکن انسان کی فطری کمزوری آڑے آئی کہ وہ اپنے ہم کار کے متعلق عموماً متجسس رہتا ہے۔

''میں پلندری سے آیا ہوں۔ یہ یہاں کا مقامی ہے۔'' ان میں سے ایک نے مختصر سا جواب دیا۔

امیر خان کو اس کے جواب نے احساس دلایا کہ اس کو ان دونوں سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ''اصل میں' میں یہ چاہتا تھا کہ تم میں سے ایک ہمارے ساتھ جائے جو اس علاقے کی واقفیت رکھتا ہو۔ یہاں ہمارے اس مختصر ٹھکانے کی حفاظت کے لئے بھی کسی نہ کسی کا رہنا تو ضروری ہے' پھر ہم میں سے کوئی ایک تو بچ جائے جو ہمارے احوال کی خبر نبی خان کو پہنچا سکے۔'' اس نے نو واردوں کو مطمئن کرنے کے لئے کہہ دیا۔

وہ رات انہوں نے اکٹھے ہی باری باری پہرہ بدل کر اپنے ٹھکانے پر گزاری۔ علی الصبح جب شہر کے کسی کونے سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو سجاول' امیر خان اور ممدو گوجر دونوں ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ طاقت ور شیشوں کی ایک دوربین امیر خان نے اپنے گلے میں لٹکا کر اس پر کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کی اسٹین گن بھی اسی طرح ان کے جسموں سے چپکی ہوئی تھیں۔

ان کے مطلوبہ مقام تک پہنچتے تک جہاں سے انہوں نے ''بنکر'' کا نظارہ کرنا تھا' سورج نہیں نکلا تھا' لیکن پرندوں کی ملی جلی آوازیں اکا دکا فائروں کی آوازوں کے درمیان اپنا راگ الاپ رہی تھیں۔ تینوں یخ بستہ پتھروں پر چلتے اس جگہ پر پہنچے تھے۔ پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں نیلے

آسمان پر پھیلتی ایک پر اسرار سرد روشنی میں اب ان کے سامنے نمایاں ہو رہی تھیں۔

تینوں دم سادھے ایک نوکیلی چٹان سے چپکے بیٹھے تھے۔ اس ''محفوظ پناہ گاہ'' کے ارد گرد دور دور تک فوجی مورچوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ صرف وہی راستہ محفوظ تھا جس پر وہ ممدو گوجر کی سربراہی میں سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ اسے گزرگاہ کا نام دینا تو غلط تھا' وہ تو پتھروں اور اونچے اونچے ٹیلوں میں چکر لگاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ سردی اور ماحول پر پھیلی پر اسراریت کے ملے جلے احساس نے انہیں دم سادھ کر چپ بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دم توڑتے اندھیر میں سجاول نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حد نظر تک جائزہ لیا تو وہ ممدو گوجر کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس نے دشمن کے مورچوں کے عین درمیان ایسی جگہ ڈھونڈی تھی جہاں کسی بھی ''سرچنگ ٹاور'' کا دھیان ہی نہ جا سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی پہلی کرن چٹکی اور خوشبو کی طرح ان کے احساس کی گہرائیوں میں رچ گئی۔ وادی جنت نظیر نے گھور اندھیروں کا سیاہ غلاف اتار پھینکا تھا۔ یہاں دشمن کے بیچوں بیچ بیٹھے ان تینوں سرفروشوں نے جیسے اپنی زندگیوں پر پڑے خول کو بھی اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ان سبھوں نے نئی زندگی کی نئی صبح کو سرد ہوا کے لمس اور دمکتے سورج کی لہورنگ کرنوں کے بوسے کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ ان کے چاروں طرف پھیلی چوٹیوں پر دھوپ نے نوزائیدہ بچوں کی طرح لرز لرز کر سانس لینا شروع کر دیا تھا۔ پہلی کرنوں نے سربکف مجاہدین کے عزم واستقلال کو ہدیہ تہنیت پیش کرنے کے لئے پہاڑوں کی پیشانیوں کو چومنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سلسلہ ہائے کوہ پر پھیلی کرنوں کے سرد شعلے بھڑک کر اب لطیف ہوا کے برفیلے جھونکوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

سامنے کا منظر نمایاں ہونے لگا تھا۔ ان کے سامنے والی پہاڑی سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ یہ سڑک تنگ درے کے بیچوں بیچ لہراتی بل کھاتی ہوئی چلتی تھی۔ جیپ کبھی اونچی چوٹی پر چڑھتی اور کبھی ڈھلوانوں سے لڑھکتی نظر آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چوٹیاں کشمیر کے بہادر سپوتوں کی عظمت کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ پہاڑی سڑک کا کھڈ والا استرے کی دھار کی طرح تیز اور باریک کنارہ انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ ایک خطرناک موڑ پر ان کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو کر پہاڑی کے پیٹ میں کہیں اتر گئی۔

امیر خان نے اپنی گود میں رکھی دوربین کے شیشوں کو اپنی چادر کے ایک کونے سے صاف کیا اور دوربین آنکھوں پر جما لی۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے پستہ قد سی ایک پہاڑی نمایاں ہونے لگی جو وادی کے عین درمیان میں شرقاً غرباً پھیل کر ایک فصیل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ پہاڑی دیو ہیکل عفریتوں کے درمیان ایک پستہ قد بونے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

امیر خان نے دوربین کا ماسک درست کیا تو اس کی چوٹی پر نگاہ ٹھہری جس کی ہر تفصیل اسے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واضح اور الگ الگ دکھائی دے رہی تھی۔ چھجے دار چٹان کا ایک ایک زاویہ' ایک ایک ڈھلان' پتھروں کی ایک ایک تیز دھار نوک اور چٹانوں کے ارد گرد پھیلی گھنی جھاڑیوں کا ایک ایک پتہ اس کے سامنے تھا۔

جھاڑیوں کا یہ سلسلہ پہاڑی کے وسط سے شروع ہو کر اس کی چوٹی سے تھوڑا پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ چوٹی سے ذرا نیچے سنگلاخ چٹانوں کی عمودی ڈھلانیں تھیں' جن پر سے امیر خان کی نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ سیاہ نوکیلی چٹانوں کے ننگے کناروں' عمودی ڈھلانوں اور کانٹے دار

جھاڑیوں سے پھسلتی، الجھتی، ڈگمگاتی اس کی نظروں کو بالآخر چوٹی کے ایک کونے سے میڈیم گن کی باہر کو جھانکتی نال اور اس کے ساتھ ساتھ مشین گنوں کی نالیوں نے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔

''یہ لوگ یہاں تک پہنچے کیسے اور راشن اور ایمونیشن یہاں تک کیسے پہنچاتے ہیں؟'' اس نے دوربین آنکھوں سے الگ کر کے ممدو گوجر سے پوچھا۔

''امیر خان......!'' ممدو گوجر نے اس کی طرف دیکھے بغیر سامنے پہاڑی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''دوربین کو شمال اور مشرق کے مرکز میں رکھ کر دیکھو۔''

سورج اب پہاڑی چوٹی کے سر پر چمکنے لگا تھا۔ امیر خان نے قدرے رخ بدل کر دوربین کو سیٹ کیا تو اس کی نظریں تیز کرنوں میں ننگی ہوتی ہوئی اس عمودی چٹان سے ٹکرائیں جس کی بغل میں ایک پتلی سے لکیر پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں چٹانوں کی مہیب اور سیاہ عریانی اسے مسکرا مسکرا کر ان کے ارادوں کا مذاق اڑاتی نظر آئی۔ اس چوٹی پر لگی گن کو تباہ کرنا فوجی لحاظ سے قطعی ناممکن تھا۔

امیر خان کو الجھن سی ہونے لگی، پھر یہ الجھن غصے میں بدل گئی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ ''میں تمہارا زعم خاک میں ملا دوں گا۔ کل صبح جب سورج تمہارے سروں پر خدا کا عذاب بن کر طلوع ہو گا تو یہ سامنے کا منظر بدل چکا ہو گا۔ تب اس محفوظ بنکر کے پرخچے اس میں موجود ''یم راجوں'' اور ان کے آتشیں ہتھیاروں سمیت اڑ چکے ہوں گے۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

دونوں ساتھیوں نے چونک کر امیر خان کی طرف دیکھا۔ دوربین اس کی آنکھوں سے الگ ہو چکی تھی اور اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو انگارے دہکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

یہ خیال اتنا لذت انگیز تھا کہ امیر خان کو اپنی رگ رگ میں طمانیت کا ایک سمندر ہلکورے لیتا محسوس ہوا۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

............☆☆☆............

رات اپنی مسافت بڑی تیزی سے طے کرتی دن کے تعاقب میں لپک رہی تھی۔ جنرل طارق ایک پتھر پر پاؤں رکھے پاؤں کی پنڈلی پر دھرے ہاتھ کی ہتھیلی میں اپنی ٹھوڑی جمائے سوچ میں غرق تھا۔ اس کے گرداگرد اوڑی کے اطراف میں پھیلے پہاڑوں کے درمیان وادی ایک پیالے کے پیندے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے 75 میل لمبی اس سڑک کو خالی چھوڑ دیا تو دشمن یلغار کرتا ہوا کسی بھی لمحے پاکستان کی سرحدوں تک پہنچ جائے گا۔ اگر اسے صاف راستہ مل گیا تو وہ محض تین گھنٹے میں مظفر آباد پر قابض ہو جائے گا۔

پٹھان یہاں سے فرار ہو کر اس کے لئے ایسا خلاء پیدا کر گئے تھے جس کو پر کرنا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے ''حساس مقام'' سے پسپائی اختیار کی تھی۔ ممکن ہے اگر وہ کشمیر کے کسی اور محاذ کو خالی کر جاتے تو اس کے نتائج اتنے ہولناک نہ ہوتے، لیکن یہ سڑک جو کشمیر کے سب سے زیادہ وسیع و عریض خطے میں سے گزرتی تھی، بڑی نازک اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

جنرل طارق سوچ رہا تھا کہ اگر بھارتیوں نے علی الصبح ایڈوانس نہ کیا تو بھی ان کی نگرانی کرنے والے جہاز دن کا اجالا پھیلتے ہی یہاں آ ئیں گے اور دشمن کو ''خالی علاقے'' کی خوشخبری بنا کر اس کے ایڈوانس کی راہ ہموار کر دیں گے۔ اگر خدانخواستہ دشمن اس سڑک پر قابض ہو جاتا تو سارے کشمیر میں پھیلی تحریک آزادی اپنی موت آپ مر جاتی کیونکہ اس سے لڑنے والوں کا مورال تباہ ہو کر رہ جاتا۔ یہ بڑی بھیانک صورت حال تھی۔

پاکستان سے رضا کاروں کے یہاں پہنچنے میں چند دن تو ضرور درکار تھے جب کہ صرف چند گھنٹے کا کھیل باقی تھا۔ اس محاذ کو خالی چھوڑنا کشمیر اور پاکستان کی قسمت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اندھیرے میں ایک سائے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر جنرل چونکا' قریب آنے پر جب اس کے نقوش واضح ہوئے تو اسے اپنا اردلی نظر آیا۔ وہ اسٹیشن ویگن کو روانگی کی حالت میں تیار کھڑا کر کے اپنے جنرل کے پاس آیا تھا۔ جنرل کو سلیوٹ مار کر وہ کچھ کہے بغیر چپ چاپ مودب ہو کر اگلے حکم کا منتظر ہو گیا۔

''نو'' جنرل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہم یہاں سے پیچھے نہیں جائیں گے۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''یس سر۔'' اردلی نے گردن کو خم دیا اور وہ جس سمت سے آیا تھا' اسی سمت میں اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا۔

جنرل سوچ رہا تھا کہ دشمن کو اس بات کا احساس دلانا ضروری ہے کہ قبائلی پٹھان ابھی یہاں سے نہیں گئے ہیں اور وہ اوڑی میں اس پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اس مقصد کی براری کے لئے لازم تھا کہ تخریبی کارروائیاں کی جائیں۔ جنرل نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے دشمن کے راستے میں آنے والے کچھ پلوں کو تباہ کر دے گا اور اپنی اس مختصر ترین جمعیت کے ساتھ اس انداز سے پہاڑوں میں پھیل کر ''سنائپنگ'' کرے گا کہ دشمن کے ایڈوانس کرتے کالم پر اکا دکا گولیاں اسے سنبھلنے اور با آسانی آگے بڑھتے رہنے سے باز رکھیں۔

جنرل طارق نے اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصے کو چند میل پیچھے ''بیس'' بنانے کے لئے بھیج دیا اور چار آدمیوں کے ساتھ وہاں مورچہ بند ہو کر دشمن کا منتظر ہو رہا۔

ساری رات ان لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کے آثار اب واضح ہونے لگے تھے۔ سامنے سے دشمن تو نظر نہ آیا البتہ عقب سے روشنی کی دو لکیریں جنرل طارق کو اپنی سمت لپکتی نظر آئیں۔

''کیا دشمن نے راستہ کاٹ کر انہیں گھیرے میں لے لیا ہے کیونکہ پچھلے چھ گھنٹوں سے میدان اس کے لئے خالی تھا اور اس کی کوئی نقل و حرکت سامنے سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ تھا پہلا خیال جو جنرل طارق اور اس کے ہمراہیوں کے ذہن میں کلبلایا۔

جنرل نے اپنے ساتھیوں کو فوراً پوزیشن لینے کا حکم دیا اور خود جیپ کی طرف بڑھنے لگا جو تیز رفتاری سے اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔

......صبح کاذب کے اجالے میں جیپ اب صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ پاکستان کی باقاعدہ آرمی کی جیپ تھی۔ جیپ جنرل طارق سے چند گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی اور یکے بعد دیگرے چار گبھرو پٹھان اس میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکل آئے۔ وہ شاید جنرل طارق کو پہچانتے تھے کیونکہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان کی ایڑیاں بجیں اور ان کے ہاتھ ان کی پیشانیوں کو چھونے لگے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' جنرل طارق نے انہیں جانتے بوجھتے ہوئے بھی سوال کیا۔

''سر ہم اپنی یونٹ سے......'' ان میں سے ایک جو شاید ان کا کمانڈر تھا' کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''بھاگ کر آئے ہو؟'' اس کی منہ میں رکی بات جنرل نے پوری کر دی۔

''لیس سر۔'' اس نے جواب دیا۔ باقی تینوں کے سر بھی اس کے ساتھ ہی جھک گئے۔

''کیوں؟'' جنرل نے ان پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''ہم جہاد میں حصہ لینا چاہتے تھے۔''

''تمہارا اسلحہ؟'' جنرل کے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ سے ان کے کھنچے اعصاب کو سکون میسر آنے لگا۔

''ہم نے یہ فیصلہ بالکل اچانک کیا تھا سر۔ یہ ایم۔ ٹی کا جوان ہے۔'' اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''جیپ لے کر کہیں جا رہا تھا۔ ہم نے ٹینکی فل کی اور اس طرف بھاگ آئے۔ افسوس ہم یونٹ سے اسلحہ نہ چرا سکے......!''

ان چاروں کے چہروں سے ٹپکتے جوش اور عزم نے جنرل طارق کو اس بات کا یقین دلایا کہ خدا کو اس کے حال پر رحم آ گیا ہے اور یہ چاروں جوان اس کے لئے تائید غیبی بن کر آئے ہیں۔ انہیں راستے میں بھگوڑے قبائلیوں کے قافلے بھی ملے تھے جنہوں نے انہیں بددل کر کے یہاں سے بھاگ جانے کو کہا تھا اور یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ محاذ پر اول تو کوئی رہا ہی نہیں' اگر کوئی بچا بھی ہے تو وہ کوئی پاگل ہو گا کیونکہ ان حالات میں وہاں کوئی عام انسان قیام نہیں کر سکتا۔

ان بے چاروں کو کسی نے اپنی رائفل بھی مستعار نہیں دی تھی۔ یہ چاروں جوان اپنا مستقبل اور نوکری داؤ پر لگا کر ایک عظیم مقصد کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان کی آمد گو کہ جنرل طارق کے لئے غنیمت تھی' لیکن اس نے ان کے عظیم جذبے کو ''ایکسپلائٹ'' کرنے کے بجائے انہیں حقیقت حال سے باخبر کرنا ضروری جانا۔

''محاذ کی صورت حال تمہارے سامنے ہے بہادرو۔ ہمارے ساتھی منہ موڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہم فوجی لحاظ سے نہتے ہیں۔ ان رائفلوں اور برین گنوں کی حیثیت دشمن کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ پاکستانی افواج اور برسر اقتدار طبقہ ہماری مدد کرنے کے بجائے ہمارے حوصلے پست کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہم چومکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دشمن اور اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہمیں بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی جذباتی فیصلہ تمہیں فائدے کے بجائے الٹا نقصان پہنچائے گا۔ میرا تم پر کوئی اختیار نہیں۔ میں بھی اس جنگ میں رضا کار کی حیثیت سے حصہ لے رہا ہوں۔ تم اگر چاہو تو اب بھی واپس جا سکتے ہو۔'' جنرل نے انہیں مخاطب کیا۔

''سر!'' ان میں سے ایک کی آواز جوش جذبات سے لرزنے لگی۔ ''ہم مسلمان فوج کے سپاہی ہیں۔ ہم قرآن کی سرزمین کے رکھوالے ہیں۔ ہمارے بھائیوں پر کافر ظلم توڑ رہے ہیں۔ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کو نیلام کیا جا رہا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ تماشا دیکھتے رہیں...... لعنت ہے ہماری زندگیوں پر۔''

ان کا عزم دیدنی تھا...... ''ہم آپ کے ساتھ ہی جئیں گے اور مریں گے۔'' ان کے کمانڈر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔



رات برق رفتاری سے اپنی دکان بڑھا رہی تھی۔ سورج نکلنے میں بمشکل ایک آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ دن چڑھتے ہی دشمن کی زمینی اور فضائی افواج کی سرگرمیاں شروع ہونے والی تھیں۔ جنرل نے ان چاروں کے جذبہ جہاد کو خراج تحسین پیش کیا اور انہیں رائفلیں اور ایک مشین گن دے کر اس ہدایت کے ساتھ آگے بھیج دیا کہ وہ دشمن کے ایڈوانس کرتے ہی ہراول دستے پر فائر کر کے اس کا راستہ روکے رکھیں۔

جوں ہی یہ چار سربکف جانباز اپنے ٹھکانے پر پہنچے' دشمن کی توپوں کے دہانے بھی کھل گئے۔ دشمن کی میڈیم بیٹریاں بے تحاشا گولہ باری کر رہی تھیں۔ وہ لوگ بغیر کسی نشانے کے اندھا دھند آگ برسا رہے تھے' لیکن یہ گولہ باری بالکل بے سود تھی کیونکہ جو قلیل نفری یہاں تھی وہ ان کی تباہ کاریوں سے مامون و محفوظ تھی۔

ایک گھنٹہ تک اوڑی کی پہاڑیوں میں بھارتی گولہ باری نے زلزلہ بپا کیے رکھا۔ وہ لوگ صرف دور مار گولہ باری پر ہی اکتفا کر رہے تھے اور پیش قدمی کے سلسلے میں خاصے محتاط دکھائی دے رہے تھے۔ یہ چاروں جوان اگر دشمن پر چار راؤنڈ فائر کرتے تھے تو اس کے جواب میں وہ چار ہزار راؤنڈ فائر کرتا تھا۔ یہ سودا جنرل کے لئے بڑا سستا تھا۔

وہ وقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دشمن کو دھوکے میں رکھ کر وقت حاصل کرتا رہا۔ اس دوران دن کا بھرپور اجالا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔ ان کے درجنوں طیارے آسمان پر نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی زمینی افواج کی تقلید میں بم گرانے اور مشین گنیں فائر کرنا شروع کر دیں۔ جہاں وہ فائر کر رہے تھے' وہاں سوائے پہاڑیوں اور قبائلیوں کے خالی کردہ مورچوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

جنرل اور اس کے دوسرے ساتھی اس قیامت خیز گولہ باری سے بالکل بے نیاز اوڑی کے نزدیک ایک پل اکھاڑنے میں مصروف رہے۔ انہیں دن کے پچھلے پہر اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوئی اور پل ناکارہ ہو کر ناقابل استعمال بن گیا۔

جنرل طارق نے اپنے ساتھیوں کو اس تباہ کردہ پل کے کنارے پر اس طرح پوزیشن دلا دی کہ وہ لوگ زمین اور فضا سے کی جانے والی گولہ باری سے مکمل محفوظ تھے' البتہ دشمن ان کے نشانے کی زد پر تھا۔ جنرل اور اس کے ساتھیوں کی مراد بر آئی' جب ان کی نظر دشمن کے ایک سیکشن پر پڑی جس کے سپاہی اندھا دھند گولہ باری کی آڑ میں ایڈوانس کرتے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ تباہ شدہ پل کے نزدیک وہ رک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ محفوظ آڑ میں جائیں' ان پر گولیوں کا مینہ برسنے لگا اور اس ہراول سیکشن کا بمشکل ہی کوئی جوان زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔

دشمن نے ادھا دھند جوابی گولیوں اور گولوں کا منہ برسایا' لیکن اس نے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کی۔ دراصل قبائلی پٹھانوں کا طریقہ جنگ ایسا خطرناک اور تباہ کن تھا کہ دودھ کا جلا دشمن اب چھاچھ کو بھی پھونک کر پی رہا تھا۔ بھارتی فوج کا ہر سپاہی جانتا تھا کہ اگر وہ قبائلی پٹھانوں کے گھیرے میں آ گیا تو ایک اذیت ناک موت اس کا مقدر بن کر رہ جائے گی۔ قبائلی یہاں موجود نہیں تھے' لیکن ان کی پھیلائی دہشت ہیبت ناک بھوتوں کی شکل میں بھارتی اور ڈوگرہ فوجیوں کے دل و دماغ پر مسلط تھی۔

شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ سورج کی سرد اور کپکپاتی روشنیوں کا سفر اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے ساتھ بھارتی توپوں کی گولہ باری بھی سرد پڑنے لگی اور رات ہوتے ہی انہوں نے فائرنگ مکمل بند کر دی۔ تاریک رات کا ہولناک سناٹا ماحول کو ڈسنے لگا۔

یہ لمحات جنرل طارق اور اس کے ساتھیوں کے لئے غنیمت تھے۔ وہ لوگ پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے مسلسل بیدار تھے۔ سکون کے کچھ لمحات ان لوگوں نے آپس میں بانٹ کر گزارے اور صبح کا دھندلکا نکھرنے سے پہلے دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔

انہوں نے دشمن کے ہراول پر اپنی نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ برق رفتاری سے یہ مٹھی بھر سرفروش پہاڑیوں پر بھاگتے دوڑتے رہے۔ کبھی وہ ایک پہاڑی سے چند راؤنڈز فائر کرتے' کبھی دوسری سے۔ اس دوران ان کی کوشش یہی رہی کہ دشمن کو دائیں بائیں بکھر کر ایڈوانس نہ کرنے دیں۔ انہیں اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی اور بھارتی لشکر اس سڑک پر سمٹ کر رہ گیا۔

جنرل طارق کے ساتھی پیچھے ہٹتے ہوئے سڑک پر آنے والے مختلف پلوں کو باری باری تباہ کرتے جا رہے تھے اور ایڈوانس کرنے کے لئے ضروری تھا کہ بھارتی فوج ہر پل پر قبضہ کرتی۔

یہ آنکھ مچولی چھ دن تک جاری رہی۔ اس دوران جنرل طارق اور اس کے سربلند ساتھیوں نے دشمن کو سست رفتار اپنانے پر مجبور کر دیا۔ چھٹے روز وہ اپنے مختصر ترین لشکر کے ساتھ اوڑی سے پندرہ میل پیچھے چکوٹھی کے مقام پر ایک گہرے نالے کے کنارے نئی مورچہ بندیاں کر رہے تھے۔ ابھی تک پاکستان سے کوئی مدد نہیں آئی تھی۔

............☆☆☆............

شیرو نے حوالدار غلام محمد کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا جو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے علم ہے چاچا......!'' اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ ''لیکن کوئی بھی جذباتی قدم ہمیں لے ڈوبے گا۔ آپ لوگ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ شہر میں تین بٹالین فوج موجود ہے۔ اردگرد کے مسلمان اول تو زندہ نہیں بچے' اگر کوئی بدقسمتی سے بچ بھی گیا ہے تو وہ اتنا خوف زدہ ہے کہ اپنی جان بچانے کے سوا اسے کسی اور بات کا ہوش نہیں۔ ہم جموں اور سری نگر کے درمیان بھارتی فوج کے سیلاب میں پھنسے بیٹھے ہیں۔ ہوم گارڈز کو پہلے ہی لوگ شیخ عبداللہ کی فوج سمجھتے ہیں اور مقامی ہندوؤں کو علم ہے کہ ہم مسلمان بھلے لاکھ نیشنلسٹ ہونے کی دہائی دیتے رہیں' وہ ہم پر کبھی اعتبار نہیں کریں گے۔ ''سونی لاج'' کی ساری کہانی میرے علم میں آ چکی ہے۔ بخدا مجھ میں غیرت ابھی زندہ ہے۔ آپ لوگ ذرا صبر کریں۔ ابھی ہم صرف 'انتظار کرو اور دیکھو' کی پالیسی پر عمل کریں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''اوہ میرے خدایا! اس بے غیرتی سے تو موت ہی آ جاتی۔'' حوالدار غلام محمد نے آہ بھری۔

''کاش ہمیں نبی خان نے اس طرف نہ بھیجا ہوتا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے یہ ظلم ہو رہا ہے اور ہم......'' ان کا تیسرا ساتھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو رہا۔

''خدا کے لئے...... آپ لوگ ایسی باتیں نہ کیجئے۔ ابھی وقت نہیں۔ ابھی......'' وہ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

''بہر حال حتمی فیصلہ تو تمہی کو کرنا ہے' لیکن میرا فرض تھا کہ تمہیں اپنے سپاہیوں کے جذبات سے آگاہ کر دوں۔ یہ لوگ پونچھ سے تمہارے ساتھ ہی آئے ہیں اور تم انہیں مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہو...... میں اور روزیرا انہیں ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن خیال رکھنا کہ یہ لوگ زیادہ دیر

تک چپ رہنے والے نہیں ہیں۔'' حوالدار غلام محمد نے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔

''میں بھی ان ہی میں سے ہوں چاچا غلام محمد اور میری رگوں میں بھی سدھنوں کا باغیرت خون دوڑ رہا ہے۔ جب کبھی وقت آیا' بخدا تم مجھے سب سے آگے پاؤ گے۔'' اس مرتبہ فرط جوش و جذبات سے شیرو کی آواز کانپنے لگی تھی۔

............☆☆☆............

اشونی کمار نے اپنی آنکھیں بدستور چوکیدار پر جما رکھی تھیں۔ ''جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے بڑے سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''درگا ماں کی قسم مالک!'' چوکیدار نے دونوں ہاتھ باندھ دیئے...... ''وہ ہندو نہیں۔''

''لیکن تمہیں بتایا کس نے؟'' اشونی کمار نے پولیس والے مخصوص لہجے میں اس سے پوچھا۔

''مائی باپ! مجھے تک تو اسی روز شک ہو گیا تھا جس روز میں نے اس سے چھوکریوں کی بات کی تھی۔ پچھلے پندرہ بیس سال سے اسی ڈاک بنگلے پر صاحب لوگوں کی سیوا کرتا رہا ہوں مالک۔'' اس نے چاپلوسی اختیار کی۔

''آگے بکو۔'' اشونی کمار چلایا۔

''میں نے خود نگرانی شروع کر دی تھی اس کی۔'' چوکیدار سہم کر بولا۔ ''اسے میں نے نماز پڑھتے دیکھا تھا' پھر حوالدار جانکی داس کو میں نے اس کے پیچھے لگا دیا۔''

''ہوں......'' اشونی کمار نے بڑی لمبی ''ہوں'' کہہ کر دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی کو بار بار دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ چوکیدار کمرے کے ایک کونے میں سکڑا سمٹا کھڑا تھا۔

معاملات اس کی توقع کے بالکل برعکس پیش آ رہے تھے۔ اسے تو یہی امید تھی کہ جب وہ اشونی کمار کے سامنے یہ انکشاف کرے گا کہ پرتاب ٹھاکر ہندو نہیں' مسلمان ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے گا اور اسے ضرور ہمیشہ کی طرح انعام سے نوازے گا۔ خوشی کا اظہار کرنے کی بجائے الٹا پولیس افسر اشونی کمار نے اسے الٹے سیدھے سوالات کر کے پریشان کر ڈالا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ کمرے میں رکھی میز کے ایک کونے سے ٹیک لگا کر اس نے اپنے سامنے کھڑے ڈاک بنگلے کے چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو!'' اس نے بڑی بارعب آواز میں کہا۔ ''تم یہ بھول جاؤ کہ پرتاب ٹھاکر مسلمان ہے یا تم نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اس بات کا کسی سے بھول کر بھی ذکر نہ کرنا۔ کسی کو یہ بھی نہیں بتانا کہ تم میرے پاس آئے ہو......اور وہاں تمہاری یہاں آمد کا تو کسی کو علم نہیں ہوا؟''

''سرکار! صرف بھوپت رائے کو پتہ ہے کہ میں آپ کی سیوا کیا کرتا ہوں۔ وہی مجھے ''نئے مال'' کی اطلاع دیا کرتا ہے نا......اس سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔'' چوکیدار نے ہاتھ باندھے۔

''ٹھیک ہے اس سے یہی کہنا کہ تم میرے پاس ''تازہ مال'' کی خبر کرنے آئے ہو۔ اب جاؤ۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک نوٹ نکال کر

اس کی طرف بڑھایا۔

''دھن واد مہاراج جی'' چوکیدار کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اشونی کمار کی گونج دار آواز نے اس کے قدم پکڑ لئے۔

''ادھر نہیں۔'' اس نے مخالف سمت والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ادھر سے۔''

چوکیدار جانتا تھا کہ جس دروازے کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہے' اس کے باہر دور دور تک کسی جاندار شے کا وجود ہی نہیں ہے۔

انسپکٹر اشونی کمار کو بٹوٹ کے مقامی بادشاہ کی حیثیت ہوم گارڈز کے آنے سے پہلے حاصل تھی۔ مقامی ہندو لٹیرے اس کی سربراہی میں بٹوٹ اور اس کے گرد اگرد سارے علاقے میں لوٹ مار مچا رہے تھے۔ اس کا حصہ ہر دوسرے تیسرے دن نقدی' سونے اور طرح طرح کی لڑکیوں کی شکل میں اس تک پہنچ جاتا تھا۔ ہم گارڈز کی اچانک آمد سے اس کا کام گو کہ رکا نہیں تھا' لیکن اس میں وہ پہلے کی سی تیزی باقی نہیں رہی تھی۔

جن جن علاقوں میں ہوم گارڈز آئے تھے' وہاں خوفزدہ اور بچے کھچے مسلمانوں نے اب سنبھلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات انسپکٹر اشونی کمار کے لئے خاصی تکلیف دہ تھی کہ اب مسلمان اکا دکا مقامات پر مدافعت بھی کرنے لگے تھے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ جیسے بھی ہو' ہوم گارڈز یہاں سے چلے جائیں۔ فوج کی طرف سے مایوس ہو کر اب اس نے خود کوئی خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے سامنے مسلمانوں کی بہت بڑی کمزوری ان کی ''غیرت'' کی شکل میں موجود تھی۔ اس کے اجداد نے اسے نسل در نسل ایک ہی سبق سکھایا تھا کہ یہاں پہلا مسلمان سندھ کے راستے محمد بن قاسم کی شکل میں محض ایک مسلمان لڑکی کی پکار پر چلا آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے اجداد اپنی مقدور بھر کوشش سے مسلمانوں کو بے غیرت بنانے لگے تھے۔

''براہ راست ان لوگوں کی غیرت پر ہاتھ ڈالا جائے۔'' اس نے سوچا۔

اور اب اشونی کمار یہی خطرناک عزائم لے کر ''سونی لاج'' کی طرف جا رہا تھا۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے اور وہ اپنے عملے کے سارے کے سارے بیس پچیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ اس طرف رواں دواں تھا۔

☆☆☆

ڈاک بنگلے کی سمت آنے والی سڑک کے ایک کنارے پر درختوں کے جھنڈ میں گشت کرتے سپاہی اللہ داد نے جب پولیس کی اس بھیڑ کو اس طرف آتے دیکھا تو اس کا ماتھا کسی پیش آمدہ خطرے کے احساس سے ٹھنکا۔ اندھیرے کی برفیلی چادر نے آہستہ آہستہ بٹوٹ کے دم توڑتے اجالوں کو ڈسنا شروع کر دیا تھا' لیکن ابھی اتنا اندھیرا ابھی نہیں ہوا تھا کہ وہ سامنے کے منظر کو اچھی طرح دیکھ ہی نہ پاتا۔

چند لمحے کشمکش کا شکار رہنے کے بعد اس نے وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ یہاں معمول کی گشت ڈیوٹی کر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی ان لوگوں کو ڈاک بنگلے کے گرد اگرد علاقے میں شرپسندوں کی ممکنہ کارروائیوں سے نمٹنے کے لئے پہرے پر متعین کر دیا جاتا تھا۔ اگر وہ یہیں رہتا تو ان لوگوں کی نظروں میں آ جاتا' جو اسے گوارہ نہیں تھا۔ پولیس کا اس طرف آنا تو کوئی خطرناک بات نہیں تھی' لیکن اتنے ہجوم کے ساتھ انسپکٹر اشونی کمار کی

آمد نے اسے ضرور مشکوک کر دیا تھا۔ سپاہی اللہ داد نے دیکھ لیا تھا کہ آنے والوں نے رائفلیں بھی تھام رکھی تھیں اور کئی ایک کے کندھوں سے لٹکتی گولیوں کی پٹیاں بھی اسے دکھائی دینے لگی تھی۔

سپاہی اللہ داد پیچھے ہٹ کر ایک محفوظ آڑ میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مزید احتیاط کی خاطر ایک درخت کو تاکا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک درخت کی ٹہنیوں میں چھپا ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ سونی لاج سے یہ سڑک سیدھی ڈاک بنگلے کی طرف آتی تھی' لیکن وہ لوگ سونی لاج والے موڑ سے اسی عمارت کی طرف گھوم گئے۔

سپاہی اللہ داد کو سارے معاملات کی سمجھ آ گئی۔ وہ چونکا۔ اس نے دو سائے قریباً بھاگتے ہوئے پولیس والوں کی طرف آتے دیکھے۔ یہ شاید مقامی ڈیوٹی پر متعین گارڈ کے لوگ تھے۔ سپاہی اللہ داد بغیر آواز پیدا کیے درخت سے اترا اور بھاگتا ہوا ڈاک بنگلے میں جا پہنچا۔ شیرو اور حوالدار غلام محمد اسے باہری برآمدے ہی میں کھڑے نظر آ گئے۔ دونوں آپس میں کسی مسئلے پر غور کر رہے تھے جب انہوں نے سپاہی اللہ داد کو بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔

''خیریت......؟'' اس کے وہاں رکتے ہی کچھ کہنے سے پہلے حوالدار غلام محمد بولا۔

''چاچا!'' مسلسل اور تیزی بھاگنے سے سپاہی اللہ داد کا دم پھولا ہوا تھا۔ ''ادھر بٹوٹ کی ساری پولیس آ گئی ہے۔ وہ ادھر...... سونی لاج کی طرف......''

''کیا سونی لاج کی طرف؟'' غلام محمد نے اس کی بات کاٹ کر، بے چینی سے دریافت کیا۔ ''ہاں...... ہاں چاچا! وہ لوگ ادھر سونی لاج کی طرف گئے ہیں۔'' سپاہی اللہ داد نے اپنی بات مکمل کر دی۔

''کیا کرنے'' اس مرتبہ شیرو اس سے مخاطب تھا۔

اسے اپنی بات کا جواب بجائے سپاہی اللہ داد کے سونی لاج کی طرف سے اٹھنے والی چیخوں نے دیا۔

''تمام جوانوں کو فال ان کرو۔'' شیرو نے برآمدے سے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔

حوالدار غلام محمد نے اپنی جیب سے سیٹی نکال کر بجانی شروع کر دی۔ جب تک شیرو اپنی اسٹین گن اور گولیوں کا تھیلا اٹھا کر باہر آتا' ہوم گارڈز کے وہ جوان جن کے کانوں تک سیٹی کی آواز پہنچی تھی' وہاں پہنچ چکے تھے۔

''پانچ جوان یہاں رک جاؤ' باقی دو سیکشنوں میں بٹ جاؤ...... چاچا پانچ جوان میرے ساتھ جائیں گے۔ باقی کو تم میرے تعاقب میں لے کر آؤ۔ نزدیک آنے کی ضرورت نہیں' جب تک میری طرف سے اشارہ نہ ملے' کوئی جوان گولی نہیں چلائے گا۔'' شیرو نے قہر برساتی آواز میں ہدایات جاری کیں۔

پانچ جوان اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی آگے بڑھ آئے۔ ''میں آگے چلوں گا' تم لوگوں کو میرے پیچھے لانا۔ فاصلہ دس قدم...... احتیاط سے...... آواز پیدا نہ ہو...... ایڈوانس جوان!'' اس نے آگے نکلتے ہوئے کہا۔

''پوزیشن جوان...... دائیں تین جوان پھیلو...... محمد دین بائیں نکلو...... فاصلہ پانچ گز...... تیار جوان...... ایڈوانس!'' اپنے عقب میں اسے حوالدار غلام محمد کی آواز سنائی دی۔

ابھی وہ لوگ پندرہ بیس گز آگے ہی بڑھے تھے جب اچانک ننگے سر ایک لڑکی چیختی چلاتی سونی لاج کی طرف سے بھاگ کر اس طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے گلے سے ایسی خوفناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں جیسے کوئی قصائی کسی بکری کو ذبح کر رہا ہو۔ وہ بھاگتے بھاگتے دو تین مرتبہ گرتے گرتے بچی تھی۔ شیرو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ سکے' سامنے سے بھاگ کر آئی ہوئی عورت اس سے ٹکرا گئی۔ خوف اور دہشت سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے...... کیا ہوا؟'' شیرو نے اس کا بازو تھام کر اسے خود سے الگ کر کے قریباً جھنجھوڑتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہ...... وہ درندے وہاں......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ لفظ اس کے گلے میں کہیں اٹک کر رہ گئے۔

''گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے مسلمان بھائی ہے۔'' ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کو تسلی دی، لیکن اس کی وحشت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ خوف اور دہشت سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ شیرو کو دیکھتی رہی۔

''اسے وہاں موجود جوانوں کی حفاظت میں دے آؤ۔'' شیرو کی آواز میں صاعقہ کی کڑک تھی۔

سپاہی سہمی ہوئی لڑکی کو جو سر سے ننگی ہی کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کے چنگل سے نکل کر یہاں تک آ گئی تھی' بڑی آہستگی سے بازو پکڑا اور تیز تیز قدموں سے واپس آ گیا۔ وہ لوگ جوں جوں ''سونی لاج'' کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے' وہاں بپا قیامت صغریٰ ان کی سماعت کو اور تیزی سے جھنجھوڑنے لگی تھی۔

شیرو نے اسٹین گن کو پوزیشن میں کر لیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو اس نے چند قدم پیچھے ہی محفوظ آڑ میں بکھر کر پوزیشن لینے کا حکم دیا تھا۔ ابھی وہ چند گز دور ہی تھا جب اچانک ''ہالٹ'' کی آواز سن کر رک گیا۔

''کون ہو تم؟'' اندھیرے سے آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طاقتور ٹارچ بھی روشن ہوئی تھی جس کی روشنی ایک پہلو سے لپکی اور ماحول قدرے ننگا ہو گیا۔

''میں ہوم گارڈز کا کمپنی کمانڈر ہوں۔'' شیرو کی آواز سنائی دی۔ ''اپنے افسر کو بلاؤ۔''

اس نے للکارنے والے کو حکم دیا۔

''پرتاب رائے!'' اس کے عقب میں آواز بلند ہوئی۔ ''ہم کوئی جھگڑا نہیں چاہتے' یہاں لڑکیاں غیر محفوظ تھیں۔ میں انہیں لے جانے آیا ہوں۔'' یہ انسپکٹر اشونی کمار تھا۔

''اشونی کمار تین منٹ کے اندر اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ تم سب کتے کی موت مارے جاؤ گے۔'' شیرو کی دھاڑ گونجی۔ ''تمہاری واپسی کسی بھی عورت کے بغیر ہو گی۔''

شیر واشونی کمار کا جواب سننے سے پہلے ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ابھی وہ بمشکل چند قدم پیچھے ہی ہٹا تھا جب ایک گولی اس کے کان کے قریب سے شائیں کی آواز پیدا کرتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے دوسرے ہی لمحے شیر وا اپنی جگہ سے جست لگا کر قریبی گھاس میں پہنچ چکا تھا۔ پاؤں زمین پر ٹکتے ہی وہ پوزیشن میں آ گیا اور اب وہ سانپ کی طرح اس لمبی جنگلی گھاس کے اندر ہی اندر رینگتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔

ایک جگہ رک کر اس نے اندازے سے برسٹ مارا۔ دو تین زوردار چیخیں بلند ہوئیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی محنت اکارت نہیں گئی۔

اس کے ساتھ ہی اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں اطراف گولیاں چلنے لگیں۔ جلد ہی شیر وا اور اس کے ساتھیوں نے انسپکٹر اشونی کمار کے پہلے سے پوزیشن میں بیٹھے سپاہیوں کا اندازہ کر لیا تھا۔

حوالدار غلام محمد اپنی سیکشن کے ساتھ سونی لاج سے باہر جانے والی سڑک پر پوزیشن لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ساتھی کو ہدایت دے کر پیچھے روانہ کر دیا۔ جلد ہی اس کی مراد بر آئی جب اس نے انسپکٹر اشونی کمار اور اس کے دو سپاہیوں کو فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے دیکھا۔ اندھیرے میں ان کے نقوش تو نمایاں نہیں ہو رہے تھے' لیکن اس کی جسامت اور چلانے کا مخصوص انداز اس کی نشاندہی کے لئے کافی تھا۔

انسپکٹر اشونی کمار اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوم گارڈز کو فائرنگ میں الجھا کر اسی ارادے سے پیچھے ہٹا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر آرمی کے پاس جائے اور وہاں پولیس پر ''مسلمان ہوم گارڈز کے حملے'' کی دہائی دے کہ ان کی مدد سے سب کو چن چن کر مروا ڈالے' لیکن وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ حوالدار غلام محمد اس کی سیکشن کے باقی جوان موت کے فرشتے بن کر اس کی راہ تک رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی رائفلوں سے رک رک کر فائر کرتے مختلف درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں پسپا ہو رہے تھے۔ جب اچانک اشونی کمار کی پشت میں یکے بعد دیگرے گھسنے والی درجنوں گولیوں نے اسے اوندھا کر دیا۔ یہی حشر اس کے باقی ساتھیوں کا بھی ہوا تھا۔

فائرنگ کے پس منظر میں ڈوبتی ابھرتی مظلوم عورتوں کی چیخیں قیامت کا سا سماں برپا کئے ہوئے تھیں۔ بیس پچیس منٹ ہی میں مداخلت دم توڑ گئی۔ آٹھ پولیس والے مارے گئے تھے' چار زخمی تھے اور باقی شاید بھاگ گئے تھے۔ سہمی ہوئی خوف زدہ مظلوم مسلمان زادیاں انہیں رحمت کے فرشتے سمجھ کر ان کے حضور فریاد کناں تھیں۔

حوالدار غلام محمد اپنی سیکشن سمیت وہاں آ گیا تھا۔ شیر و کو وقت کا احساس بڑی شدت سے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک ایک لحہ قیمتی ہے۔ اول تو اب تک آرمی کو فائرنگ کی آوازوں سے صورت حال کا اندازہ ہو چکا ہوگا' اگر نہیں تو جیسے ہی آرمی تک کوئی ''مظلوم پولیس والا'' پہنچا اور اس نے ٹسوے بہا بہا کر ہوم گارڈز کے مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں پولیس کے قتل عام کی خبر دی تو فوج فوراً حرکت میں آ جائے گی۔

گیم اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی' لیکن اس کے ''فولادی اعصاب'' میں ایسی خوبی تھی جس کو حسین خان کی عقابی نگاہوں نے دیکھا اور پرکھ لیا تھا۔

''چاچا غلام محمد! اپنے ساتھ دس جوان لے کر تمام عورتوں سمیت ٹرک میں سوار ہو جاؤ اور ناشری نالے کے پاس پہنچ کر ہمارا انتظار کرو۔ اگر ہم لوگ ایک گھنٹے تک پہنچ جائیں تو بہتر...... ورنہ تم عورتوں کو لے کر سری نگر کی طرف نکل جاؤ۔'' اس نے بوڑھے غلام محمد کو کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن تم لوگ......'' غلام محمد نے کچھ کہنا چاہا۔

''یہ بحث کا وقت نہیں حوالدار غلام محمد۔'' اس کا لہجہ غلام محمد کے لئے اجنبی تھا۔ ''باقی جوان میرے ساتھ پیدل چلیں گے۔ ہم لوگ سری نگر روڈ پر رک کر صورت حال پر قابو پائیں گے۔ ہیڈ کوارٹر کو سری نگر میں تازہ صورت حال سے آگاہ کردو۔ ان کی طرف سے کوئی جواب آنے تک اگر فوج نے مداخلت کی تو ہم انہیں راستے میں روکنے کی کوشش کریں گے۔ حوالدار غلام محمد اگر ایک گھنٹے تک میری طرف سے کوئی پیغام نہ آئے تو تم لوگ نالے کا پل اڑا کر سری نگر کی طرف نکل جاؤ...... جلد کرو۔'' اس نے مزید کسی کی کوئی بھی بات سننے سے پہلے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔

جوان ڈاک بنگلے کی طرف بھاگتے ہوئے جا رہے تھے اور شیرو اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود سہمی ہوئی مسلمان عورتوں کو تسلی دے رہا تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسلمان زادی کی طرف بری نگاہ نہیں ڈال سکتا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں ہوم گارڈز کا وہی ٹرک کھڑا تھا جس پر وہ لوگ سری نگر سے یہاں آئے تھے۔ تمام عورتوں کو اس میں سوار کرانے کے بعد دس پہلے سے تیار شدہ جوان چھلانگیں لگا کر اس میں بیٹھ گئے۔

اللہ نگہبان بیٹا! خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ ابھی کشمیر کو تم جیسے بیٹوں کی بہت ضرورت ہے۔'' حوالدار غلام محمد نے جو سر جھکائے شیرو کے قریب کھڑا تھا' سب سے آخر میں ٹرک میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

''فی امان اللہ!'' نیچے کھڑے مجاہدین نے انہیں سپرد خدا کیا۔

ٹرک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوا اور جلد ہی سامنے والے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شیرو ابھی واپس اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا ہی تھا کہ اسے وائرلیس آپریٹر پریشان صورت اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''سیٹ خراب ہو گیا ہے۔'' اس نے شیرو سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''تم نے کوشش کی اسے ٹھیک کرنے کی؟''

''جناب ہر طرح کی کوشش کے بعد ناکام ہو کر ہی آپ تک آیا ہوں۔''

''اوہ......!'' شیرو کے منہ سے نکلا۔

وائرلیس سیٹ کے بگڑنے کے بعد اب ان کے پاس سری نگر پیغام بھیجنے کا واحد ذریعہ بٹوٹ کا ٹیلی گراف آفس تھا۔ سری نگر' بانہال' کشتواڑ' بھدرواہ' ڈوڈہ غرض ہر جگہ یہاں سے ہو کر ہی تار جایا کرتی تھی۔ اس لئے اس ٹیلی گراف آفس کو نیوز ایجنسی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

شیرو جانتا تھا اس وقت پوسٹ ماسٹر گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو گا۔ اس کا گھر بٹوٹ کے ہندو محلے میں تھا جہاں تک اول تو ہوم گارڈز کے کسی سپاہی کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' اگر کوئی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں پہنچ ہی جاتا تو اس بات کے مواقع بہت ہی کم تھے کہ متعصب ہندو پوسٹ ماسٹر ان کی خاطر وہ آفس کھول دے گا۔

مقامی مسلمان آبادی کا صفایا کرنے کے بعد اب شر پسندوں کو ہر وہ شے بری طرح کھٹکنے لگی تھی جس سے مسلمانی کی ذرا بھی بو آئے۔ اس صورت حال کے باوجود ایک جوان پوسٹ ماسٹر کے گھر جانے کو تیار ہو گیا۔ شیرو کے کہنے پر اس نے اپنی وردی اتار کر سویلین کپڑے پہن لئے تھے۔

ابھی وہ بمشکل چند گز دور ہی گیا تھا کہ ہوم گارڈز کا ایک جوان بڑی تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا اس طرف آیا۔ یہ گشتی پٹرول پارٹی کا جوان تھا جسے شیرو نے حفظ ماتقدم کے لئے بوٹ کی طرف روانہ کیا تھا اور ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ فوجیوں کے ''عارضی ہیڈ کوارٹر'' سے اس طرف آنے والی سڑک پر نظر رکھیں' جیسے ہی کوئی غیر معمولی حرکت نظر آئے' اسے اطلاع دی جائے۔

''فوج اس طرف آ رہی ہے۔'' اس نے دور ہی سے چلاتے ہوئے کہا۔

''تمام جوان اپنا اپنا اسلحہ اٹھا کر سری نگر روڈ کی طرف چلو۔'' شیرو نے انہیں حکم دیا اور ساتھ ہی وہ بھی ڈاک بنگلے کی طرف بھاگا تاکہ وہاں موجود ایمونیشن اٹھا سکے۔

............☆☆☆............

دونوں گہری نیند سو رہے تھے جب اچانک ہی بوستان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ خواب کچھ ایسا ہی ڈراؤنا تھا۔ وہ پونچھ کا رہنے والا انڈین آرمی کا سابقہ نائیک تھا اور پچھلے دو ماہ سے چوری چھپے ''صاعقہ'' کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس کے گاؤں پر پچھلے ہی ہفتے جب بھارتی فوج شہر میں داخل ہوئی تھی' حملہ ہوا تھا۔ بریگیڈیئر پریتم سنگھ نے شہر میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا تھا کہ شہر کے گرد و نواح میں چھپے شرپسندوں کو گرفتار کروانے والوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ مفرور شرپسندوں کے گھر بار کو آگ لگا دی جائے گی اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اپنی اس دھمکی کو فوج نے اب تک کئی مرتبہ عملی جامہ پہنانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ شہر کی مسلمان آبادی بری طرح سہمی ہوئی تھی اور یہی بریگیڈیئر پریتم سنگھ چاہتا تھا کیونکہ شہر کے اندر سے ہونے والی کوئی بھی جارحانہ کارروائی اس کی فوج کے لئے موت کا پروانہ ثابت ہو سکتی تھی۔

بوستان نے خواب میں اپنے بچے اور بیوی کا جو حشر دیکھا تھا' اس نے حقیقی دنیا میں آ جانے کے بعد بھی اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ عام زندگی میں وہ کوئی بزدل آدمی نہیں تھا۔ اگر بزدل ہوتا تو کبھی نبی خان کی نظر انتخاب اس پر نہ ٹھہرتی۔ ضرور اس میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے ''صاعقہ'' میں شامل کیا تھا۔

لیکن وہ کمزور لمحہ...... ! وہ لمحہ اسے بزدل بنا گیا۔ یہاں اس شہر میں انسان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ جس کسی پر معمولی سا بھی شبہ ہو جاتا' اسے اس کے اعزا سمیت ایک اذیت ناک لیکن فوری موت سے دوچار کر دیا جاتا تھا۔ ابھی پرسوں کا واقعہ تھا جب فوج نے پونچھ جیل سے مقامی لیڈروں کو رہا کر کے پل پر پہنچایا اور وہاں پہلے سے تیار شدہ مسلح بلوائیوں کے حوالے کر دیا تھا جنہوں نے ان کے اعضاء کاٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بمشکل ایک دو خوش قسمت ایسے تھے جو دریا میں چھلانگیں لگا کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

یہ واقعہ پونچھ کے مسلمانوں کے ذہنوں پر سوار تھا اور بڑے بڑے جی دار بزدل بن چکے تھے۔ بوستان کا ذہن رہ رہ کر اپنے اکلوتے بیٹے اور بیوی کی طرف پلٹتا تھا جن کے بغیر اس کی زندگی بے معنی تھی۔ اس کا ان دونوں کے علاوہ اور تھا ہی کون؟ کبھی کبھی تو وہ خود حیران ہو جاتا تھا کہ آخر ایسی ''کمزوری'' کے ہوتے ہوئے اس نے اتنی خطرناک زندگی کیوں اپنا لی ہے۔ اسے اپنے رویے کی کوئی سمجھ نہیں آتی تھی۔

لیکن آج...... آج بوستان کی حیثیت ایک بزدل اور سہمے ہوئے بچے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری

تھی۔ دماغ کا فیصلہ یہی تھا کہ بھارتی فوج کے مرکز پر پیش ہو کر ''صاعقہ'' کے مقامی اڈے اور ممدو اور اس کے دونوں ساتھیوں کے عزائم سے آگاہ کر کے جان کی امان اور انعام واکرام پالے جب کہ دل اس فیصلے پر ملامت کرتا تھا۔

وہ ضمیر کی اذیت ناک مار سہہ رہا تھا اور اس کا دوسرا ساتھی آنے والی قیامت سے بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے کھانا تیار کیا تھا۔ رات اس نے جاگ کر ہی گزاری تھی اور اب قدرے مطمئن ہو کر لیٹ گیا تھا کہ نیند نے اسے آلیا۔

دوپہر تک بوستان کے اندر خاصی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی' لیکن بادل نخواستہ ہی سہی اس نے بزدلی ہی کو مصلحت جان لیا تھا۔ اس کے ساتھی نے کھانا تیار کیا تھا۔ انہیں یہاں سے رات کے دوسرے پہر امیر خان اور اس کے ساتھیوں کی آمد کے بعد ہی روانہ ہونا تھا۔ بوستان نے بمشکل دو چار لقمے زہر مار کئے تھے۔ اپنے ساتھی کے استفسار پر اس نے پیٹ کی خرابی کا بہانہ کر کے بظاہر اسے مطمئن کر دیا تھا' لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے اندر برپا ہونے والی کشمکش اس کے رویے پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور اس کے درمیانی عمر کے ساتھی نے اس میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔

''کیا بات ہے بوستان' تم کچھ مطمئن نہیں نظر آ رہے؟'' بالآخر اس نے اپنا عندیہ بوستان پر ظاہر کر ہی دیا۔

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔ بس یونہی دراصل پچھلے دو چار دن سے مجھے پیٹ کی تکلیف نے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔''

''شہر سے کوئی دوائی لے آؤ۔'' اس کے ساتھی نے ہمدردی ظاہر کی۔

''ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں' پھر شہر کے حالات......'' بوستان نے بات نامکمل ہی چھوڑ دی' لیکن وہ قدرے مطمئن بھی ہو گیا کہ اس طرح یہاں سے ہٹنے کا کوئی بہانہ تو اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔

''بوستان ہمیں رات کو نہ جانے اور کتنا سفر کرنا ہے۔ میرے خیال سے بہتر یہی ہے کہ تم کوئی دوائی لے آؤ۔'' اس کے ساتھی نے کہا جو بوستان کو بے چین تو پاتا تھا' لیکن اس کی پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اب جیسے اس کی پریشانی جان کر مطمئن ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو جاتا ہوں۔'' بوستان اٹھ کھڑا ہوا۔

سہ پہر کو وہ اپنے ٹھکانے سے نکلا تھا اور سورج غروب ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے پریتم سنگھ کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے باہر کھڑا وہ بڑی اذیت ناک سوچ میں گرفتار تھا۔ اپنے زندہ ضمیر کو سلانے کے لئے اسے کسی دلیل یا منطق کی گولی ابھی میسر نہیں آئی تھی۔ اسے رہ رہ کر عجیب وغریب خیالات گھیرے ہوئے تھے' پھر بچے اور بیوی نے ساری سوچوں کو نگل لیا۔ ''یہ ساری جدوجہد بے کار ہے...... ایک دم بکواس...... کشمیر کبھی آزاد نہیں ہوگا۔ سب لیڈر سرکار سے ملے ہوئے ہیں۔ تمام شیر عہدوں کی ہڈی منہ لگتے ہی گیدڑ بن چکے ہیں۔ پاگل ہے نبی خان۔ ہم سب پاگل ہیں۔ خواہ مخواہ خود کو موت کے منہ میں ڈال رہے ہیں۔ اپنا گھر بار تباہ کروا رہے ہیں۔ اس فوج کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کوئی نہیں۔'' وہ بڑبڑاتا خیموں کی اس قطار کی طرف بڑھ رہا تھا جو ایک عمارت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہی تھا بریگیڈیئر پریتم سنگھ کا ہیڈ کوارٹر۔

''ہالٹ'' کی زوردار آواز سن کر وہ سہم کر رک گیا۔ ایک سپاہی رائفل تانے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''اے کدھر جائے گا؟'' آنے والے

نے درشت لہجے میں اسے مخاطب کیا اور بوستان کو یوں لگا جیسے وہ کسی خواب سے اچانک چونک کر بیدار ہوا ہو۔

''میں......میں بریگیڈیئر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ سپاہی کو معاملہ کوئی گڑ بڑ نظر آ رہا تھا۔ ''ہینڈز اپ!'' اس نے بوستان کو للکارا اور اس کے ہاتھ کسی مشینی عمل کے تابع اوپر اٹھتے چلے گئے۔

''ادھر چلو مسلا! ابھی ملاتا ہے تیرے کو بریگیڈیئر صاحب سے۔'' سپاہی نے اسے رائفل کی نال سے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

بوستان کسی ''معمول'' کی طرح اس کے آگے چل رہا تھا۔ سپاہی اسے کمپنی کمانڈر کے پاس لے آیا تھا۔ ''صاحب!'' اس نے اپنے افسر کو تعظیم دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ مسلا بریگیڈیئر صاحب سے ملنا مانگتا ہے۔'' نفرت اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

کیپٹن پیارے چند نے اپنی میز کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کھڑے بوستان کی آنکھوں میں جھانکا۔ چند سیکنڈ ٹکٹکی باندھے وہ بوستان کو گھورتا رہا جس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ پھر اس نے میز پر رکھی گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا۔ دو مسلح سپاہی اندر آ گئے۔

''تلاشی لو اس کی۔'' اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا جنہوں نے بوستان کو فوراً سارے کپڑے اتار دینے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی تین رائفلوں کی نالیاں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

''یہ......یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے بے بسی سے کچھ کہنا چاہا' لیکن اپنے دائیں پہلو پر لگنے والی زوردار لات نے اسے الٹا کر رکھ دیا۔

''بکومت! کپڑے اتارو۔'' بوستان کے پیچھے کھڑے حوالدار نے جو رائفل پر چڑھی سنگین اس کی پسلیوں میں چبھوئے تھا' کہا۔

خوف کی ایک سرد لہر بوستان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اس کے لہو کا خمیر بدل چکا تھا۔ وہ کسی خوفزدہ بچے کی طرح بزدل بن گیا۔ بوستان نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے' صرف ایک زیر جامہ اس کے جسم پر رہ گیا۔

کیپٹن پیارے چند کے اشارے پر وہی حوالدار آگے بڑھا۔ اس نے دوبارہ بے خبری میں رائفل کا بٹ اتنی قوت سے بوستان کے پہلو پر جمایا کہ وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رائفل کی نالی اس کی پیٹھ سے آن لگی۔ ایک سپاہی نے رائفل کے ساتھ ہی ایک پاؤں اس کی کمر پر رکھ دیا۔ دوسرے نے زیر جامہ پر زور زور سے ہاتھ مار کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہاں کچھ نہیں۔

حوالدار نے اس کے تمام کپڑے پہلے پاؤں کی ٹھوکروں سے پھر ناک سکوڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولے۔ اس کی سب جیبیں خالی تھیں۔ حوالدار نے سر کو نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے جب بوستان کے پاس کچھ نہ ہونے کی تصدیق کی تو کیپٹن پیارے چند کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''اٹھ کر کپڑے پہنو اور بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کمرے کے ایک کونے میں رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

بوستان جس کی پسلی پر پڑنے والی ضربوں نے اسے بے حال کر رکھا تھا' کپڑے پہن کر اسٹول پر جا بیٹھا۔ تینوں سپاہی کمرے کے مختلف کونوں میں کھڑے ہو گئے۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' کیپٹن پیارے چند اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''بوستان!'' بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''میں صاحب انڈین آرمی کا سابق نائیک ہوں۔'' اسے بولنے میں بڑی قوت صرف کرنا پڑی تھی۔

''بریگیڈیئر صاحب سے کیوں ملنا تھا؟'' وہی سنسناہٹ اس کے کانوں میں گونجی۔

''صاحب میں ایک بہت اہم اطلاع لایا ہوں۔'' بوستان نے کچھ حوصلہ کیا۔

''کیا؟''

''ادھر ایک اڈہ ہے تخریب کاروں کا۔''

ابھی اس کا جواب نامکمل ہی تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے کان پر لگا اور وہ اسٹول سمیت زمین بوس ہو گیا۔ ''سالا! ہمیں ڈاج کرتا ہے۔'' کیپٹن نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

اتنا بھرپور طمانچہ تھا کہ بوستان کے کانوں میں گونجتی سنسناہٹ پہلے سے دوچند ہو گئی۔ اسٹول سے زمین پر وہ منہ کے بل گرا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین سے منہ پونچھا اور دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''صاحب...... صاحب! خدا کی قسم میں سچ بولتا ہوں۔ صاحب!'' وہ گھگھیایا۔

''بکتا ہے سالا۔'' کیپٹن کے منہ سے گالی نکلی اور اس کے سپاہی بوستان پر پل پڑے اور وہ بزدلوں کی طرح چیختا چلاتا پٹتا رہا۔ پھر کیپٹن نے اشارے سے اپنے جوانوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔

اس دو تین منٹ کی مار ہی نے بوستان کی ہڈیاں چٹخا کر رکھ دی تھیں۔ وہ زمین پر گرا بے بس پلے کی طرح رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مہلت نصیب ہونے پر وہ ہاتھ باندھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ''میں سچ کہتا ہوں صاحب۔ میں سچ......'' وہ ایک ہی فقرہ روتے ہوئے دہرا رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ مسلسل مار اور گالیاں کھانے کے بعد بوستان جب اس قابل ہوا کہ انہیں اپنی 'سچائی' کا یقین دلا سکے تو جہاں اس کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگا تھا' وہاں کوئی نادیدہ طاقت اس کے کانوں میں ''لعنت! لعنت!'' کی مسلسل پکار کر رہی تھی۔

''اسے باہر لے جاؤ۔'' کیپٹن پیارے چند نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا اور وہ بوستان کو جس کے سارے چہرے پر نیل پڑ چکے تھے اور کئی جگہ خراشوں سے ابھی تک خون چپکا ہوا تھا' دھکے دیتے ہوئے باہر لے گئے۔

کیپٹن پیارے چند اور اس کے افسران اب بوستان پر مسلسل جرح کرنے کے بعد مطمئن ہو کر اس کے ساتھ ''صاعقہ'' کے مقامی ٹھکانے پر چھاپہ مارنے جا رہے تھے۔

☆☆☆

تینوں کے اعصاب رات ڈھلنے کے انتظار میں تڑخنے لگے تھے۔ سورج کی مسافت خدا خدا کر کے طے ہوئی۔ سارا دن تو مطلع صاف رہا' لیکن شام کے افق پر بادلوں کا دبیز غبار پھیلنے لگا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کپکپاتی کرنوں نے بادل کے چاروں اطراف بڑا خوبصورت سنہرا حاشیہ بنا لیا تھا۔ اب اس حاشیے پر بھی رات کی ظلمتوں کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا۔ بالآخر روشنیاں دم توڑ گئیں۔

اندھیرے کے ہیبت ناک دیو نے ان کے سامنے بنی پہاڑی کو نگل لیا تھا۔ کبھی کبھی کسی سمت سے اچانک ٹارچ یا سرچ لائٹ کی روشنی جل بجھ کر اندھیرے کے اس طلسم سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی تھی۔

سامنے کا سارا منظر گو کہ کشمیر کے مقدر پر پھیلی رات کی ظلمت نے ہڑپ کر لیا تھا' لیکن امیر خان نے بنکر کی ایک ایک تفصیل حفظ کر رکھی تھی۔ صبح سے اب تک اس نے اس کے سوا اور کیا ہی کیا تھا۔ کبھی کبھی جب سانپ کی طرح پتلی اور بل کھاتی سڑک پر دوڑتی کسی جیپ کی روشنی موڑ کاٹتے ہوئے ایک خاص زاویے پر آ کر جب بنکر کو جانے والے راستے پر پڑتی تو امیر خان کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگتے۔

''چلو سنگیو!'' اس نے اپنے بائیں بیٹھے دونوں ساتھیوں سے سرگوشی کی۔

''امیر خان بڑا لمبا ساتھ رہا ہے اپنا...... ہم نے اٹلی سے مصر تک اکٹھے موت کی شاہراہ پر سفر کیا ہے۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو۔'' ممدو گوجر نے اس کے بازو پر لرزتا ہوا ہاتھ رکھا۔

''نہ سنگی...... نہ!'' امیر خان نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ کو الگ کیا اور اپنا مضبوط پنجہ اس کے کندھے پر جمایا۔ تم تو جانتے ہو مجھے...... میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔'' اس نے کوشش کی تھی کہ اپنے لہجے کو غیر سنجیدہ بنائے رکھے۔

سجاول خاموش تھا۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہی تھی۔ تینوں دوست ایک دوسرے سے باری باری بغلگیر ہوئے۔ انہوں نے ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ہونے والی کسی بھی دانستہ غلطی کی معافی مانگی اور ''رب راکھا'' پکارتے موت کی شاہراہ پر تین سمت کو پھوٹنے والی تین راہیں اپنا لیں۔ وہ پتھروں پر بغیر آواز پیدا کیے چل رہے تھے۔ ممدو اور سجاول خان کو امیر خان نے ان کی پوزیشنوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

ایک مخصوص مقام پر وہ تینوں اپنی اپنی سمت ہو لئے۔ ممدو اور سجاول نے اس راستے کو کور کرنا تھا جو اس بنکر تک جاتا تھا اور امیر خان نے اپنے ذہن میں اس سے الگ ایک وضع کردہ راستہ اختیار کر کے بنکر تک پہنچنا تھا۔

بنکر کے ایک کونے سے جھانکتی فیلڈ گن کی نال سے کبھی کبھی کوئی گولہ گونج دار آواز پیدا کرتا' اپنے پیچھے چنگاروں کی ایک لکیر چھوڑتا مجاہدین کی پونچھ سے باہر جانے والی پوزیشنوں پر گرتا تو ایک گونج سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر لرزنے لگتی۔ پھر اس کا ہیبت ناک تسلسل بھی خاموشیوں کے سمندر میں غرق ہو جاتا۔

امیر خان نے اپنے جوتے اتار کر پھینک دیئے تھے۔ اس کی اسٹین گن اس کے کندھے سے جھول رہی تھی اور پوچ میں رکھے ہینڈ گرنیڈ محض ایک لمحے پر اپنی مہم پر روانہ ہونے کے لئے تیار تھے۔ امیر خان نے بنکر کے ایک پہلو پر پھوٹتے اس پیچ دار اور بظاہر ناقابل عبور راستے کا انتخاب کیا تھا جس پر چل کر بنکر تک پہنچنا کسی بہت بڑے اور جھلسے صحرا کو پاٹنے سے کم ہرگز نہ تھا۔

کسی بھی پتھر پر پڑنے والا غلط قدم' کوئی بھی کنکر نیچے گرا دیتا یا کسی بھی جھاڑی سے پیدا ہونے والی معمولی سی آواز اس کی موت کی پیامبر بن جاتی۔ کوئی اس طرف دیکھنے کا تکلف بھی نہ کرتا۔ محض اس کے سر پر جھانکتی مشین گن کی نالی سے ایک سرخ لکیر پھوٹتی اور وہ موت کے بے رحم ہاتھوں میں کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لئے جا پہنچتا۔

پتھروں پر تیرتا ہوا اب وہ اسے چھجے کے نیچے بنی چٹان کے تیز دھار سرے پر پہنچ چکا تھا جس نے اسے چھجے تک پہنچانا تھا' جس کے اوپر بنے بنکر میں موت اپنا بھیانک جبڑا کھولے ہر آنے والے کی منتظر بیٹھی تھی۔

امیر خان نے پتھروں کے ڈھیر پر سے ایک قدم چٹان پر رکھا اور زمان و مکان کی ٹھہری ہوئی گردشوں میں سما گیا۔ یہ چند لمحوں کا سفر اس کے اعصاب توڑے ڈال رہا تھا۔ کسی بھی لمحے پاؤں اٹھانے سے کوئی کنکر بھی پھسل کر آواز پیدا کر سکتا تھا۔ پھر اس کے قدم اٹھانے اور گن فائر ہونے کا عمل ایک ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ دھماکے کی آواز سے اس کی نسیں ٹوٹنے لگی تھیں۔ کئی کنکر اڑ کر نیچے گرے تو امیر خان کو اپنی نبضیں ساکت ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں۔

چند لمحے اس اذیت ناک گریز پا کیفیت کی بھینٹ چڑھا کر وہ شعور کے جہانوں میں واپس پلٹا اور موت کی شاہراہ پر سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اپنی ساکت نبض کے ساتھ اس نے چٹان کا پل صراط عبور کیا اور چھجے پر پہنچ گیا۔

چھجے کی چٹان قدرے ہموار تھی۔ امیر خان نے برف سی پتھریلی چٹان پر خود کو بغیر آواز پیدا کئے گرا دیا اور لیٹے لیٹے ایک پتھر سے ٹک کر اپنے پوچ سے گرنیڈ باہر نکالا۔ یہاں تک پہنچنے کی جو مسافت اس نے پائی تھی' اس کا تصور کرتے ہی کرب آمیز مسکراہٹ کی ایک لہر اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی۔

اپنے شعور کی دنیا میں لوٹنے پر جب اس نے اپنی جسمانی کیفیت کا جائزہ لیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے پاؤں تو کبھی کے جسم سے الگ ہو چکے ہیں۔ پاؤں کی جگہ برف میں منجمد' گوشت کے دو بے حس لوتھڑے اس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح اپنے بے حس اور منجمد قدموں پر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے سے پتھروں کی وہ دیوار لگی ہوئی تھی جس میں چوکور دروازے کے اندر فیلڈ گن اور مشین گنیں نصب تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا اور اسے اپنے منہ تک لے جا کر امیر خان نے گرنیڈ سے پن الگ کی اور پنجوں کے بل اوپر کو اٹھا۔

بنکر میں موجود تو پچیوں کے ہیولے اندھیرے میں ابھرے' پھیلے اور پھیل کر سمٹ گئے۔ امیر خان کا ہاتھ سر سے بلند ہوا اور گرنیڈ مورچے میں جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوسرے گرنیڈ کی پن نکال چکا تھا۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی دوسرا گرنیڈ بنکر میں گرا۔

دھماکے کے ساتھ اڑنے والی چیزوں میں امیر خان کا اپنا وجود بھی شامل تھا۔ پوری وادی کا کلیجہ ہی تو دہل گیا تھا۔ امیر خان اپنا توازن برقرار نہ رکھا سکا۔ وہ اڑتا ہوا سامنے والی چٹان سے ٹکرایا۔ پھر اس کا وجود ٹکرا کر پیچھے کو الٹا اور سر ایک بڑے پتھر سے ٹکرا گیا۔ تازہ خون کی ایک سرخ لکیر پتھر پر سے بہہ کر ایک کونے سے قطرہ قطرہ نیچے پھیلے پتھروں پر گر کر جمنے لگی۔

''خدایا...... کشمیر......!'' اس نے دو الفاظ ہی بمشکل ادا کئے تھے۔

شہادت کی منزل

صوبے دار کیدار ناتھ اپنی پلاٹون کے ساتھ پٹرول کر رہا تھا جب اس کو دور سے دو سائے بھاگ کر اس جانب آتے دکھائی دیے۔

......اس سے پہلے فائرنگ کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا کہ یہ بلوائیوں کی کارروائی ہے، لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس کی آدھی زندگی میدان جنگ میں گزری تھی اور بیک وقت فائر کرتی مختلف گنز میں سے علیحدہ علیحدہ ہر ایک آواز کی شناخت کر سکتا تھا...... فائرنگ میں لائٹ مشین گن کی آواز اس امر پر دلالت کر رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

''ٹارچ جلاؤ۔'' اس نے ایک جوان کو حکم دیا۔

ٹارچ روشن ہوتے ہی باقی ساری پلاٹون اسٹینڈ ٹو ہو گئی۔ ٹارچ کی روشنی میں انہی دو حواس باختہ پولیس والوں کے چہرے دکھائی دیے جو دیوانہ وار منہ اٹھا کر اس طرف بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''مہاراج جی...... مہاراج جی! غضب ہو گیا۔'' فوج کو اپنے سامنے دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے ہاتھ باندھ دیے۔ دوسرا تو دہشت کے مارے بولنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔

''کیا ہوا......؟ کیا بات ہے؟'' صوبے دار کیدار ناتھ نے فوجی دبدبے کا مظاہرہ کیا۔

''ادھر ہوم گارڈز والے مسلمانوں نے سب کو مار ڈالا...... سب کو مہاراج جی...... کسی کو زندہ نہیں چھوڑا...... انسپکٹر صاحب بھی مارے گئے...... سب مارے گئے۔'' وہ ایک ہی بات دُہرائے جا رہا تھا۔

''مسلوں نے...... سب کو مار دیا......''

''ان کی یہ ہمت......!''

''یہ ایسے ہی کرتے ہیں۔''

''وہاں بھدرواہ میں بھی انہوں نے کل تین ہندو پولیس والے مار دیے تھے۔'' مختلف زبانیں بھانت بھانت کا زہر اگلنے لگیں۔

''مہاراج جی! وہ سب چھوکریوں کو بھگا کر لے گئے...... سب کو......'' دوسرا بھی ہمت کر کے گھگھیایا۔

''یہ مسلے، ان کی یہ ہمت!'' صوبے دار کیدار ناتھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''ایڈوانس کرو جوانو...... ساری پلاٹون بکھر کر میرے ساتھ چلے گی...... اے حوالدار صاحب تم ادھر کمپنی ہیڈ کوارٹر کو خبر کرو......!'' اس نے احکامات جاری کیے۔

حوالدار تو وائرلیس پر رابطہ کرنے لگا۔ باقی جوان فوراً جنگی تربیت کے مطابق مختلف سیکشنوں میں بٹ کر بکھر گئے۔ وہ سب ایڈوانس کرتے ہوئے ڈاک بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔

............☆☆☆............

شیرو بھاگم بھاگ جب اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ لڑکی جسے اس نے ایک جوان کے ساتھ بھیجا تھا...... اس کے کمرے میں سکڑی سہمی بیٹھی تھی۔

......افراتفری میں شیرو کے ذہن سے اس کا خیال ہی نکل گیا تھا۔

......اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے، لیکن ابھی تک وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اسے اپنی جسمانی حالت کا جائزہ لینے کا خیال ہی شاید نہیں آیا تھا۔

شیرو اس پر ایک نظر ڈال کر دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے پنپا ٹائز کر دیا ہو۔ یہ لڑکی اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی کسی اور عالم کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ شیرو ایک ٹک اسے گھورتا رہا۔ جیسے ہی لڑکی کو اس کی آمد کا احساس ہوا اور اس کی نظریں شیرو کی نظروں سے ٹکرائیں، ایک خجالت سی اسے محسوس ہوئی جیسے لڑکی نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

وہ دوسرے ہی لمحے عالم ہوش میں لوٹ آیا۔ وقت کی نزاکت کا احساس اس سے زیادہ اور کسے تھا۔ چارپائی کے ایک کونے پر دھرا اپنا سویلین جوڑا جو اس نے رات کو پہننے کے لیے تیار کیا تھا، اس نے اس کے سامنے پھینک دیا۔

''جلدی سے کپڑے بدل کر باہر آؤ...... فوراً!'' یہ کہہ کر وہ اپنا اسباب سمیٹنے لگا۔ راؤنڈز سے بھرا تھیلا اس نے کندھے کے ساتھ لٹکایا اور گن ہاتھ میں پکڑ کر باہر نکل گیا۔

دو منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد لڑکی باہر آئی۔ اس نے بھی شاید حالات کی سنگینی کو محسوس کر لیا تھا۔ باقی جوان قطار میں باہر کھڑے تھے۔

''غلام نبی!'' اس نے ایک حوالدار کو مخاطب کیا...... ''تم پانچ جوانوں کے ساتھ آگے نکلو۔ ہم سری نگر روڈ بلاک کرتے ہیں۔ فوج کو اس طرف آتے دیکھ کر للکارنا۔ اگر وہ گولی چلائیں تو فائرنگ کرتے ہوئے پسپا ہو جانا۔ خدا حافظ۔''

اس نے باقی جوانوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی سحر زدہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن ہی شاید ماؤف ہو چکا تھا۔ پے در پے ٹوٹنے والی قیامتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''آؤ...... چلو میرے ساتھ......!'' شیرو نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔

''ہوں......!'' لڑکی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

شیرو نے اسے اپنے ساتھ بھگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کی رفتار کا ساتھ تو نہ دے سکتی تھی، اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔

......لیکن بمشکل اس نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ وہ لڑکھڑا گئی اور اگر شیرو نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ منہ کے

بل گر پڑتی۔ اس نے رک کر لڑکی کو سنبھالا۔

''چلو...... جلدی کرو......!'' شیرو نے اسے سہارا دیتے ہوئے مخاطب کیا۔

''مجھ سے بھاگا نہیں جاتا۔'' وہ سسک پڑی۔

اس کی جلتی ہوئی آنکھیں شیرو سے ٹکرائیں اور اپنا فسوں پھونک گئیں۔ ایک مرتبہ وہ پھر اسی کیفیت کا شکار ہو گیا جس سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ گزر کر آیا تھا۔ اس کے لیے لڑکی سے آنکھیں ملائے رکھنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اچانک ہی فائرنگ کی آواز دونوں کو عالم حقیقت میں واپس لے آئی۔

شیرو جھکا اور ایک جھٹکے سے حیرت زدہ لڑکی کو کندھے پر اٹھا کر بھاگنے لگا۔ اس کے ساتھی شیرو کے وہاں پہنچنے تک سڑک کے کنارے دونوں اطراف میں پوزیشنیں سنبھالنے لگے تھے۔ لڑکی کو کندھے پر اٹھائے وہ سڑک کے کنارے لگے درختوں کے اندر ہی اندر گھستا چلا گیا۔ ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے اس بوجھ سے نجات حاصل کی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے اپنی سانسیں سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''آسیہ!'' اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ اچانک شیرو نے جست لگائی اور اپنے ساتھ اسے بھی زمین پر گرا دیا۔ گولیاں اس سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پتے چھیدنے لگی تھیں۔

خوف کے مارے لڑکی کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی ہی اذیت ناک تھی۔

......شیرو نے اس کا بازو پکڑا اور وہ دونوں درختوں کے اندر ہی اندر جھکے جھکے بھاگنے لگے۔ اسے اپنے چاروں طرف سے اپنے ساتھیوں کے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور مارٹر اور مشین گن کا فائر کر رہے تھے اور شیرو کے ساتھیوں کے پاس رائفلیں اور اسٹین گنیں اور دو مشین گنیں بھی تھیں، مگر انہیں نصب کرنے کی انہیں کہاں مہلت ملی ہو گی؟ شیرو سوچنے لگا۔

مقابلہ دیوانے کا خواب تھا اور بس۔ اس کی اپنی اکیلی جان ہوتی تو کوئی اور بات تھی، لیکن قدرت نے ایک مسلمان لڑکی کی شکل میں اس پر جو بوجھ لاد دیا تھا اس نے شیرو کو کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ وہ لڑکی کا ہاتھ تھامے بدستور بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

لڑکی کی حالت اب یہ تھی کہ وہ بھاگنے کی بجائے اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شیرو حیران تھا کہ اب تک اس سمت آنے والی ہزاروں گولیوں میں سے کوئی ان میں سے کسی ایک کو کیوں نہیں لگ گئی؟ جس شدت سے وہ لوگ فائرنگ کر رہے تھے بظاہر ان کے اب تک بچے رہنے والی کوئی بات نہیں تھی۔

ایک قدرے محفوظ جگہ پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ خود اس کا سانس بھی مسلسل بھاگ دوڑ سے دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ لڑکی تو نیم مردہ سی وہیں ایک درخت کے سہارے بیٹھ رہی جب کہ شیرو اس سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جس پر بھاگتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے تھے، لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے اس کی نظریں قریب ہی الجھ کر رہ جاتیں۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟'' اس مرتبہ لڑکی سے آنکھیں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اس سوال کا جواب لڑکی کی آنکھوں سے بے

اختیار بہنے والے وہ آنسو تھے جنہوں نے شیرو کو بھی گڑ بڑا کر رکھ دیا۔ ''اوہ! معاف کرنا۔ مجھے شاید یہ نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔'' شیرو اس الجھن میں تھا کہ اسے کس طرح تسلی، دلاسہ دے۔

''ایسا نہ کہیے۔ آپ نے تو میری جان بچائی ہے۔ ہم لوگ بنوٹ کے ساتھ ہی ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں لیکن اب...... اب وہاں کوئی بھی نہیں رہا۔'' وہ سسک پڑی۔ شیرو پھر پریشان ہوگیا۔

''دیکھو رونے دھونے سے کیا بنے گا۔ جو تمہاری کہانی ہے، وہی آج ہر کشمیری مسلمان کی کہانی ہے۔ حوصلہ کرو۔ اب تم محفوظ ہو جب تک میں تمہارے ساتھ زندہ ہوں۔''

لڑکی نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے چادر کے ایک کونے سے آنسو پونچھے اور سر جھکا لیا۔

''میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ فائرنگ کی آوازیں بند ہو چکی ہیں۔ میرے ساتھی یا تو مارے گئے ہیں یا گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ ہماری تلاش میں ضرور ادھر آئیں گے۔ اب اندھیرے میں ہم لوگ جتنی دور نکل جائیں، مناسب ہے۔ دن کے اجالے میں سفر کرنا اتنا آسان نہیں۔'' شیرو نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

لڑکی بغیر کوئی بات کہے اٹھ کھڑی ہوئی حالانکہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی حالت مزید چلنے کے لائق نہیں ہے۔

''مجھے تمہاری حالت کا احساس ہے آسیہ۔'' شیرو بولا۔ ''لیکن......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو رہا کیونکہ آسیہ چند قدم دور نکل گئی تھی۔

دو تین فرلانگ وہ دونوں اکٹھے چلتے رہے۔ اس دوران دونوں ہی نے ایک دوسرے کی طرف کئی مرتبہ کن انکھیوں سے دیکھا اور ایک دوسرے کی چوری کو پکڑا تھا، لیکن ابھی تک دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ چلتے چلتے اچانک ہی آسیہ رک گئی۔

''آپ کون ہیں؟'' اسے شاید ہوش ہی اب آیا تھا۔ شیرو چونک پڑا۔

وہ جس سوال کی توقع بہت پہلے کر رہا تھا، وہ لڑکی نے اب اس سے پوچھا تھا۔

''میں مسلمان ہوں۔ شیرو میرا نام ہے...... شیر محمد؟ میں پونچھ سے آیا ہوں۔'' اس نے اپنا مختصر تعارف جلدی جلدی کروا دیا۔

لڑکی کو شاید ابھی تک اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا کیونکہ اس نے شیرو کو سرکاری وردی میں دیکھا تھا جو اس کے خیال سے بھارتی یا ریاستی فوج ہی کی وردی ہو سکتی تھی۔ شیرو بھی اس کی ذہنی کیفیت کو جان گیا تھا۔

''ہم شیخ عبداللہ کی فوج کے سپاہی ہیں۔'' اس نے لڑکی کو مطمئن کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ شیخ کا نام آسیہ کے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔ شیرو کے جواب سے وہ قدرے مطمئن ہوگئی تھی۔ دونوں اب پھر خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔

''تمہیں اس علاقے کی کچھ خبر بھی ہے؟'' اس نے چلتے چلتے ہی آسیہ سے پوچھ لیا۔

''نہیں۔ میں صرف سری نگر دو مرتبہ گئی ہوں اپنے چچا کے گھر۔ یہاں بنوٹ سے کبھی باہر نکلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

شیرو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب کم از کم لڑکی کو مضبوط ہاتھوں تک پہنچانے کا مرحلہ تو بخوبی طے پا جائے گا کیونکہ اس کا چچا سری نگر میں

موجود ہے۔ وہ تو ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ اسے بچا کر لے جائے گا کہاں؟ اس نے ہوم گارڈز کی وردی پہن رکھی تھی جوان دونوں کو کسی بھی وقت پکڑوا سکتی تھی۔ ارد گرد کے ہندو دیہاتوں میں پہلے ہی سے کباب میں ہڈی بننے والے مسلمان ہوم گارڈز کے خلاف زبردست نفرت پائی جاتی تھی کیونکہ جو کارنامہ شیرو اور اس کے ساتھیوں نے بٹوٹ میں انجام دیا، ایسے کئی کارنامے مسلمان ہوم گارڈز پہلے بھی مختلف مقامات پر انجام دے چکے تھے اور کئی جگہ ان کا ٹکراؤ ریاستی فوج اور ہوم گارڈز میں موجود غیر مسلموں سے ہو چکا تھا۔ فوج سے ابھی تک البتہ یہ پہلا ٹکراؤ تھا جو ان لوگوں نے کیا۔ شیرو کو رہ رہ کر ایک ہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ جموں میں اس کے ساتھی اس کے منتظر ہوں گے۔ اس کے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے اس کے پونچھ والے باقی ساتھی جموں تک بخیریت پہنچ جائیں۔

بٹوٹ کے تار گھر سے نکلنے والی خبر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نزدیکی علاقوں میں پھیل جاتی تھی اور شیرو جانتا تھا کہ راتوں رات ان کا ''کارنامہ'' بٹوٹ کے گرد و نواح میں پھیل چکا ہوگا۔ دن کے اجالے میں اس کی وردی ان دونوں کے لیے موت کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، لیکن کیسے؟ یہی سوال اسے کچوکے دے رہا تھا۔

رات کا شاید دوسرا پہر تھا جب اس نے آسیہ کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ بجلی کی سی پھرتی سے وہ آگے بڑھا اور اس نے آسیہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔ شیرو نے محسوس کیا کہ سردی سے اس کا وجود لرز رہا ہے اور اس کی ٹانگوں پر کپکپاہٹ طاری ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گئی تھی۔ شیرو کے سینے سے لگتے ہی آسیہ کو ایک عجیب سے طمانیت کا احساس ہوا، بالکل یوں جیسے کوئی مرغی کا چوزہ سہم کر اپنی ماں کے پروں میں چھپ جاتا ہے، لیکن اس کے اس غیر اختیاری عمل نے جو اثرات نوجوان شیرو پر مرتب کیے تھے ان کا احساس اسے نہیں ہو سکتا تھا۔ شیرو چند سیکنڈ کے لیے تو بوکھلا گیا تھا پھر اس نے اپنے سینے پر ایک الاؤ سا دہکتا محسوس کیا۔ وہ ان لمحات کی طوالت کا متمنی تھا، لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آسیہ کو خود سے الگ کرنا پڑا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اپنا فوجی کوٹ اتارا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی حیرت سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

''یہ چادر مجھے دے دو اور کوٹ پہن لو۔'' اس نے آسیہ کو مخاطب کیا جس نے کسی مقناطیسی عمل کے طابع اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کوٹ اتارنے کے بعد شیرو کو اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا محسوس ہو رہا تھا، لیکن اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ اپنی پتلون کی جیب سے اس نے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور کانپتی انگلیوں سے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبالی۔ لڑکی نے کوٹ پہن لیا۔ کوٹ کی لمبائی نے اس کی ٹانگوں کو بھی برفیلی ہوا سے محفوظ کر دیا تھا۔

☆☆☆

بھارت کے ساتھ الحاق کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ کو بھارتی حکومت کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے لکھا تھا:

> ''وہ خاص حالات جن کے تابع یور ہائی نس نے میری حکومت سے الحاق کی درخواست گزاری ہے، اسے مدنظر رکھتے ہوئے بھارتی سرکاری ریاست جموں و کشمیر اور ڈومینین آف انڈیا کا الحاق منظور کرتی ہے، لیکن میں یور ہائی نس کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں اگر یہ الحاق متنازعہ حیثیت اختیار کر گیا اور حکومت پاکستان یا ریاستی عوام کو اس پر اعتراض ہوا تو اس کا فیصلہ ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی مرضی سے طے پائے گا۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ جونہی ہماری مسلح افواج غیر

ملکی مداخلت کاروں کو نکال باہر کرتی ہیں اور امن وامان بحال ہوتا ہے، آپ کے ہمارے الحاق کے بارے میں رائے عامہ طلب کی جائے۔''

''رائے شماری'' پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے ایسی تجویز تھی جس پر بھارت میں بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ گو کہ مہاراجہ کی ماضی میں کبھی پنڈت جواہر لال نہرو سے شیخ عبداللہ کے ذاتی مراسم کی وجہ نہ بنی تھی اور وہ سردار پٹیل کے زیادہ نزدیک تھے، لیکن کشمیر سے اپنے جذباتی تعلق، قوم پرستی اور شیخ عبداللہ سے دوستی ایسے محرکات تھے جنھوں نے پٹیل کی بجائے نہرو کو کشمیر کی سیاست میں زیادہ حد تک ملوث کر دیا تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے ''الحاق'' کا وقتی معاہدہ محض اپنی گدی اور حملہ آوروں سے کشمیر کو بچانے کے لیے کیا تھا، لیکن رائے شماری کا ترپ پتہ بیک وقت پاکستان اور شیخ عبداللہ کے ہاتھ میں دے کر جواہر لال نہرو نے اس کی سیاسی موت کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ اس کی ریاستی فوج کا کمانڈر انچیف بریگیڈیئر راجندر سنگھ جمرال انتہائی نالائق ثابت ہوا تھا۔ گلگت کا گورنر گھنشام سنگھ قبائلیوں کی قید میں پہنچ چکا تھا اور گلگت اسکاؤٹ کے کمانڈر میجر براؤن نے پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا تھا۔ مہاراجہ سری نگر سے بھاگ کر جموں پہنچا تو چانکیہ کے چیلے اپنے دانت تیز کیے بیٹھے تھے۔ تنازعہ کشمیر اقوام متحدہ میں پہنچ چکا تھا۔ بھارتی وفد کی قیادت ریاست جموں وکشمیر کا سابق وزیر اعلیٰ گوپال سوامی آئینگر کر رہا تھا جسے نہرو کی خصوصی کرم فرمائی سے بڑا اہم مقام مل چکا تھا، لیکن مہاراجہ دیکھ رہا تھا کہ پاکستانی وفد کے لیڈر چوہدری ظفر اللہ کے سامنے سوامی آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے اور بین الاقوامی سطح پر کیس پاکستان کے حق میں مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ نہرو ہی کی مہربانیوں سے ہنگامی بنیادوں پر قائم کردہ انتظامیہ کا سربراہ اعلیٰ شیخ عبداللہ کو بنایا جا چکا تھا۔ شیخ کی شخصیت اور اس کا سیاسی قد اتنا بلند تھا کہ مہاراجہ لاکھ ریاستی عوام کے سامنے ہر دل عزیز ہونے کے باوجود اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ جواہر لال نہرو نے مہاراجہ کو مات دینے کے لیے بڑی خطرناک چال چلی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اختیارات اس کے ہاتھوں سے چھین کر شیخ کو منتقل کر رہا تھا جس کی حیثیت کانگریس کی کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

13 نومبر 47ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کو لکھا تھا:

''میرے خیال کے مطابق پوری ریاست جموں کشمیر میں صرف شیخ عبداللہ ہی ایسی شخصیت ہیں جو اندریں حالات ریاست میں امن وسکون بحال کر سکتے ہیں۔ وہ متوازن ذہن کے مالک اور مقبول ترین عوامی شخصیت ہیں۔ ہندو مسلم فسادات روکنے میں انہوں نے فقید المثال کردار ادا کیا ہے جو ان کے حسن تدبر کی بہترین مثال ہے۔ آپ کو ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں ان سے اختلاف ہو، لیکن بڑے مسائل کو بہتر طریقے سے وہی حل کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ بجائے حالات مزید بگاڑنے کے آپ کسی تیسرے واسطے کو اپنے اور شیخ عبداللہ کے درمیان لائے بغیر ان سے معاملات طے کر لیں۔''

مہاراجہ ہری سنگھ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ وہ نہرو کی اس چال کو نہ سمجھ سکتا، لیکن حالات نے اسے جس طرح باندھ کر بھارت سرکار کے آگے ڈال دیا تھا، اس کے بعد وہ بے بس ہو چکا تھا۔ اس کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا کہ وہ نہرو کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جائے۔ مہاراجہ آئینی

طور پر ریاستی کمانڈر انچیف تھا، لیکن نہرو کی شہ پر شیخ عبداللہ نے یہ مطالبہ بھی داغ دیا کہ بااختیار وزیر اعلیٰ ہونے کے ناطے اور امن وامان کے جلدی حصول کے لیے فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں دی جائے۔ مہاراجہ نے اس مطالبے پر شدید اعتراضات کیے اور اپنے ایک خط میں نہرو کو لکھا:

''اگر شیخ عبداللہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کشمیری فوج کو بھارتی فوج کی نگرانی میں دے دیا گیا تو پاکستان ساری دنیا کو یہی تاثر دے گا کہ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنانا چاہتا ہے۔ اندریں حالات جب کہ ہمارا معاملہ ''یو این او'' میں چل رہا ہے۔ یہ اقدام ہمارے کیس کو مزید کمزور اور پاکستان کے کیس کو اور طاقت ور کر دے گا۔''

''دوسری اہم بات بھی میں آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان کا کہنا ہے کہ جب رائے شماری ہو تو بھارتی فوج کشمیر سے نکل جائے۔ اگر ریاستی فوج کو بھارتی فوج کی تحویل میں دے دیا گیا تو زبردست انتظامی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ میں آپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اندریں حالات میرے لیے یہ مشورہ قابل قبول نہیں ہے۔''

وقتی طور پر مہاراجہ کی اشک شوئی کے لیے ان کی بات تسلیم کر لی گئی، لیکن بھارت سرکار نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنانے کی سرگرمیاں جاری رکھیں اور شیخ عبداللہ کی طرف سے مسلسل ایسے بیانات آنے لگے جن میں ریاستی فوج پر زبردست تنقید کی جاتی تھی۔

اس دوران مہاراجہ کے اکلوتے بیٹے یوراج کرن سنگھ کے کولہے کی تکلیف اتنی شدت اختیار کر گئی کہ ولی عہد کو علاج کے لیے امریکہ بھیجنا پڑا۔ اب مہاراجہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا اور اس کے گرد اگرد بھارت نواز کشمیریوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ولی عہد کی بیماری نے تو اسے ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ مہاراجہ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ ایک روز اس نے سر عام ہی عمائدین سے معذرت کر لی اور رات اکیلے گزاری۔ ساری رات اس مسئلے پر سوچ بچار کرنے کے بعد وہ حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ بھارت کے ساتھ معاہدہ الحاق ختم کر دیا جائے لیکن کیسے؟

یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس نے ''الحاق'' کر کے سانپ کی بانبی میں ہاتھ دے دیا تھا۔ اب کچھ بھی کرنا اس کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ اس نے دسمبر کے اوائل میں اپنے ''خود ساختہ دوست'' اور بھارت کے وزیر ریاست جموں وکشمیر امور داخلہ سردار پٹیل کے نام بڑی ہی برافروختگی اور غصے کے عالم میں خط لکھا:

''میں کل ساری رات ایمانداری سے سوچ بچار کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھارت کے ساتھ معاہدہ الحاق سے دست کش ہونے کا اعلان کر دوں۔ ہمارا معاہدہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مشروط تھا اور مجھے خطرہ ہے کہ بھارتی فوج کبھی بھی حملہ آوروں سے کشمیر کے زیر قبضہ علاقے خالی نہیں کروا سکے گی۔ اس صورت میں اگر ہم سلامتی کونسل کے فیصلے کی بھینٹ آپ کی مہربانیوں کے طفیل چڑھ گئے تو ظاہر ہے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ پاکستان کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ اندریں حالات میں اس معاہدۂ الحاق کو بیکار سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ عارضی طور پر پاکستانی ہمیں پرکشش مراعات پیش کریں گے، لیکن مسلمان میرے نزدیک کبھی قابل اعتبار نہیں رہے۔ مجھے علم ہے کہ حکومت پاکستان ڈوگرہ راج ختم کر دے گی اور ریاست کے تمام ہندو سکھ قتل کر دیئے جائیں گے، لیکن معاہدہ ختم ہونے کی صورت میں یہ ضرور ہوگا کہ اس طرح گو کہ میں بھارتی مسلح

افواج کی خدمات سے محروم ہو جاؤں گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ریاستی افواج اور رضا کارانہ طور پر یہاں دی جانے والی افواج کی کمان اگر خود سنبھال لوں تو آپ کے کسی جرنیل سے زیادہ موثر انداز میں اور خوش اسلوبی سے حملہ آوروں سے نمٹ سکوں گا کیونکہ میں اپنے عوام کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ اگر موجودہ صورت حال جو آپ نے شیخ عبداللہ کو میرے سر پر مسلط کر کے پیدا کر دی ہے، میں کوئی تبدیلی نہ لائی گئی تو میں ریاست چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اس طرح کم از کم میرے عوام مجھ سے کوئی امید تو نہ رکھ سکیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں جاتے وقت عوام کو اعتماد میں لے کر یہ ضرور بتاؤں گا کہ مجھے اپنے لوگوں کو کن حالات میں چھوڑنا پڑا۔''

مہاراجہ ہری سنگھ کا یہ خط بجلی بن کر گرا اور اس نے بھارتی ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کے درمیان آپس میں ٹھن گئی کیونکہ سردار پٹیل شروع ہی سے حیدر آباد دکن کی طرح ریاست پر بھی غاصبانہ قبضے کے حق میں تھا۔ وہ نہرو کی کشمیر میں اختیار کردہ مکارانہ پالیسی کا سخت مخالف اور جبر سے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ بنا لینے کا قائل تھا۔ اس خط پر دونوں میں کافی لے دے ہوئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ سردار پٹیل نے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی لیکن بالآخر چانکیہ کے چیلے اکٹھے ہو گئے اور مل کر اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرنے لگے۔

نہرو کی ہدایت پر سردار پٹیل نے ''اپنے دوست'' ڈوگرہ مہاراج کو مطمئن کرنے اور اپنے ارادے سے باز رکھنے کے لیے مختصر خط لکھا:

''کشمیر کے حالات اور بین الاقوامی رائے عامہ پر میری گہری نظر ہے۔ میں بے چینی سے اقوام متحدہ میں ہونے والے کسی بھی فیصلے کا منتظر ہوں۔ آپ مطمئن رہیے اور بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کا دوست آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اور کشمیر کی شان و شوکت کو دوبارہ بحال کرنے میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ امید ہے آپ کی پریشانی اس یقین دہانی کے بعد ختم ہو گئی ہو گی۔''

اور بے وقوف مہاراجہ چانکیہ کے چیلوں کے چکر میں آ کر خاموش ہو گیا۔

............☆☆☆............

مسلسل دھماکوں اور پھر ایک دم زوردار دھماکے کی آواز سن کر ممدو اور سجاول خان نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا دوست اپنا مشن مکمل کر چکا ہے۔

''مرحبا!'' سجاول کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی۔

''سبحان اللہ کہ امیر خان اپنی مراد کو پہنچا۔'' دوسری طرف بیٹھا ممدو بڑبڑایا۔

پلان کے مطابق امیر خان کے بچ کر آ جانے کی صورت میں اسے کورنگ فائر دینا تھا یا پھر اس کے گن پر حملہ آور ہونے سے پہلے دشمن اس کی طرف سے باخبر ہو جائے تو اس کی توجہ ہٹانے کے لیے فائرنگ کرنا تھا۔ اب دونوں ہی صورتیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی توپ اپنے توپچیوں سمیت لوہے کے پگھلے ہوئے ڈھیر میں تبدیلی ہو چکی تھی اور ان کا دوست انہیں کوئی زحمت دیئے بغیر سرخرو ہو کر خدا کے حضور پہنچ چکا تھا۔

دونوں الگ الگ ایک دوسرے کی مخالف سمت سے سنبھل سنبھل کر نیچے اتر رہے تھے۔ اچانک فضا روشنی کے پھٹتے گولوں سے روشن تر ہونے لگی۔

.....بھارتی فوج کے افسران نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ میڈیم گن پر حملہ کرنے والا کوئی اکیلا شخص نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھی بھی یقیناً یہیں کہیں موجود ہوں گے۔ ان کی نشاندہی کے لیے اب ''وری لائٹ راؤنڈز'' فائر کیے جا رہے تھے۔ سجاول نے اپنے دائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر ممدو کو چھلانگ لگا کر ایک پتھر کی اوٹ میں لڑھکتے دیکھا تھا۔ اس کے تعاقب میں لپکنے والی گولیاں سیدھی لکیر بناتی ہوئی پتھر تک پہنچ چکی تھیں۔ پہاڑی کا ایک ایک ذرہ ان کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

سجاول دیوانہ وار اپنے نزدیکی پتھر کی اوٹ لینے کے لیے بھاگا۔ پتھر کے نزدیک پہنچنے پر اسے اپنے دائیں پہلو میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے۔ ایل ایم جی کی دو تین گولیاں اکٹھی اس کے جسم میں گھس گئیں۔ سجاول تلملا کر بائیں بازو کے سہارے گر پڑا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہاں موجود پتھروں کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ کسی برقی عمل کے تابع اپنے پوچ میں رینگ گیا تھا۔ پھر اس نے دانتوں کی مدد سے پن باہر نکالی اور بایاں ہاتھ دائیں پہلو پر جما کر دائیں ہاتھ سے دستی بم اپنے سے چند گز کے فاصلے پر آگ اگلتی اس مشین گن کی طرف اچھال دیا جس کی نالی سے شعلے نکل کر ممدو کی طرف لپک رہے تھے۔ زوردار دھماکے کی آواز میں اس مشین گن کی فائرنگ کی آواز بھی شامل تھی جس نے اچانک ہی سجاول کی پشت سے سر باہر نکالا اور اس کو نگل لیا۔

ممدو نے سجاول کو گرتے اور پھر لڑھکنیاں کھا کر ڈھلوان سے نیچے پھسلتے دیکھا۔ ''سنگی!'' وہ گلا پھاڑ کر دیوانوں کی طرح چلایا۔ ''میں ابھی آیا۔''
''چارج!'' اس کے گرداگرد پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

ممدو نے اپنے چاروں اطراف سے فوجیوں کو جنگی تربیت میں اس طرح بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے نزدیک حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ لوگ اپنی گنوں سے اس سمت اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

......ممدو پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں گرنیڈ تھام رکھے تھے۔ وہ اٹھ کر اس سمت بھاگا جہاں سجاول کی لاش لڑھک کر نیچے گری تھی۔ دونوں گرنیڈ اس نے یکے بعد دیگرے اپنے سامنے ہوا میں اچھال دیئے تھے جو سامنے سے ''چارج'' کرتے فوجیوں کے سروں پر پھٹے۔ اس کے ساتھ ہی درجنوں گولیاں مختلف اطراف سے اس کے جسم میں گھس گئیں اور وہ عین اس جگہ منہ کے بل جا گرا جہاں سے اس کا ساتھی سجاول لڑھک کر نیچے گرا تھا۔ دونوں کے جسد خاکی ایک دوسرے سے محض دو تین فٹ کی دوری پر گرے تھے۔

ان کی لاشوں تک دوڑ کر پہنچنے والوں میں سب سے آگے آرمی انٹیلی جنس کا میجر ورما تھا۔ اس نے ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا جس کی نال سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ وہ بے چینی سے دونوں لاشوں پر باری باری جھکا تھا، لیکن یہ دیکھ کر اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی کہ دونوں کبھی کے زندگی کا قرض چکا چکے تھے۔

''صاعقہ'' کے چاروں سرفروش جان سے گزر گئے اور پانچویں کو ان لوگوں نے خود مار ڈالا تھا۔ میجر ورما وحشیوں کی طرح ان کے مردہ

جسموں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔

''ان کی تلاشی لو۔'' اس نے اپنے دائیں بائیں کھڑے مستعد جوانوں کو حکم دیا۔ ''اور جو کچھ برآمد ہو، وہ مجھے دفتر میں پہنچا دو۔'' خود وہ اپنی ناکامی پر غصے سے تلملاتا ہوا لوٹ گیا۔

............☆☆☆............

چکوٹھی کی طرف آنے والے راستے پر ایک گہرے نالے پر بنا ہوا خاصا لمبا پل جنرل طارق کے ساتھیوں نے اڑا دیا تھا اور وہاں پہلے پہاڑی سلسلے میں غائب ہو کر دشمن کی آمد کے منتظر ہو گئے۔

فوجی تنظیم و تربیت کے مطابق ہراول دستوں سے پہلے دشمن کی ایک پٹرول پارٹی جائزہ لینے آئی اور جیسے ہی وہ لوگ پل کے نزدیک پہنچے، جنرل کے ساتھیوں نے ان پر جہنم کا دھانہ کھول دیا...... بھارتی سورما ایک گاڑی اور تین لاشیں وہاں چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ ان کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی ہراول دستوں کی آمد شروع ہو گئی، لیکن ان کا حشر بھی پہلے آنے والوں سے مختلف نہیں ہوا تھا۔ دشمن کی جب کوئی پیش نہ چلی تو اس نے حسب روایت اپنے سامنے والے پہاڑی سلسلے پر اندھا دھند گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔

سورج غروب ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر محاذ پر سکوت طاری ہو گیا۔ بالکل ایسا ہی سناٹا جو کسی بڑے طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہو۔ جنرل کے مٹھی بھر سرفروشوں نے پہرے بدل بدل کر یہ رات آنکھوں میں کاٹی۔ اس دوران وہ رات بھر گاڑیوں کے شور اور توپوں کی منتقلی کی آوازیں سنتے رہے، لیکن نالے کو عبور کر کے دشمن پر شب خون مارنے کی حسرت ہی دل میں لے کر بیٹھے رہے کیونکہ ان کی نفری نہ ہونے کے برابر تھی اور جنرل کو اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کی کمی بھی گوارہ نہیں تھی۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے بھی اپنی جگہ سے ہٹ جانے کی صورت میں بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا اور عین ممکن تھا کہ اس خلا کے بیچ میں سے دشمن راستہ بنا کر اس طرف آ نکلتا۔

اور پھر اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ان کے پاس اسلحہ کی کمیابی تھی۔ اول تو ان کے پاس برق رفتاری سے حملہ کرنے اور زیادہ نقصان پہنچانے والے ہلکے ہتھیار تھے ہی نہیں اور جو ایک دو مارٹر اور مشین گنیں تھیں، انہیں جنرل طارق نے اس طرح ''کیموفلاج'' کیا ہوا تھا کہ ان کو وہاں سے ہٹانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

علی الصبح بھارتی فوج نے زبردست حملہ کیا۔ حملے کا زیادہ تر زور جنرل کے دائیں پہلو پر تھا۔ جنرل کے جانباز پوزیشن بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے مارٹروں کا رخ بدل کر اتنی تیزی اور برق رفتاری سے فائرنگ کروائی کہ بھارتی فوج کو یہی گمان گزرنے لگا کہ مقابلے پر کم از کم تین چار بٹالین فوج آ گئی ہے۔ ابھی تک آرٹلری (توپ خانہ) کا فائر آ رہا تھا۔ دوپہر کے بعد دشمن نے دائیں پہلو پر جہاں اس کی دانست میں کسی کے اب تک زندہ بچ رہنے کا امکان نہیں تھا کیونکہ دشمن نے مسلسل دائیں طرف ایک مخصوص علاقے پر گولہ باری کی تھی اور اب اس کو ''صاف میدان'' جان کر اس سمت سے انفنٹری (پیدل فوج) کے ساتھ ہلہ بول دیا۔

جنرل صبح سے اب تک انفنٹری ہی کے حملے کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بڑی استقامت اور پامردی سے اب تک دشمن کی زوردار

فائرنگ کے دھماکے مورچوں میں دبک کر اور کانوں میں انگلیاں لے کر سنے تھے۔ توپ خانے کی گولہ باری کے سامنے ان کی رائفلیں اور مشین گنیں بیکار تھیں اور وہ لوگ اسلحہ پھونکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

جنرل طارق ایک محفوظ آڑ میں آنکھوں سے دوربین لگائے بارود اور دھوئیں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جب اس نے دھوئیں اور گرد و غبار کے بادلوں میں سے "چارج...... چارج!" پکارتے پیدل جوانوں کو اپنے دائیں طرف بڑھتے دیکھا، تو ایک پراسراری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کر گئی۔ اس نے اس طرح سکھ کا سانس لیا جیسے اس کی اب تک کی محنت کا معاوضہ مل گیا ہو۔ اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے اپنے نائب کو جنرل نے احکامات جاری کیے جو دوسرے ہی لمحے پہاڑی سلسلے میں غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل نے بھی مشین گن اور دستی بموں کا تھیلا سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا پہاڑی سلسلے کے اندر ہی اندر ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر گیا تھا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں پہاڑی راستے پر دشمن کے ہراول دستے پہنچنے ہی والے تھے۔

......بمشکل تین چارمنٹ بعد ہی ان کی آمد ہو گئی۔ ان کی پہلی سیکشن کو جنرل نے بخیریت گزر جانے دیا اور جیسے ہی دوسری کے بعد تیسری سیکشن اس کی زد میں آئی، انتہائی تیز رفتاری سے جنرل نے ان پر چند گز کے فاصلے پر گرنیڈ پھینکے۔

مسلسل پانچ چھ گرنیڈ وہاں سے گزرنے والی پلاٹون پر گرے اور پہاڑیاں دھماکوں اور مرتے اور زخموں سے چور سپاہیوں کی چیخ و پکار سے لرزنے لگیں۔ واپس بھاگنے والوں کو چاٹنے کے لیے جنرل طارق کی اسٹین گن کی سرخ اور خونی زبان باہر نکل آئی تھی۔ اس پوری پلاٹون میں سے بمشکل ہی کوئی سپاہی بچ کر جا سکا ہو گا۔ پہاڑیوں میں گونجتی دھماکوں اور زخمیوں کی چیخ و پکار میں اب پٹھانوں کے ولولہ انگیز نعرے گونجنے لگے تھے۔ اس کے ساتھی بڑھ چڑھ کر دشمن کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور اپنے شکار کو چن چن کر مار رہے تھے۔ اپنی دو تین پلاٹونوں کا صفایا کروانے کے بعد دشمن نے حملہ منسوخ کر دیا حالانکہ وہ اگر چاہتا تو تھوڑی سی قربانی دے کر اس طرح سے آگے نکلنے کا راستہ بنا سکتا تھا۔ لیکن بھارتی ہائی کمان نے اب اپنا منصوبہ بدل لیا تھا۔ وہ لوگ اوڑی سے اس سمت آگے بڑھنے کی بجائے جنوب کی سمت سے پونچھ تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں بھارتی فوج مجاہدین کے گھیرے میں آئی ہوئی تھی اور وہ لوگ روز بروز اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے کمانڈر مظفر آباد تک کا علاقہ خالی چھوڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اس طرف اپنی کچھ کمپنیوں کو لگا دیا تھا کہ وہ حملہ آوروں کو مصروف رکھیں اور مناسب موقع ملنے پر مظفر آباد کی سمت ایڈوانس بھی کریں۔

............☆☆☆............

چھ دن تک جنرل طارق اپنے سربلندوں کے ساتھ زندگی اور موت کی یہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اس کی نظریں اس دوران پاکستان سے اس طرف آنے والے راستوں پر جمی رہیں کہ ممکن ہے اب بھی کوئی ان کی مدد کو آ جائے، لیکن کشمیر کے برف زاروں میں جنرل طارق کی مدد کو کوئی نہ آیا......اب اس کی آخری امیدیں مقامی آبادی سے تھیں۔ اس نے اپنے ایک جانباز کو جو زخمی ہو چکا تھا، اپنی مشین گن دے کر ان آبادیوں کی طرف روانہ کیا تھا کہ یہاں سے کشمیری رضا کاروں کی کمک روانہ کرے۔

......چھ دن موسم اور بھارتی فوج کی اندھا دھند گولہ باری کا عذاب جھیلنے کے بعد ساتویں روز جنرل طارق کو صرف پچھتر رضا کار ارد گرد کی آبادیوں سے میسر آئے۔ ان میں سے زیادہ تعداد سابق فوجیوں اور آئی این اے کے سپاہیوں کی تھی۔ اس دوران جنرل اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ اعصاب مسلسل گولہ باری کا سامنا کرنے سے تڑخنے لگے تھے۔ وہ لوگ جنونی کیفیت میں لڑ رہے تھے۔ جنرل جس کی ساری زندگی میدان کارزار میں گزری تھی، بخوبی اس بات کو محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر مزید دو تین روز تک انہیں نفری میسر نہ آئی تو اس کے تمام ساتھی جواب نفسیاتی مریض بنتے جا رہے تھے، بالآخر ان کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔

انہوں نے پل توڑے، گھات لگائے، پوزیشنیں بدل بدل کر فائرنگ کی اور موقع ملنے پر نقب لگا کر پہاڑی راستوں پر دشمن کے کنوائے میں ایک آدھ پیچھے رہ جانے والی بدقسمت گاڑی سے اسلحہ بھی لوٹا تھا......ان پچھتر رضا کاروں کی ساتویں روز آمد سے جنرل اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے پھر سے بلند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی باغ اور پونچھ کے نواحی علاقوں سے بھی پیغامات آ رہے تھے کہ وہاں سے سرفروشوں کی ٹکڑیاں اس سمت چلی آ رہی ہیں۔ خود آزاد کشمیر کی بے وسیلہ حکومت بھی ان کے لیے رضا کار اور اسلحہ جمع کر رہی تھی۔ جنرل جانتا تھا کہ بھارتی فوج کے چڑھتے ہوئے طوفان اور اسلحہ کے انبار کے سامنے مٹھی بھر سرفروش کوئی حیثیت نہیں رکھتے، خود باغ اور پونچھ میں بھی ان کی پوزیشن ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی......لیکن اسے لڑنا تھا۔ آخری گولی اور آخری جوان تک......اور وہ لڑا۔

جنرل کا طریق جنگ یہ تھا کہ چھپ کر دشمن پر نقب لگاتا اور تیزی کے ساتھ پوزیشن بدل بدل کر یہی عمل دہراتا چلا جاتا۔ اس کے ساتھی ایک پہاڑی سے اچانک حملہ کرتے اور چند منٹوں بعد ہی بھاگ کر دوسری پہاڑی پر پہنچ کر یہی عمل دہراتے۔ اس طرح دشمن اسی دھوکے میں رہتا کہ سامنے کی تمام پہاڑیاں حملہ آوروں سے بھری ہوئی ہیں اور اس نے تین مشین گنیں دے کر نو واردوں کو جن میں اب ساڑھے تین سو مزید پاکستانی رضا کار بھی شامل ہو چکے تھے، پہاڑیوں میں بھیجا تھا۔

لیکن وہ لوگ جو شوق جہاد اور جذبے کے عالم میں یہاں چلے آئے تھے، عملی میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ دشمن کے نزدیک جانے سے ان کی جان جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے حملہ تو کیا، لیکن جب دشمن کی جوابی فائرنگ شروع ہوئی تو وہ لوگ پوزیشن بدلنے کی بجائے دم دبا کر بھاگ اٹھے۔ دو تین مرتبہ جنرل طارق نے ان کا حوصلہ بڑھا کر انہیں آگے روانہ کیا، لیکن ہر دفعہ وہ لوگ یہی کارنامہ انجام دیتے۔ بالآخر میجر اکرم اور ان کے دو تین ساتھی ہی وہاں رہ گئے تھے۔ جنرل نے ان بزدلوں کو ضائع کرنے کے بجائے ان کا ایک اور استعمال نکالا اور انہیں پہاڑی سلسلے میں دور دور تک پھیلا دیا۔ انہیں ہدایت دی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے اکا دکا فائر کرتے رہیں۔ اس طرح کم از کم دشمن ''تعداد کے دھوکے'' ہی کا شکار ہو جائے۔ یہ حکمت عملی کسی حد تک کامیاب رہی۔ گو کہ وہ لوگ دشمن کی فائرنگ سے محفوظ تھے، لیکن جب کبھی کسی ہیوی گن کا کوئی ایک آدھ گولہ ان کے نزدیک گرتا یا دشمن کا کوئی جہاز ان کے سروں سے دھاڑتا ہوا گزرتا، وہ ہراساں ہو کر بھاگ اٹھتے۔ ان میں سے سو کو جنرل نے دریا کے کنارے چٹانوں اور سرکنڈوں کی آڑ میں اس ہدایت کے ساتھ بٹھا دیا کہ وہ کم از کم وہاں سے دوسرے کنارے پر دشمن کے ایڈوانس کرتے ہراول دستے پر فائرنگ کر کے اسے نقصان پہنچاتے رہیں۔ ان کے سامنے راستہ تنگ تھا اور محض تین سو گز کے فاصلے سے دشمن بغیر کسی ''پکٹ'' کے ایڈوانس کرتا رہا

لیکن ان "مجاہدوں" نے دشمن پر ایک گولی بھی نہ چلائی۔ انہیں یہی دھڑکا لگا رہا کہ اگر انہوں نے فائرنگ کی تو دشمن کا جوابی فائر بھی آئے گا۔ بالآخر ان میں سے بھی صرف آٹھ باقی بچے، بقیہ تمام مجاہد واپس بھاگ گئے۔ اس دوران سواتی فوج کے دو سو جوان واپس آ گئے۔ جنرل جانتا تھا کہ ان لوگوں کو باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور صرف جوش جہاد ہی ان کو یہاں لے آیا ہے۔ اس نے ان کو دشمن سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے انہیں بھگوڑے مجاہدوں کے فرار کے راستوں کی ناکہ بندی کے لیے روانہ کر دیا اور انہیں ایسے پہاڑی ناکوں پر کھڑا کر دیا جہاں سے یہ لوگ واپس بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساڑھے تین سو مجاہدین سارے کے سارے واپس بھاگ گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنی رائفلیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس دوران مختلف ٹولیاں رضا کاروں کی آتی اور جاتی رہیں۔ کئی تو ان میں سے ایسے "مرد مومن" تھے کہ ایک بار محاذ کا منہ دیکھنے کے فوراً بعد ہی ان کا جذبہ جہاد سرد پڑ جاتا اور وہ بھاگ جاتے۔ جنرل کی پالیسی "ضرب لگاؤ اور بھاگو" تھی جب کہ یہ لوگ "دیکھو اور بھاگو" پر عمل پیرا تھے۔

مجاہدین آتے اور جاتے رہے۔ ان کی آمد لاریوں کے ذریعے ہوتی تھی اور وہ فرار ہونے کے لیے پہاڑیوں کے اندر خفیہ راستے استعمال کرتے تھے۔ اس سے جنرل کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دشمن غلط فہمی کا شکار رہا۔ دشمن کے جاسوس اسے یہی اطلاع دیتے کہ مجاہدین آتے اور پہاڑی سلسلے میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی روانگی ان جاسوسوں کی نظر سے چونکہ اوجھل رہتی تھی، اس لیے وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے اور بھارتی ہائی کمان کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ تاہم ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ ان آنے والوں میں سے ایسا عنصر ابھرنے لگا کہ جو لوگ محض جذباتیت کے زیر اثر نام نہاد جذبہ جہاد کے بجائے سنجیدگی سے اس جنگ آزادی کو جاری رکھنا چاہتے تھے، انہی باعمل لوگوں میں وہ 75 مجاہدین شامل تھے جو کشمیر کی پہلی مظفر آباد بٹالین بنے اور سابق ریاست کشمیر کا لیفٹیننٹ قدرت اللہ ان کا پہلا بٹالین کمانڈر منتخب ہوا۔ اس دوران پٹھانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں نے واپس بھاگ کر جو بدنامی مول لی تھی، اس نے ان کی شاندار عسکری روایات پر سیاہی پھیر کر رکھ دی ہے۔ وہ لوگ اپنے فرار پر شرمندہ تھے اور کفارہ ادا کرنے کے لیے جلد از جلد محاذ پر واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کی پیشکش جب جنرل طارق تک پہنچی تو اس نے انتہائی سوچ بچار اور اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورے کرنے کے بعد صرف تین سو محسودی قبائل کو ان کے سردار گلاب خان کی سربراہی میں واپس آنے کی اجازت دی۔

جنرل "ٹڈی دل" کی آمد اور اس کے نتائج دیکھ چکا تھا اور اب وہ اتنے ہی "مجاہدین" چاہتا تھا جنہیں با آسانی کنٹرول کیا جا سکے۔ پٹھانوں کو شکایت صرف یہ تھی کہ آخر پاکستانی فوج کیوں جنگ میں حصہ نہیں لیتی اور یہی ان کی ناراضی اور فرار کا سبب تھا۔ جب جنرل طارق نے گلاب خان کے سامنے ساری صورت حال رکھی اور اسے معاملات کی نزاکت کا احساس دلایا تو حقیقت پسند اور عظیم کردار کے مالک گلاب خان نے اس کی مرضی پر صاد کیا اور اس کے زیر کمان اپنے ساتھیوں سمیت لڑنے پر تیار ہو گیا۔

جنرل پٹھانوں کی جنگی استعداد سے واقف تھا اور اسے بخوبی علم تھا کہ اب تک مفتوحہ علاقہ انہی لوگوں کی قربانیوں کا باعث ہے۔ اس نے اگلے روز ان لوگوں کو یہ مشن سونپا کہ وہ دشمن کی پوسٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جنوب کی طرف اوڑی سے پونچھ کو جانے والی سڑک پر پندرہ میل دور نکل جائیں۔ جنرل نے پونچھ کی طرف کمک لے جانے والے بھارتی فوج کے دستوں کی روانگی کے راستے گلاب خان کو دکھا کر ایک مخصوص مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے حکم دیا کہ یہاں وہ لوگ بھارتی کمک پر گھات لگائیں۔

گلاب خان اور اس کے جیالوں نے دوسرے ہی دن بھارتی کنوائے کو دبوچ لیا۔ یہ لوگ پہاڑیوں میں گھات لگانے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ وہ فرشتہ اجل بن کر دشمن پر ٹوٹے۔ اس کے 36 بڑے ٹرک جلا کر راکھ کر دیئے، سینکڑوں فوجیوں کو تہ تیغ کیا اور ہتھیاروں کی بڑی تعداد، بے پناہ ایمونیشن، وائرلیس سیٹ، فوجی گرم کپڑے، فیلڈ ٹیلی فون اور چھ تین انچ مارٹر گنیں اٹھا کر دوبارہ 15 میل کا فاصلہ طے کر کے بعافیت جنرل اور اس کے ساتھیوں سے آملے۔ ان کی اس فتح مندانہ مراجعت نے محاذ پر موجود جوانوں میں برقی رو دوڑا دی۔ سارا محاذ ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پٹھانوں کی للکار گونج اٹھی ''دا کافروں پسے استو والاگا'' (کافروں کا تعاقب کرو)، ''کافرادہا'' (کافروں کو مار ڈالو۔)

پٹھان جان ہتھیلی پر رکھ کر برق رفتاری سے جنرل کی کمانڈ میں پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئے۔ جنرل طارق نے پیش قدمی کا بالکل قبائلی انداز اپنایا تھا۔ وہ دشمن کے ہراول دستے پر پہاڑیوں سے موت برساتے، اس کے پہلو کو چیرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس قیامت کی چال نے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ وہ لوگ خوفزدگی اور سراسیمگی کے عالم میں اپنی پہاڑی پوسٹیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کے تعاقب میں ان کا شکار کھیلنے والے پٹھانوں نے موت کا بازار سرد نہ پڑنے دیا اور جنرل طارق دشمن کو رگیدتا ان مٹھی بھر سرفروشوں کے ساتھ اوڑی کی دفاعی فصیل پر دستک دینے لگا۔

............☆☆☆............

دسمبر 1947ء کا آغاز:

قریباً چار ہفتے پہلے یہ محاذ ڈیڈلیئر ہو چکا تھا اور بھارتی سورما چکوٹھی اور پونچھ تک پیش قدمی کر گئے تھے۔ جنرل نے انہیں پونچھ سے کاٹا، چکوٹھی سے پیچھے دھکیلا اور اوڑی کو میدان کارزار منتخب کر لیا۔ بھارتی فوج پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ چکوٹھی اور اوڑی کے درمیان کا سارا علاقہ خالی کر کے وہ لوگ شہر کی سمت جانے والا پل توڑتے ہوئے شہر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ چند روز پہلے جنرل کشمیر کو بچانے کے لیے پل توڑ رہا تھا اور اب اس کا مدمقابل اپنی جان بچانے کے لیے یہی عمل دہرا رہا تھا۔ تین سو پٹھان جیالوں کی آمد نے محاذ کا نقشہ دنوں میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

جنرل مطمئن ہو کر چکوٹھی لوٹ آیا۔ اس نے اپنی توجہ اب مقامی باشندوں کو مسلح کرنے اور ٹریننگ دینے پر مرکوز کر دی۔ اس کام میں کئی ہفتے درکار تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ اس دوران بھارتی محاذ خالی دیکھ کر واپس نہ آجائیں۔ دشمن کو ''مصروف اور خوفزدہ'' رکھنا بھی ضروری تھا۔ جنرل نے مزید پٹھان مجاہدین کو محاذ پر بلا لیا۔ انہیں اپنی کمان میں لے کر جنرل نے پونچھ کی طرف ان احکامات کے ساتھ روانہ کیا:

''پونچھ روڈ کو دشمن کنوائے کا مرگھٹ بنا ڈالو''

''پونچھ محاصرے کو مضبوط کرتے ہوئے شہر پر شب خون مارو۔''

مقامی رضا کاروں کی ٹریننگ پر کچھ ساتھیوں کو مامور کر کے جنرل پٹھانوں کے ایک گروپ کے ساتھ اوڑی کی طرف نکل گیا۔ اس کی منزل ''گوہالن'' تھی۔ سڑک چھوڑ کر سات ہزار فٹ بلند سلسلہ ہائے کوہ کو مسخر کرتا اور منزلوں پر منزلیں مارتا بدر وحنین کا یہ مسافر اپنے سرفروشوں کے ساتھ تین تین فٹ برف پر پیدل سفر کرتا دو دن بعد گوہالن دشمن کے سر پر اچانک جا پہنچا۔ طارق کی اچانک آمد نے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔

صبح ہوتے ہی دشمن کے تین اسکواڈرن اس پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن کے ایئر کرافٹ پرے باندھ کر آتے اور ان پر اپنی مشین گنیں اور بم خالی کر کے چلے جاتے۔ دوبارہ پھر لوٹتے اور یہی عمل وہ سہ پہر تک دہراتے رہے۔

''گوہالن'' کی اونچی نیچی سرزمین، چٹانوں اور درختوں سے بھری پہاڑیوں نے اپنی گود مجاہدین پر وا کر دی تھی۔ وہ اس میں سما گئے اور یہ معجزہ ہی تھا کہ کسی ایک پٹھان کو بھی گہرا زخم نہ آیا۔

دوسری طرف ''آکاش وانی'' گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی کہ تین سو قبائلی حملہ آوروں کو ان کی ''وایو سینا'' (ہوائی فوج) نے مار ڈالا ہے۔

شام ڈھلنے سے قریباً آدھ گھنٹہ پہلے قبائلی مجاہدین نے جنرل طارق کی زیر کمان شمال مغرب اور جنوب میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جنرل نے ایک پارٹی کو ہراول کے طور پر ریکی کرنے کے لیے آگے بھیجا تاکہ وہ لوگ عقب میں جا کر سری نگر سے اوڑی کو آنے والی سڑک بند کر دیں۔ خود ایک گروپ کے ساتھ اوڑی شہر کی فصیل کے قریب ہو کر بیٹھ رہے تاکہ موقع پاتے ہی اپنے گروپ کے ساتھ اوڑی میں داخل ہو جائیں۔

مرکزی حملہ اگلے روز بارہ بجے ان لوگوں نے اوڑی پر کرنا تھا۔ جنرل کی پلاننگ بڑی شاندار تھی۔ اس نے فوج کے بارہ رضا کاروں کے سپرد وہ چھ 3 انچ کی مارٹر گنیں نصب کر رکھی تھیں اور ڈھائی سو گولے انہیں سونپے تھے کہ وہ لوگ ٹھیک دن کے بارہ بجے ان کا اشارہ ملنے پر اوڑی کیمپ کے عین وسط میں اچانک گولہ باری شروع کر دیں۔

جنرل طارق نے یہ مارٹر گنیں ایسی محفوظ اور ایسے زاویے سے لگا رکھی تھیں کہ وہ اپنی جگہ سے ڈھائی ہزار گز دور تک کے ٹارگٹ کو ہٹ کر سکتی تھیں۔ خود وہ گنوں سے قریباً ہزار گز دور ایک ایسے مقام پر بیٹھ گئے جہاں سے دشمن کا ہر کیمپ بخوبی نظر آ رہا تھا۔

پلان کے مطابق بارہ بجے ان مارٹروں کی اچانک گولہ باری کے بعد قبائلیوں نے رائفلوں کا فائر کھولنا اور دشمن پر گھات لگانا تھا، پھر کھلا حملہ کرنا تھا۔ جن لوگوں نے قبائلیوں کے ''عام حملے'' کا نظارہ کیا ہے، ان کے رونگٹے اب بھی اس حملے کے تصور ہی سے کھڑے ہو جاتے ہوں گے۔ اس حملے میں قبائلیوں کی حالت بپھرے ہوئے چیتوں کے ریوڑ کی سی ہوتی ہے، وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور خنجروں، تلواروں، بندوقوں سے دشمن کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس حملے کے تصور ہی سے کئی مقامات سے انگریز ان کے آگے دم دبا کر بھاگ جایا کرتا تھا۔

جنرل طارق کی نظریں بڑی بے چینی سے دشمن کے کیمپ پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہاں ہونے والی معمولی سے معمولی نقل و حرکت بھی اس کی نظر میں تھی۔ خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے اور جنرل نے مارٹروں کو فائر کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کے کان مارٹروں کے فائر سے ہونے والے دھماکوں کی آواز پر لگے تھے اور آنکھیں کیمپ کے اندر موت کا رقص دیکھنے کو بے چین تھیں، لیکن اعصاب شکن انتظار کی طوالت بڑھتی ہی چلی گئی۔ ''نام نہاد مجاہدین'' نے اپنا پرانا گھناؤنا کھیل کھیلا۔ انہوں نے جنرل کو پتہ ہی نہ چلنے دیا اور مارٹر گنیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بڑے ہی جان لیوا مراحل تھے۔ قبائلی مجاہدین بے چینی سے مارٹروں کے فائر کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس کی آڑ میں حملہ کریں اور اپنے دل کے ارمان نکالیں۔ جب دس منٹ تک اس طرف سے کوئی فائر نہ آیا تو جنرل معاملے کی سنگینی جان گیا۔ اس نے بجائے انتظار کرنے کے قبائلی مجاہدین کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

انہوں نے مسلسل پچاس گھنٹے بھارتی فوج کی ناک میں دم کیے رکھا۔ اس دوران جنرل کی سخت ہدایات کے تحت انہوں نے کیمپ پر تو حملہ

نہ بولا کیونکہ جنرل انہیں یہاں حرام موت مروانے نہیں لایا تھا، البتہ بھارتی فوج کی پٹرول پر انہوں نے کئی مرتبہ گھات لگائی۔ ان لوگوں کے پاس دو دن کا راشن اور گولہ بارود ہی تو تھا، اس سے زیادہ وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لا سکتے تھے۔

تیسرے روز اوڑی کا بریگیڈ کمانڈر گھگھیا کر وائرلیس پر سری نگر سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے کمک روانہ کی جائے ورنہ وہ دو گھنٹے بعد اوڑی سے پسپائی اختیار کر لے گا۔ جب اوڑی کا بریگیڈ کمانڈر دو گھنٹے کی لڑائی کے بعد پسپائی اختیار کرنے کے لیے صف بندی کر رہا تھا، جنرل طارق اور ان کے ساتھی انتہائی یاسیت کے عالم میں اپنی بے سروسامانی کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کا راشن ختم ہو چکا تھا۔ بہ مشکل اتنے راؤنڈ باقی بچے تھے کہ وہ لوگ گوہالن سے اپنی جانیں بچا کر نکل جائیں۔ برف باری کی شدت نے اب طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی، خون رگوں میں منجمد ہوا جاتا تھا۔

دشمن کے آٹھ سو سپاہیوں کو موت کی نیند سلا کر اپنے تیرہ ساتھیوں کی قربانی دے کر جنرل طارق اور اس کے ساتھی شہیدوں کی لاشیں اٹھا کر واپسی کا سفر اختیار کر رہے تھے۔ دسمبر کے آخری ایام تھے۔ برف باری کی شدت میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ گوہالن میں مجاہدین کا حصار ٹوٹ گیا۔ جنرل نے اپنے قدم اوڑی کی دفاعی فصیل کے باہر جما لیے اور وہ لوگ موسم، اپنوں اور غیروں کا عذاب جھیلنے کے لیے مستقبل کی تیاریاں کرنے لگے۔

............☆☆☆............

ناشری نالے کے دوسرے کنارے پر حوالدار غلام محمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی بے چینی سے شیرو کی آمد کا منتظر تھا...... وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا اور ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

......اس نے اغواء شدہ مسلمان لڑکیوں سے بھرا ہوا ٹرک حوالدار غلام محمد کو سونپ کر اس پر بہت بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔

رات کے پچھلے پہر تک حوالدار غلام محمد نے ان لوگوں کا انتظار کیا۔ اس نے شام ڈھلتے ہی ایک مخبر کو اس طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ صورت حال کا خود جائزہ لے کر آئے۔ مخبر جوان کا ایک ہوم گارڈ تھا، رات تقریباً آٹھ بجے واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہاں ہوم گارڈز اور فوج کے درمیان زبردست جنگ جاری ہے۔

حوالدار معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے ہر صورت میں ان مظلوم مسلم زادیوں کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ شیرو اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھی ہوم گارڈز کسی طرح بھی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، لیکن ایک اطمینان اسے بہر حال تھا کہ وہ بھی ایک انتہائی ضروری فرض ادا کر رہا ہے۔

ناشری نالے کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اس نے حسرت بھری نظر بٹوٹ کی سمت ڈالی۔ کبھی کبھی دھماکوں کی آواز اس کی سماعت سے بھی ٹکرانے لگتی تھی...... یہ مارٹر کے فائر کی آواز تھی۔ ہلکے اسلحے کی آواز یہاں تک نہیں آ سکتی تھی۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔'' اس نے ایک ہوم گارڈ کو اشارہ کیا۔

اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ سری نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ حوالدار غلام محمد دل ہی دل میں دعا مانگتا جا رہا تھا کہ سری نگر تک کا سفر بخیر و خوبی کٹ جائے۔ اسے اپنی یا ہوم گارڈز کی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو ان مسلمان مظلوم لڑکیوں کی جنہیں قدرت نے اس کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

......ہلکی ہلکی پھوار پڑنے کی وجہ سے ان کی رفتار بہت سست تھی۔ رام بن کے پل تک وہ لوگ عافیت سے پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر اچانک بارش کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ صبح تک وہ لوگ ایک پہاڑی کی اوٹ میں کھڑے رہے۔ اس دوران ٹریفک مکمل بند رہی۔ یوں بھی کسی خطرے کے پیش نظر بارش کے دوران اس سڑک پر کنوائے سفر نہیں کرتے تھے اور عام لاریوں اور ٹرکوں کا سفر تو شام ڈھلنے کے فوراً بعد ہی بند ہو جاتا تھا۔

علی الصبح ابھی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی جب حوالدار غلام محمد کی ہدایت پر ان لوگوں نے پھر سفر شروع کر دیا۔ ''بانہال'' کے نزدیک برف گرنے لگی۔ غلام محمد کو اب دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ کہیں خدانخواستہ ''پیر پنجال'' والی سرنگ کا راستہ بند نہ ہو جائے۔ ٹرک کے اگلے شیشے پر اب برف بار بار سفید چادر تان رہی تھی۔ اب وہ مزید رک کر یہاں انتظار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ٹرک رینگ رینگ کر آگے بڑھتا رہا۔

برف باری سے اسے جلد ہی نجات مل گئی۔ اب ان کے سامنے چنگاریوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ سورج کی کرنوں نے سامنے سڑک پر بکھری برف میں آگ لگانا شروع کر دی تھی۔ سفید کہرے پر پھسلتے ہوئے وہ بالآخر سری نگر تک پہنچ گئے جہاں فوج کا ایک دستہ اور مقامی ہوم گارڈز ان کے منتظر تھے۔ بنوٹ والے حادثے کی خبر یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ اب وہ لوگ ان کے ساتھ کچھ بھی سلوک کرتے، لیکن حوالدار غلام محمد کو یقین تھا کہ مسلمان عورتیں محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں۔

............☆☆☆............

قریباً دو گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد بالآخر انہیں ایک قدرے محفوظ پناہ گاہ میسر آ گئی۔ وہ لوگ کسی دیہات کے نزدیک پہنچ چکے تھے اور وہ دیہات کے باہر ایک پہاڑی کے دامن میں بنے باغ کے ایک کونے میں نظر آنے والی جھونپڑی تھی۔

کمرے کی چادر میں سسکیاں بھرتے ماحول میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیرو نے پہلے دور سے اس کا جائزہ لیا، پھر اس یقین دہانی کے بعد کہ جھونپڑی خالی ہے، اس نے آسیہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ سہمی سکڑی سمٹی لڑکی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ جھونپڑی سے چند گز دور ہی وہ رک گیا۔ اس نے اسٹین گن جھونپڑی کی طرف تان رکھی تھی۔

''تم اندر داخل ہو جاؤ، اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں نمٹ لوں گا۔ اندر اگر کوئی ہو تو اسے میری باہر موجودگی سے آگاہ نہ کرنا۔'' اس نے لڑکی کے کان میں سرگوشی کی۔

''اچھا۔'' لڑکی نے بادل نخواستہ کہا۔

وہ ڈرتی ڈرتی جھونپڑی کے دروازے تک پہنچی تھی جو بند تھا۔ وہاں رک کر اس نے شیرو کی طرف دیکھا۔ شیرو نے ہاتھ اور سر کے اشارے سے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے گھاس پھونس کا بنا دروازہ ایک طرف ہٹا دیا۔ اندر بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی ایک نامحسوس سی گھبراہٹ اس پر طاری تھی۔ ابھی بمشکل وہ دو قدم ہی اندر داخل ہوئی تھی کہ اس کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ اس نے بڑی ہمت سے اپنی چیخ کا گلا گھونٹا تھا، پھر شیرو اس کے تعاقب میں اندر آ گیا۔

......لڑکی نے معاملے کی سنگینی کا احساس کر لیا اور یہ جان لیا تھا کہ یہاں سے اٹھنے والا کوئی بھی شور ان دونوں کی جان لے لے گا۔ شیرو نے

ماچس کی دوسری تیلی جلائی تھی۔ ان کے سامنے ایک کونے میں چارپائی پر ایک لکڑی کا بکس کھلا ہوا تھا جس میں سے کپڑے نکل کر باہر گرے تھے۔ ایک طرف ایک لالٹین کو سیدھا کیا جس کا شیشہ کئی جگہ سے تڑخ گیا تھا۔ ہلا کر دیکھا تو شیرو کی جان میں جان آئی۔ اس میں تیل موجود تھا۔ اس نے سب سے پہلے اسی کو روشن کیا اور لو بڑھا کر وہ آسیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''اٹھو! ادھر بیٹھ جاؤ'' اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ''گھبراؤ نہیں۔'' آسیہ نے کسی سحرزدہ معمول کی طرح اس کا حکم مانا تھا۔

ٹرنک میں رکھے ہوئے کپڑے مالک کے صاحب حیثیت ہونے کا احساس دلاتے تھے۔

شیرو نے چادر اپنے جسم سے الگ کر دی اور اپنی وردی پر لگے ہوم گارڈز کے تمام نشانات نوچ ڈالے۔ اس نے وردی کے اوپر وہاں موجود ایک لمبی سی قمیض اوڑھ کر اس پر گرم جرسی پہن لی...... اب کسی کو اس پر ہوم گارڈ ہونے کا شک نہیں گزر سکتا تھا۔ ایک جرسی اور جرابیں ٹرنک سے نکال کر اس نے آسیہ کی طرف بھی بڑھا دیں۔ جرابیں اپنے پاؤں میں پہنتے ہوئے جب اس کی نظریں اچانک شیرو سے ٹکرائیں تو شیرو کا دل بھر آیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے پہلی مرتبہ اس کے شباب کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ لڑکی کسی کھاتے پیتے گھرانے کی نظر آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی اسی امر کی دلالت کرتے تھے اور شیرو کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ اس کی بربادی کی وجہ بھی اس کے باپ کی دولتمندی ہی ہوگی کیونکہ اول تو مسلمان اور پھر مالدار، کبھی بھی ہندو لیڈروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے، لیکن میں بہت مجبور ہوں۔ کاش تمہارے لیے گرم کپڑوں کا بندوبست کر سکتا۔'' شیرو خواہ مخواہ ندامت سی محسوس کر رہا تھا۔

''مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔'' لڑکی کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، لیکن اس نے کمال ضبط سے آنسو پی لیے۔

ٹھنڈک سے شیرو کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں خارش محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ لڑکی کی حالت کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ یہ اس کے صبر کی انتہا تھی کہ اس نے ابھی تک اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی موسمی اور تقدیری زیادتی کی شکایت شیرو سے نہیں کی تھی، شاید اس طرح وہ اپنے محسن پر مزید کوئی ذہنی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی تھی کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کو مسلمان بیٹیوں کی عزت بچانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بتوٹ کے جہنم زار سے ان کی عصمتیں بچانے والے انسان نہیں فرشتے ہوں گے۔

شیرو اچانک کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اس نے جھونپڑی کا دروازہ کھول دیا اور باہر نکل آیا۔ نجانے کیوں اسے یہاں عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔

باہر آ کر اس نے دو چار لمبے لمبے سانس لیے اور چاروں اطراف گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا۔ پھر وہ مطمئن ہو کر لوٹا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد شیرو کی واپسی بھی ہوگئی۔ وہ اسے کسی اور ہی عالم کی مخلوق دکھائی دے رہا تھا۔ ''ایسے عظیم انسان بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں۔'' اس نے سوچا اور شیرو کی طرف دیکھتی رہی جو اس کی موجودگی سے بے پروا ایک کونے میں دھرے مٹکے میں سے پانی نکال کر ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ فارغ ہو کر اس نے تنقیدی نظروں سے جھونپڑی کی دیوار کا جائزہ لیا۔ دیواروں کے اندر باہر مٹی کا لیپ کیا گیا تھا۔ قدرے مطمئن ہو کر اس

نے لکڑی کا بکس درمیان میں رکھا اور اس کے اوپر وہاں موجود باقی کپڑے پھینکنے لگا۔

''تھوڑی دیر بعد صبح ہو جائے گی۔ اگر تم ضرورت سمجھو تو منہ ہاتھ دھو لو۔ ہمارا زیادہ دیر تک ٹھہرنا میرے خیال میں مناسب نہیں۔'' اس نے آسیہ کو مخاطب کیا اور بغیر اس کا جواب سنے ''ابھی آیا'' کہہ کر باہر نکل گیا۔

آسیہ کو اب اس کی کسی حرکت پر حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی واپسی بمشکل تین چار منٹ بعد ہی ہوگئی شیرو کے دونوں ہاتھوں میں سیب نظر آ رہے تھے۔

''میں نے سوچا روانگی سے پہلے ناشتہ ہی کر لیں۔'' اس کی بات پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ خواہ مخواہ لڑکی کے ہونٹوں پر آ گئی۔

''برا مت مانو اس طرف تو آ جاؤ۔'' اس نے آسیہ کو دروازے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

پھر سیب اس کے ہاتھوں میں تھما کر اس نے چارپائی ایک کونے میں کھڑی کر دی اور زمین پر بیٹھ کر ایک کپڑے کو آگ لگا دی۔ دو تین منٹ تک دھوئیں سے آنکھیں سرخ کروانے کے بعد وہ بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ لکڑی کا بکس جلنے لگا تھا۔ جھونپڑی میں موجود گھٹن میں بکس کے جلنے سے خاصی کمی ہو گئی تھی۔ آسیہ کو آگ کی تپش سے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو رہی ہے۔

......آگ کے گرد کھڑے ہو کر اس نے شیرو کے بے پناہ اصرار پر منہ ہاتھ دھویا اور دو سیب کھائے تھے۔ نہ جانے اسے کیوں یقین ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس کو کبھی مرنے نہیں دے گا اور زندگی کی ساری روٹھی ہوئی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں گی۔

''یہاں بٹوٹ میں تمہارے علاوہ اور کون کون تھا؟'' شیرو نے نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی کے طلسم کو توڑا۔

''میں، بابا اور بے بے۔ میرے دونوں بھائی سری نگر میں ہیں اپنے چچا کے پاس۔ ہمارا وہاں خشک میوے کا کاروبار ہے۔ ہم بھی اگلے روز سری نگر جانے والے تھے کہ اچانک یہ قیامت آ گئی۔ ہندوؤں نے میرے والدین کو مار ڈالا اور مجھے پولیس والے وہاں...... ''سونی لاج'' میں لے گئے تھے۔''

......اس مرتبہ اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں تھا۔

شیرو بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ کسی طرح ہلکا کر لے۔ اسے اس لڑکی کے بے پناہ صبر و ضبط سے اب خوف سا آنے لگا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر آسیہ کے اندر موجود غبار نہ چھٹا تو کہیں وہ اچانک ہی نہ پھٹ پڑے اور اس کی جان لے لے۔

''اوہ معافی چاہتی ہوں۔ مجھے اس طرح آپ کے سامنے رونا نہیں چاہیے تھا۔'' وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

''نہیں آسیہ!'' شیرو کی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''اچھا ہے آدمی اپنے دکھ درد پر رو لے۔ یہ اندر اندر کی گھٹن بسا اوقات بڑی جان لیوا ہو جاتی ہے۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ خلاء میں گھورنے لگا تھا۔

آگ پر نظریں جمائے کھڑے ہوئے شیرو پر اس لمحے آسیہ کو بڑا رحم آیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شیرو تو اس سے بھی زیادہ مظلوم ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہمدردی کا مستحق۔ جانے اس کے اس فقرے میں ایسی کیا بات تھی جو آسیہ کو کھا گئی۔

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''پونچھ کا'' شیرو نے جواب دیا اور آسیہ نے بڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ پونچھ سے یہاں......'' اس نے فقرہ نامکمل ہی چھوڑ دیا۔

''بس قدرت کے کام ہیں۔ میں نے تو کبھی زندگی میں نوکری کرنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا''

پھر آسیہ کا جی چاہا کہ وہ اس کے گھر بار کی بھی خبر لے لے۔ اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں جھجکتے ہوئے اس سے سوال کر ہی دیا۔

''آپ کے بچے بھی تو ہوں گے وہاں؟''

شیرو اس کا مدعا جان گیا تھا۔ مسکرا کر چپ ہو رہا، پھر بڑی آہستگی سے بولا ''میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میری ماں نے ابھی ایسا سوچا ہی نہیں۔ میری صرف ماں ہی ہے، لالہ ہے، بے بے ہے اور زہراں۔ خدا جانے وہ لوگ کس حال میں ہوں گے؟ مجھے پونچھ سے آئے ہوئے قریباً ایک مہینہ ہو گیا ہے۔''

''اوہ! آپ کو پونچھ میں انہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہاں تو حالات بہت ہی خراب ہیں۔ سنا ہے لوگ مہاراجہ کی فوج سے لڑ رہے ہیں۔''

صرف مہاراجہ کی فوج کہاں۔ اب تو سارے بھارت کی فوج بھی وہاں پہنچ چکی ہوگی۔'' شیرو نے آہ بھری۔

''پونچھ کے لوگ بہت بہادر ہیں۔ وہ کبھی نہیں ہاریں گے۔'' آسیہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

پونچھ کے مجاہدوں کی کہانیاں کشمیر کے گھر گھر میں پہنچ چکی تھیں اور آسیہ سے زیادہ اور کس کو ان کی خبر ہوگی کیونکہ اس کا باپ خود سیاسی آدمی تھا اور سارے کشمیر کیا سارے ہندوستان کی خبر رکھتا تھا۔

''آپ بہت بہادر لوگ ہیں۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ''آپ نے بہت اچھا کیا جو لڑائی جاری رکھی، لیکن یہ ہوم گارڈز تو فراڈ ہیں۔ شیر کشمیر کا سیاسی فراڈ۔''

شیرو چونکا۔ لڑکی خاصی عقلمند تھی، لیکن آسیہ کو یوں لگا جیسے اس نے یہ کہہ کر غلطی کی ہو کیونکہ شیرو بھی تو ہوم گارڈ ہی تھا۔

''آپ میری بات کا برا مت مانیے۔ شاید صدمے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ میرا ابا بھی گاندھی کا زبردست پیروکار تھا اور کانگریس کے مقامی حلقوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔ ملک آزاد ہونے پر ہمارے گھر پر کانگریس اور بھارت کا ترنگا لہرایا گیا تھا۔ جب جن سنگھ والوں نے ہمارے گھر پر حملہ کیا تو بھی ہمارے گھر پر ترنگا لہرا رہا تھا، لیکن انہوں نے میرے ماں باپ کو صرف مسلمان ہونے کے جرم میں مار ڈالا۔ میں گاندھی جی کا بڑا احترام کرتی تھی لیکن اب مجھے سارے ہندوؤں سے نفرت ہو گئی ہے...... شدید نفرت۔ یہ لوگ کبھی ہم پر اعتماد نہیں کریں گے۔ بٹوٹ میں ساری تباہی مہاراجہ کے اشارے پر عمل میں لائی گئی تھی۔ اس نے مظفر آباد سے آئے ہوئے سکھوں کو کہا تھا کہ مسلمانوں کو مار ڈالو، اگر وہ لوگ جن سنگھ کی مدد نہ کرتے تو ہمیں آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے......'' وہ جنون میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی، پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہمیں چلنا چاہیے، صبح ہونے والی ہے۔'' شیرو نے اس کے خاموش ہونے پر گردن جھکائے جھکائے کہا۔

ان کے سامنے دھری آگ اب ٹھنڈی پڑنے لگی تھی، لیکن رات بھر وہ سردی کے جس عذاب میں مبتلا رہے اس کی اذیت اب خاصی کم پڑ گئی تھی۔ شیرو نے اسٹین گن کو اس طرح اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا کہ اب وہ اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی، دونوں باہر نکل آئے۔

''میری اطلاعات کے مطابق ابھی مسلمانوں کے کچھ گاؤں بچے ہوئے ہیں، لیکن ہمیں ان سے مدد کی توقع نہیں، ہمیں صرف سری نگر پہنچ کر ہی اماں مل سکتی ہے۔ اردگرد کے تمام علاقے میں جن سنگھ کے غنڈوں نے ہندو فوج کی مدد سے اسلحہ تقسیم کر رکھا ہے اور وہ بے دریغ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ ہوم گارڈز بھی ان کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتے، بے چارے مجبور ہیں۔ ہم نے بھی جو کچھ کیا، اس کی سزا ہمیں بھگتنی پڑے گی، لیکن تم گھبرانا نہیں۔ میں صرف ہوم گارڈ ہی نہیں، کشمیری مسلمان بھی ہوں اور میرے اجداد نے مجھے اپنی غیرت بچانے کے لیے مرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ میرے جیتے جی کوئی میلی نظر سے تمہاری سمت دیکھ نہیں سکے گا۔'' شیرو کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے آسیہ کو بالکل اطمینان دلا دیا۔

پو پھٹنے لگی تھی اور انہیں قریبی دیہات کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ شیرو نے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اپنایا تھا جو لمبا ضرور تھا لیکن محفوظ تھا۔ وہ لوگ دیہات سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ سورج نے اب پہاڑوں کی اوٹ سے ڈرتے ڈرتے سر باہر نکالنا شروع کیا تھا۔ اس کی سہمی ہوئی خوفزدہ کرنیں زمین پر پھیلی کہرے کی چادر پر کانپ رہی تھیں اور دونوں کو اسی روشنی میں گاؤں کے مکانوں پر جھانکتے کیسری رنگ کے ترنگے بخوبی دکھائی دے رہے تھے جو ان کے یہاں سے بچ کر گزر جانے کے عقلمندانہ فیصلہ پر دلالت کرتے تھے۔

............☆☆☆............

پونچھ کو مجاہدین نے اپنی انتہائی کوشش کے بعد باقی کشمیر سے کاٹ دیا تھا۔

......اور کشمیر کے اندر بریگیڈیئر پریتم سنگھ کی فوج مسلسل محاصرے کی حالت میں تھی۔ پریتم سنگھ کی فوج اور اندر موجود آبادی کو سپلائی صرف باہر ہی سے جا سکتی تھی، لیکن جنرل طارق نے نومبر کے مہینے میں اوڑی، پونچھ روڈ کو بند کر دیا تھا اور متبادل راستہ (میوکل ٹریک) جس پر صرف خچر ہی سفر کر سکتے تھے، گلمرگ کی پہاڑیوں سے ہو کر وادی کی طرف آتا تھا جو برف باری کی وجہ سے قریباً قریباً ناقابل عبور ہو چکا تھا۔

پونچھ کو آنے والے راستے بند ہونے کی وجہ سے اب بھارتی فوج کی امیدیں صرف اپنی فضائیہ سے وابستہ تھیں، لیکن یہاں طیاروں کے لینڈ کرنے کے لیے جو مختصر سا گراؤنڈ تھا وہ مجاہدین کی فائرنگ کی زد میں تھا اور ان کی فائرنگ سے بچ کر جو ڈکوٹا جہاز یہاں اترتے تھے، وہ انتہائی ضروریات کا سامان ہی لا سکتے تھے، پھر مجاہدین نے مزید جانفشانی دکھائی تو طیاروں کی لینڈنگ بھی ناممکن بنا دی۔ اس صورت حال نے فوج کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

عین ان لمحات میں سیکٹر کمانڈر کرنل صادق خان کو ایک ایسا حکم ملا جس نے خود انہیں ہلا کر رکھ دیا، جی ایچ کیو سے پیغام آیا تھا کہ عارضی فائر بندی ہو گئی ہے۔

کرنل صادق اس دلیل پر تلملا کر رہ گئے۔ انہوں نے اس ''عارضی فائر بندی'' کے پس پردہ برہمنی ذہنیت سے اپنی ہائی کمان کو آگاہ کرنا چاہا تو کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرے اور ان کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔

زخمیوں، بیماروں کو نکالنے اور یہاں موجود سویلین آبادی کو اناج مہیا کرنے کی آڑ میں بھارتی فوج نے نہ صرف بے پناہ ایمونیشن اور سامان رسد ہی شہر میں پہنچایا بلکہ اطراف کی پہاڑیوں میں بھی کمال عیاری سے اپنی بیٹریاں منتقل کر دیں اور جب صورت حال کی نزاکت کا احساس خداوندان سیاست وسیادت کو ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔

جنرل طارق ان تمام باتوں سے لاتعلق اوڑی کے برف زاروں میں دشمن پر کاری ضرب لگانے کے منصوبے بنا رہا تھا جب اسے یہ اطلاع ملی کہ بغیر چھٹی لیے نوکری سے غیر حاضر رہنے پر اس کو تین ماہ کی ''کمانڈ تنخواہ'' سے محروم کرتے ہوئے اس کی ترقی بھی بند کر دی گئی ہے اور اس سے دو جونیئر افسران کو ترقی دی جا رہی ہے۔ اندریں حالات جنرل نے محسوس کیا کہ اب اس کا محاذ پر رہنا کہیں کشمیر کی جنگ آزادی کو نقصان نہ پہنچا دے کیونکہ مخالفت کی وجہ صرف اور صرف اس کی ذات تھی اور وہ سارے کشمیر کو اپنی انا کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔

لاہور میں وزیر اعظم کے ساتھ کانفرنس کے دوران جنرل طارق کو تین ماہ تک جنگ جاری رکھنے کے احکامات ملے تھے۔ اس نے تین ماہ تک بڑی بے جگری اور صبر و شکر کے ساتھ اپنوں اور پرایوں کے حملے برداشت کیے تھے۔ اوڑی سیکٹر برف تلے دبا پڑا تھا۔ باقی تمام محاذوں پر بھی جمود طاری تھا۔ پاکستان کے کشمیر پر حق کا دعویٰ اقوام متحدہ میں زیر بحث تھا اور عالمی رائے عامہ خاصی حد تک پاکستان کے حق میں ہموار ہو چکی تھی۔

اس دوران آزاد کشمیر کا جی ایچ کیو بھی قائم ہو چکا تھا۔ ''لبریشن کمیٹی'' نے سیاسی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی تھی جہاں انتظامی امور کے بجائے سیاسی امور زیادہ زیر بحث رہتے تھے۔ ہر کوئی دوسرے پر الزام لگانے اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ عہدوں کی بندر بانٹ کے لیے جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی۔ یہ تھے وہ سنگین حالات جن میں جنرل طارق نے اس گندی سیاست سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور حکومت سے درخواست کی کہ اسے کشمیر کی کمانڈ سے فارغ کر دیا جائے۔

..........☆☆☆..........

نورولی کو حسن کی آمد کی اطلاع شرفو کے قریب ہی بیٹھے ہوئے ملی تھی۔ وہ لوگ وہاں ایک اہم فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ پونچھ میں بھارتی فوج کی مضبوط پوزیشن اور دوسرے محاذوں پر ابھی تک پاکستانی فوج کے پس وپیش نے انہیں اپنی خواتین اور بچوں کے مستقبل کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

......نورولی کی جہاندیدہ نظروں نے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہی یہ نتیجہ مرتب کر لیا تھا کہ عورتوں اور بچوں کو سرحد پار پاکستان بھیج دیا جائے اور وہ اگر پاکستان نہ بھی پہنچیں تو کم از کم کشمیر کے آزاد کردہ علاقے میں چلے جائیں۔

اس کے ساتھیوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے بوڑھے نورولی کی باتیں سنیں اور خاصی بحث کے بعد وہ لوگ عورتوں، بچوں، ضعیف اور زخمی مردوں کو سرحد پار بھیجنے پر رضامند ہوئے تھے۔ جوانوں کا ایک دستہ بھی انہوں نے اس قافلے کی حفاظت کے لیے تیار کیا تھا کیونکہ ٹکڑیوں کی شکل میں اس سے پہلے پونچھ سے نکلنے والے مسلمان قافلوں پر جو قیامت مقامی غیر مسلم آبادی اور فوج کے ہاتھوں ٹوٹی تھی، اس سے وہ لوگ بخوبی آگاہ تھے۔

نورولی کے لیے پریشانی کا باعث زہراں کا انکار تھا۔ زہراں نے شیرو کی واپسی تک یہیں رکنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہاں سے جانے یا نہ

جانے کا فیصلہ بھی شیرو پر ہی چھوڑا تھا۔ نورولی نے شرفو کو اسی لیے اب اس کے پاس بھیجا تھا کہ وہ زہراں کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرے۔

شرفو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ تو حقیقتاً یہی چاہتا تھا کہ زہراں یہاں سے چلی جائے اور اس طرح کم از کم وہ اس ذہنی کشمکش سے تو نجات حاصل کر لے گا جو زہراں کی موجودگی نے اس پر طاری کر رکھی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ موجودہ سنگین حالات میں اپنے دوست کی امانت کی صحیح طریقے سے رکھوالی نہیں کر سکے گا۔ اس کے اندر جس اشرف خان نے زہراں کو دیکھ کر سر اٹھانا شروع کر دیا تھا، اس سے شرفو بہت خوفزدہ تھا وہ بنیادی طور پر سیدھا سادا طالب علم تھا اور جنگ آزادی میں شمولیت کے بعد سے اس کی ساری صلاحیتیں صرف ڈوگرہ سامراج کے خلاف جنگ کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھیں لیکن زہراں......؟

زہراں کی اچانک آمد نے اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسی لڑائی شروع ہو چکی تھی جس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو مجرم گرداننے لگا تھا اور یہ احساس جرم اسے شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

نورولی کے اس فیصلے نے اس کی مشکل خاصی آسان کر دی تھی، لیکن زہراں کے انکار نے اسے پھر سوچوں کے گرداب میں لا کر پھینک دیا تھا۔

پہاڑی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ زہراں اپنا فیصلہ بدل دے۔ اچانک کسی آواز کی بازگشت نے اس کے قدم تھام لیے۔ پہاڑی کے دوسرے کونے سے کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ آواز ایک گونج پیدا کرتے ہوئے اس تک پہنچی تھی۔

''خدا خیر کرے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور واپس چلا گیا۔

پہاڑی موڑ مڑتے ہی جس شخص پر اس کی نظر پڑی، اسے دیکھتے ہی شرفو کی دھڑکنوں میں شدت پیدا ہو گئی۔

''فرزند تم!'' اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

''شرفو!'' فرزند اس کی بانہوں میں سمٹ گیا۔ ''میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا شرفو، مجھے معاف کر دینا۔'' فرزند نے اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے شرفو کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔

نورولی بھی اس اثناء میں وہاں چپ چاپ آ کر کھڑا ہو گیا۔ فرزند کی کہی ہوئی بات اور نورولی کی سوگواری نے شرفو کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا، لیکن اس کا دل اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

''کیا بات ہے فرزند؟ کیا ہوا؟'' اس نے بے چینی سے فرزند سے پوچھا جس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

فرزند نے کچھ کہنا چاہا، لیکن اچانک جیسے کسی طاقت نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی۔ سامنے کے موڑ سے اچانک زہراں نمودار ہوئی تھی۔ شاید یہ خبر اس تک پہنچ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ نورولی کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

''خدا کو یہی منظور تھا بیٹی کہ شیرو ہم سے الگ ہو جائے۔ شاید خدا کو مجھ بوڑھے کی قربانی منظور نہیں۔ بخدا وہ سربلندوں میں سربلند تھا کہ عظیم فرض کی ادائیگی میں اس نے شہادت پائی اور ہمیں اکیلا چھوڑ گیا۔'' نورولی کی آواز بھرا گئی۔

''صبر...... میری بچی صبر کرو۔ یہ کفران نعمت ہے۔ شہیدوں کو رویا نہیں کرتے میری بچی۔'' نورولی کا گلا رندھ گیا۔

فرزند نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور شرفو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا، وہی بات سچ نکلی جو اس نے سوچی تھی۔

''اف خدایا! یہ کیا ہو گیا!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا، پھر اسے اپنے گالوں پر گرم آنسوؤں کے قطرے گرنے کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غبار جس نے اس کا دم گھونٹنا شروع کر دیا تھا، اس کے پیٹ سے حلق کی طرف سفر کرنے لگا۔ شرفو نے انتہائی ضبط سے کام لیا، لیکن اس ریلے کی طغیانی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''شرفو!'' فرزند نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''اگر تم ہی ہمت ہار گئے تو زہراں......''

اور اس نے سوچا واقعی اب اسے زہراں کا سہارا بننا تھا۔ حالات نے جس بری طرح اس لڑکی کو رگیدا تھا، اس کے بعد شرفو کے سوا اس کا رہا ہی کون تھا۔

''مجھے ساری کہانی سناؤ فرزند۔'' شرفو نے حیرت انگیز ضبط کا مظاہرہ کیا پھر وہ زہراں سے مخاطب ہوا۔ ''آؤ زہراں تم بھی سن لو۔ فرزند اس کے ساتھ بٹوٹ میں تھا۔ وہیں ہمارا شیر شہادت کے منصب پر سرفراز ہوا ہے۔ چپ ہو جاؤ زہراں۔ ان آنسوؤں کو یوں مت بہاؤ۔ ابھی ہمیں بہت رونا ہے۔ اپنے پیاروں کا ماتم کرنے کے لیے ابھی ہمیں بہت لمبی زندگی گزارنی ہے زہراں۔''......اور زہراں چپ ہو گئی۔ چاروں اس کمرے میں آن بیٹھے نورولی سارے راستے انہیں تسلیاں دیتا آیا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ طفل تسلیاں ہیں۔ شیرو کی یاد ساری زندگی ان دونوں کو رلائے گی۔

............☆☆☆............

''میں شیرو کے ساتھ تھا۔'' کمرے میں بیٹھتے ہی فرزند نے انہیں سری نگر سے بٹوٹ تک کی کہانی سنانا شروع کر دی۔ ہم اکٹھے فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹے تھے۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اکیلا تمہیں یہ کہانی سنانے کے لیے زندہ بچا ہوں۔ کتنا بدقسمت ہوں میں۔ شاید ہی کوئی اور بچا ہو۔ سوائے ان کے جو حوالدار غلام محمد کے ساتھ سری نگر کی طرف نکل گئے۔ نورولی! بخدا میں بزدل نہیں ہوں، لیکن یہ بے مقصد کی بے وقعت موتیں اب میری برداشت سے باہر ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں نے وہ وہ منظر دیکھے ہیں کہ اب میرا ایمان ہی انسانیت سے اٹھنے لگا ہے۔ نورولی! پٹھان بھاگ رہے ہیں۔ ہندو فوج آگے بڑھ رہی ہے۔ ادھر پاکستان سے کوئی فوج ہماری مدد کو نہیں آ رہی۔ ہم اتنے مومن نہیں کہ آسمان سے فرشتے ہماری مدد کو اتریں گے۔''

......اس کے آخری فقرے کی کاٹ اتنی گہری تھی کہ بوڑھا نورولی تلملا اٹھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے بڑی ہمت سے کام لے کر اپنے لہجے پر کنٹرول کیا تھا۔

''نورولی!'' فرزند کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔ ''کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی کا خطرہ ٹلا نہیں کرتا۔ خدا کے لیے حالات کو سمجھو۔ ہم اس بے سروسامانی کی حالت میں آخر کب تک لڑ سکتے ہیں...... کب تک؟ اور ہم آخر لڑ کس کی امید پر رہے ہیں؟ دشمن اپنی پوزیشن مستحکم کرتے ہی ایک ایک کو سسکا سسکا کر مار ڈالے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکل جاؤ۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے نظریں جھکا لیں۔ شاید اس میں کسی سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

وہاں موجود چاروں میں سے ہر کوئی دوسرے سے نظریں چرا رہا تھا جیسے وہ چاروں ایک دوسرے کے چور ہوں۔ تینوں مرد خود کو شیرو کی موت کا ذمے دار سمجھ رہے تھے۔ ان سب پر سکوت طاری تھا، پھر نور ولی نے ہی ہمت کی۔

''فرزند! میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں جلد یا بدیر یہ حصار بالآخر ٹوٹ جائے گا، لیکن ہم کو لڑنا ہے۔ آخر دم تک...... آخری آدمی تک۔''

......ہم ہراول دستے کے سپاہی ہیں اور اگر ہم ہی ہمت ہار گئے تو واللہ کشمیر کے چپے چپے پر پھیلی یہ مدافعت دم توڑ جائے گی۔ وہ لوگ صرف ہم سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ چنگاری ہم نے سلگائی تھی...... ہم پونچھ کے لوگوں نے اور اس آگ کا ایندھن بھی اب ہم ہی کو بننا ہوگا۔''

اس کی بات ابھی بمشکل مکمل ہی ہوئی تھی کہ دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اشرف خان نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ فرزند رائفل پکڑ کر اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے سے چپک گیا۔ نور ولی خود آگے بڑھا۔ اس نے زہراں کو شرفو کے پیچھے کھڑے ہونے کو کہا۔

''کون ہے؟'' اس نے باہر نکل کر للکارا۔

''میں ہوں چاچا نور ولی۔'' ایک مجاہد کی آواز آئی۔

''آجاؤ۔'' اس نے آواز پہچان کر آنے والے کو اجازت دی۔ ''تم یہاں کیسے فضل داد؟'' نور ولی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

اس اثناء میں باقی تینوں بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''میں بڑی مشکل سے ان لوگوں کو دھوکا دے کر یہاں تک آیا ہوں چاچا نور ولی۔'' فضل داد کی گھبراہٹ نمایاں تھی۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟'' نور ولی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''چاچا حوالدار صاحب شہید ہو گئے۔'' اس نے شرفو کی طرف بڑی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' نور ولی کے منہ سے نکلا۔

''کیا؟'' شرفو نے فضل داد کو آگے بڑھ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

''ہاں شرفو بھائی۔ تمہارے والد شہید ہو گئے۔ میرا بھائی کرم داد بھی ان کے ساتھ شہید ہوا ہے۔ بریگیڈیئر پریتم سنگھ کے سپاہیوں نے ان دونوں کو گھیر اڈال کر زندہ گرفتار کر لیا تھا، پھر ایک درخت سے لٹکا کر دونوں کو پھانسی دے دی۔ ظالموں نے ہمیں لاشیں بھی نہیں دیکھنے دیں۔''

فضل داد بولتا جا رہا تھا اور شرفو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دماغ کی رگیں پھٹ رہی ہوں۔ اس کے منہ کا ذائقہ اچانک کڑوا ہو گیا تھا، حلق سوکھنے لگا تھا اور ایک مرتبہ پھر وہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اسی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا جس سے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیرو کی موت کی خبر سننے کے بعد ہوا تھا...... ایک باپ ہی تو تھا اس کا اس بھری پری دنیا میں اور اب وہ بھی نہ رہا تھا۔

اس نے اپنا سر اٹھا کر اچانک جب نور ولی کی طرف دیکھا تو نور ولی کو اس کی آنکھوں میں آگ کا دریا امڈتا نظر آ رہا تھا۔

''میں ان کتوں کو مار ڈالوں گا'' وہ دیوانگی کے سے عالم میں باہر کو لپکا۔

بجلی کی سی پھرتی سے فرزند نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی فضل داد اور نورولی بھی اس کی مدد کو آگے بڑھے۔ زہراں ایک کونے میں سمٹ کر پھٹی پھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھتی رہی۔

''چھوڑ دو مجھے چاچا...... مجھے چھوڑ دو۔ میں ان کو...... میں ان کو مار ڈالوں گا۔ انہوں نے شیرو کو بھی مار ڈالا۔ میرے باپ کو بھی مار ڈالا۔''

شرفو پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ تینوں کے بس سے نکلتا جا رہا تھا۔ تینوں نے اپنی گرفت اس پر ڈھیلی نہ پڑنے دی۔

آہستہ آہستہ اس کی آواز بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہونے لگی، بالآخر اس پر غشی طاری ہو گئی۔

نورولی نے اسے اپنے بازوؤں کے سہارے زمین پر لٹا دیا۔ زہراں تڑپ کر آگے بڑھی۔

''شرفو!'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ دوبارہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

نورولی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پرے ہٹ جانے کو کہا۔ ''بیٹی! اگر ہم میں سے کوئی بھی رویا تو یہ پاگل ہو جائے گا۔ اسے حوصلہ دو ...... حوصلہ دو اسے۔'' اس نے اپنی قمیص کی آستین سے داڑھی پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ یہی عمل نورولی کی تقلید میں باقی دونوں نے بھی دہرایا۔

''پانی لاؤ۔'' اس نے زہراں کو اشارہ کیا جس نے کمال ضبط سے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹا تھا۔

دس منٹ بعد جب شرفو کو ہوش آیا تو سب سے پہلے اس کی نظر زہراں پر پڑی جس نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ شرفو نے باری باری گردن گھما کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے اطراف اکڑوں بیٹھے ہمدرد چہروں پر نظر ڈالی، چند لمحے وہ دم سادھے چپ چاپ بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر اچانک کھڑا ہو گیا۔

فرزند تیزی سے باہری دروازے کی طرف لپکا۔ باقی دونوں کے ساتھ زہراں بھی اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن شرفو اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ چند ثانئے ٹکٹکی باندھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نورولی کو گھورتا رہا۔

چاچا'' ایک کربناک آواز اس کے گلے سے بلند ہوئی اور وہ ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح نورولی کے بازوؤں میں گر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ فضل داد اور فرزند نے اپنے منہ دوسری طرف موڑ لیے اور زہراں پھر سسکنے لگی۔

............☆☆☆............

تین دن تک نورولی نے انہیں مسلسل اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ یہ تین دن پونچھ کے مسلمانوں کے لیے قیامت سے ہرگز کم نہ تھے۔ مسلمانوں کا قتل عام روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ نورولی کو شرفو اور زہراں کے متعلقین کی قربانیوں کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ ان دونوں کو محفوظ مستقبل کی ضمانت دے لیکن کس طرح؟ یہی سوال اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ تیسرے دن مسلسل سوچ بچار اور برادری کے ان سرکردہ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد جو ابھی پونچھ میں تھے، نورولی ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

اور اس روز وہ اسی ارادے سے شرفو کے پاس آیا تھا کہ اسے بادل نخواستہ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کرے اور پونچھ سے ہجرت پر بھی تیار کرے۔ شرفو اسے ''پناہ گاہ'' کے باہر ہی مل گیا۔ وہ اپنی رائفل کھول کر اسے صاف کر رہا تھا جب نورولی اس کے سر پر جا پہنچا۔

''سلام چاچا۔'' اس نے نورولی کو دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''جیتے رہو۔'' نورولی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔ اس دوران شرفو نے رائفل دوبارہ بند کر لی تھی۔

''میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں بیٹا۔ گو کہ ایسی باتیں خاص مواقع پر ہی کی جاتی ہیں، لیکن حالات جس نہج پر جا رہے ہیں وہاں میں کسی بات کو ادھوری چھوڑنے یا کل پر ٹالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''کہو چاچا تم کوئی غیر تو نہیں ہو۔'' شرفو نے خلا میں کسی کھوئی ہوئی شے کو ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

نورولی نے پہلے تو اسے اس کی ذمہ داریوں اور مستقبل کے خدشات کا احساس دلایا، پھر زہراں کی موجودہ پوزیشن سے آگاہ کرنے کے بعد بالآخر ہمت کر کے کہا۔ ''میں برادری کے لوگوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں کا نکاح کر کے تمہیں پونچھ سے باہر آزاد علاقے کی طرف بھیج دیا جائے...... زہراں فی الحال میرے گھر رہے گی اور تم اپنے چچا کے ساتھ، جیسے ہی حالات صحیح ہوں گے، تم دونوں اپنی ازدواجی زندگی شروع کر دینا۔''

اپنی بات مکمل کر کے اس نے امید بھری نظریں شرفو کے چہرے پر ڈالیں، جس نے سر جھکائے بڑے تحمل سے اس کی ساری گفتگو سنی تھی۔

''میں آپ کے ہمدردانہ جذبات کی قدر کرتا ہوں چاچا، لیکن اول تو کسی معاملے میں میری رضامندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جس عظیم مقصد کے لیے میرے ماں، باپ اور بھائی نے اپنی جانیں قربان کیں، میں اس مقصد کے حصول تک میدان کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی بالآخر مرنا ہے چاچا، لیکن میں قیامت کے روز ان کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔''

''دیکھو بیٹے۔'' نورولی نے اس کے جواب سے قدرے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں خدانخواستہ میدان جہاد سے بھاگنے کی ترغیب نہیں دوں گا، یہ بات ہماری غیرت کے خلاف ہے، لیکن بعض ذمے داریاں اتنی اہم ہوتی ہیں کہ دوسرے کئی اہم معاملات کو ان پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں صرف تمہارے لیے میدان بدل رہا ہوں۔ تم یہاں سے جا کر آزاد کشمیر کی باقاعدہ فوج کے ساتھ لڑائی میں شامل ہو جانا، پھر تمہیں اپنی تعلیم کا بھی خیال کرنا چاہیے۔ حوالدار مرحوم کی شدید خواہش تھی کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے فوج میں چلے جاؤ، پھر تم خود ہی بتاؤ آخر زہراں کو ہم اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں! شرفو یہ مت بھولو وہ تمہارے مرحوم دوست کی منگیتر ہے جو یہاں سے رخصت ہوتے وقت اس کی ذمے داری تمہیں سونپ گیا تھا......''

کافی دیر کی بحث کے بعد بالآخر نورولی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی، لیکن شرفو نے اس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔ ''چاچا! مجھے اس بات کی ضمانت بھی چاہیے کہ زہراں نے بغیر کسی دباؤ کے اس فیصلے کو قبول کیا ہے، ورنہ یہ بات یاد رکھنا کہ تم دو زندگیوں میں جو پہلے ہی نیم مردہ ہیں، زہر گھول دو گے۔''

''تم مطمئن رہو شرفو۔ مجھے خدا کے سامنے بھی اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔'' اور وہ واپس آ گیا۔

............☆☆☆............

زہراں نے نورولی کی بیوی کی ساری بات بڑی توجہ سے سنی تھی۔

......صدمات نے اسے نڈھال ضرور کر دیا تھا، لیکن اب وہ زیادہ حقیقت پسند بھی ہو گئی تھی۔ حالات اس کے سامنے تھے اور مستقبل کے خدشات کا دیو اپنے مہیب جبڑے کھولے بڑی تیزی سے اسے نگلنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زہراں جانتی تھی کہ اس کی حیثیت خزاں کے اس پتے جیسی ہے جو ڈالی سے الگ ہو کر گر پڑا ہو۔ اسے زندگی کے طویل صحرا کو پاٹنے کے لیے ایک مضبوط سہارا درکار تھا ورنہ ہوا کا کوئی بھی تیز جھونکا اسے اپنے سنگ اڑا کر کہیں بھی لے جائے گا۔

شرفو اس کے مرحوم منگیتر کا جگری یار تھا اور دونوں میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ شیرو نے روانگی کے وقت اسے زہراں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر اس پر مکمل اعتماد کا اظہار ہی نہیں کیا تھا بلکہ اسے ہر معاملے میں اپنا دست راست بھی جانا تھا، پھر شرفو بھی تو اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ اسے بھی تو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ شیرو اور اس کے گھر والوں کی غیر موجودگی میں خصوصاً اس کے باپ اور شیرو کی ماں کی شہادت کے بعد اس نے جس طرح زہراں کی ذمے داری اٹھائی تھی اور اس کے دکھ درد بانٹتے تھے، وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔

مستقبل کے تحفظ کا احساس ہی اس کے لیے نعمت خداوندی تھا۔ اس نے جواب میں "چاچی جی" کہہ کر گردن جھکا لی اور چاچی اس کا مدعا جان گئی۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹی۔" وہ اٹھ گئی۔

اسی رات ایک سادہ سی تقریب میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ برادری کے قریباً سب ہی لوگوں نے نورولی کے اس فیصلے کو سراہا تھا اور دونوں کی کامیاب زندگی کے لیے دعا کی تھی۔ نورولی نے زہراں کو ساری برادری کے سامنے اپنی بیٹی بنانے کا اعلان کیا تھا اور بتایا تھا کہ حالات سدھرنے پر خود زہراں کو اپنے ہاتھوں رخصت کرے گا۔

دوسرے روز ایک قافلہ پونچھ سے پاکستان کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔ اس قافلے کی حفاظت کے لیے مٹھی بھر جوان مرد بھی اپنی رائفلیں لیے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ قریباً ہر سدھن عورت کے پاس اپنی حفاظت کے لیے چاقو یا کلہاڑی موجود تھی۔ شہر سے باہر جانے والے "محفوظ راستے" تک نورولی اور اس کے جانباز بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ یہاں رہ جانے والے تقریباً سب ہی جوان مردوں نے اپنے اہل خانہ کو رخصت کر دیا تھا۔

یہ رخصت ہونے والے بدقسمت یہی گمان کرتے تھے کہ کچھ عرصے بعد ہی جب ان کے مسلمان پاکستانی بھائی مقامی مجاہدین کی مدد کو آ جائیں گے اور ان کے اجداد کی قربانیوں کا مول چکاتے ہوئے پونچھ کو دشمن کے خونی پنجے سے نکال کر ان کے حوالے کر دیں گے، تب وہ سب یہاں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گے اور آزاد فضاؤں میں قیام کریں گے۔

کتنے بدقسمت لوگ تھے وہ......!

............☆☆☆............

بنوٹ سے سری نگر تک کا سفر شیرو کے لیے پل صراط کا سفر بن گیا تھا۔

......موسموں اور مسافتوں کا عذاب جھیلتا وہ آسیہ کے ہمراہ تقریباً بیس روز بعد سری نگر پہنچا۔ وہ دن کو چھپے رہتے، رات کو سفر کرتے، پھلوں اور پانی کے سہارے زندہ رہے تھے۔

آسیہ کو اس سفر میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ شیرو کی ذات میں اسے اپنا ''تحفظ'' نظر آ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ شخص جو بات کہتا ہے وہ ضرور کر گزرے گا اور جیتے جی اسے اس کے بھائیوں تک ضرور پہنچا دے گا۔ شیرو کی شکل میں اس نے اپنا مستقبل بھی دیکھ لیا تھا۔

اس دوران دونوں نے جی بھر کے ایک دوسرے سے باتیں کی تھیں۔ اپنے گھر کی، اپنے باغوں کی، کشمیر، مجاہدین کی، پونچھ اور سری نگر کی باتیں، کئی مرتبہ آسیہ کا جی چاہا کہ وہ کھل کر شیرو سے اظہارِ محبت کر دے۔ وہ ایسی ہی دلیر لڑکی تھی۔ اس نے امیرانہ اور آزادانہ سیاسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس ماحول نے اس میں سے بلاوجہ کی جھجک گو کہ نکال دی تھی، لیکن وہ شیرو سے کبھی اس موضوع پر بات نہ کر سکی۔

شیرو نے بھی اس سے زمانے بھر کی باتیں کی تھیں، لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی اس سے زہراں کے متعلق کوئی بات نہ کر سکا۔ اصل میں وہ زہراں کی یادوں میں کبھی کسی کی شرکت گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے زہراں کی یادوں کو صرف اپنا سرمایہ حیات بنا رکھا تھا۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ وہ کم از کم آسیہ کو یہی بتا دے کہ وہاں زہراں نام کی ایک لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے جسے وہ کبھی بھلا نہ سکا۔ کبھی خود سے الگ نہ کر سکا۔ میدان کارزار میں جب کبھی اسے فرصت کے چند لمحات میسر آئے، زہراں چھم سے اس کے نہاں خانہ دل سے باہر نکل آئی، لیکن وہ آسیہ سے کبھی اس مسئلے پر بات ہی نہ کر سکا۔ ہر دفعہ اس کا روایتی حجاب آڑے آیا۔

آسیہ کے بھائیوں نے اس کو پوجا کی حد تک تعظیم دی تھی۔ انہوں نے شیرو کی منت کی کہ وہ ان سے احساس تشکر کے طور پر کچھ قبول کر لے، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ لوگ اسے روکنے اور اس کی مہمانداری پر بضد تھے، لیکن شیرو کو تو اڑ کر پونچھ پہنچنے کی پڑی تھی۔

''میں آپ کی واپسی کی منتظر رہوں گی۔'' بالآخر آسیہ نے اس سے کہہ ہی دیا اور شیرو نے جب اس بات کی گہرائی کو ناپا تو تھرا کر رہ گیا۔

''میں جس منزل کا مسافر ہوں آسیہ، اس پر جانے والے کم ہی لوٹ کر آیا کرتے ہیں۔'' بمشکل اس نے کہا اور آسیہ کا جواب سنے بغیر ہی ''خدا حافظ'' کہہ کر باہر آ گیا۔

آسیہ کا بڑا بھائی اس کے ساتھ بڑی دور تک آیا تھا۔ ''شیرو بھائی! اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ اگر کبھی مہلت ملے تو ضرور آنا۔'' اس نے دم رخصت اس سے کہا تھا۔

شیرو اس سے الگ ہو کر سید ھانبی خان سے آ کر ملا تھا جس تک حالات کی سب خبریں اس کی آمد سے پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ دونوں رات گئے تک بیکری کی اسی دکان کے نیچے بنے تہہ خانے میں بیٹھے رہے۔ شیرو نے اسے بنوٹ کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی تھی۔ پونچھ کے عام حالات کی خبر تو نبی خان کو تھی، لیکن وہ بھی اس سے بے خبر تھا کہ شیرو کے گھر والوں پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔

''تم فوراً پونچھ پہنچو، وہاں ہمارے تمام شاہین جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ اپنے گھر والوں کو آزاد علاقے کی طرف روانہ کر کے لوٹ

آنا۔ اب ہمیں سری نگر کو مرکز بنانا ہے۔'' نبی خان نے اسے رخصت کر دیا۔

رات کے دوسرے پہر دو سائے ایک مکان سے برآمد ہوئے۔ یہ شیر و اور نبی خان تھے۔ نبی خان اسے سری نگر کے باہر تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ ایک محفوظ مقام پر وہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔

''فی امان اللہ!'' شیرو نے اس سے بغلگیر ہو کر الگ ہوتے ہوئے کہا۔

''فی امان اللہ!'' نبی خان بولا۔

وہ کافی دیر تک وہاں کھڑا شیرو کو اندھیرے کی چادر میں غائب ہوتے دیکھتا رہا، پھر لوٹ آیا۔

انجانی منزل کا مسافر

سورج اس کے عقب کی پہاڑیوں میں ڈوب رہا تھا جب وہ پونچھ کے گردونواح میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا چہرے اس طرح چادر میں لپیٹ رکھا تھا کہ بادی النظر میں کوئی اس پر شک بھی نہ کرے اور وہ دیکھنے والی نظروں سے پوشیدہ بھی نہ رہے۔

......شہر کے گرداگرد بچھی بارودی سرنگوں سے بچنے کے لیے اس نے بڑا لمبا لیکن محفوظ راستہ اپنایا تھا۔ اس نے شہر کے باہر ہی سورج کے غروب ہونے کا نظارہ کیا تھا۔

وہ ایک پہاڑی ٹیلے کی اوٹ میں سامنے پونچھ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ پونچھ...... جو اس کی ہی نہیں کشمیر کے تمام حریت پسندوں کی آخری امید گاہ تھی۔ سارے کشمیر میں لڑی جانے والی جدوجہد آزادی کا دارومدار پونچھ پر ہی تھا جہاں مجاہدین نے سردھڑ کی بازی لگا دی تھی لیکن...... ہر طلوع ہونے والی صبح ان کے لیے دشمن کی نفری میں اضافے اور تازہ قلعہ بندیوں کی خبر لے کر آتی تھی۔

شیرو کی سوچوں کا محور زہراں تھی اور اس کی ماں......!

......اسے اس بات پر شرمندگی تھی کہ وہ جس مشن کے لیے گیا تھا، اسے مکمل نہیں کر سکا اور حالات نے اسے راستے ہی سے لوٹ جانے پر مجبور کر دیا، لیکن اس کا ضمیر بہر حال مطمئن تھا کہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس سلسلے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی...... وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کے گناہگار نہیں ہوئے تھے، پھر بھی نہ جانے کیوں ایک بے نام سی خلش اسے ستا رہی تھی۔

اس کے بعد اس کی ماں اور زہراں پر کیا گزری تھی؟ اس کی خبر اسے بھی نہ ہو سکی۔ اسے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہوں گے۔ اس نے صرف شرفو کو اعتماد میں لیا تھا اور اب وہ شرفو ہی کے ایک ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ اپنوں کے ہاتھوں پونچھ میں ان کی بازی پٹ گئی ہے اور دشمن کے قدم روز بروز مضبوط ہو رہے ہیں۔ یہ بات شیرو کے لیے اگرچہ چونکا دینے والی تھی، لیکن فی الوقت اس خبر پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایمان لانا پڑا اور اب وہ پونچھ کے باہر ایک پہاڑی پر بیٹھا اپنی آنکھوں سے بدلے ہوئے حالات دیکھ رہا تھا۔

''کیا گزری ہوگی میرے گھر والوں پر؟'' یہی سوچ اسے گھلائے جا رہی تھی۔

اور اس کی سوچوں کا تانا بانا فائر کے زوردار دھماکے کی آواز سے ٹوٹا۔ ہوم گارڈز کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ کم از کم اس قابل ضرور ہو گیا تھا کہ فائر کی شدت کا صحیح اندازہ کر سکے...... سیٹی کی آواز اور اس کے بعد کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکے نے انکشاف کر دیا کہ یہ میڈیم گن کا فائر ہے۔ یہ انکشاف ہی اس کے لیے کسی زوردار دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ''کتنی جلدی اور اچانک یہ تبدیلی آ گئی تھی۔''

وہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار بڑے نپے تلے قدموں سے نیچے اتر آیا کیونکہ اس زوردار فائر کے بعد ہلکے اسلحے کی مسلسل فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔

......ایسی آنکھ مچولی وہاں اکثر ساری ساری رات جاری رہا کرتی تھی۔ فریقین اپنے اپنے کیمپ میں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہتے تھے۔ مجاہدین کے پاس ہلکا اسلحہ تھا اور وہ لوگ چھپ کر اکا دکا بھارتی فوجی پٹرول پر گھات لگایا کرتے تھے جب کہ ذرا سا شک گزرنے پر بھارتی فوج ان کے ٹھکانوں پر اندھا دھند گولہ باری کرنے لگتی تھی اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا تھا۔

شیرو کو اب یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اپنے ٹھکانے وہیں رکھے ہوں گے یا بدل لیے ہیں۔

......اس کا رخ پونچھ کے اس گھنے جنگل کی طرف تھا جہاں اس کی دانست میں ابھی تک اس کے ساتھیوں کو ضرور موجود ہونا چاہیے تھا۔ نبی خان نے اسے بتایا تھا کہ حسین خان اپنے دستے کے ساتھ جموں کی طرف نکل گیا تھا اور بٹوٹ میں اس سے الگ ہو جانے والے اس کے ساتھی مظلوم عورتوں کے ساتھ بہ حفاظت سری نگر پہنچ گئے تھے۔ انہی کی زبانی نبی خان کو بٹوٹ والے حادثے کی اطلاع ملی تھی...... گھیرے میں آجانے والے ہوم گارڈز میں سے صرف شیرو ہی اسے مل سکا تھا۔

جنگل میں داخل ہوتے وقت شیرو سوچ رہا تھا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اسے جنگل میں دور دور تک کسی ڈوگرہ سپاہی کو پھٹکنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور آج وہ ڈر ڈر کر اور بڑا محتاط ہو کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا رہا تھا۔ اس جنگل کا کونہ کونہ اگرچہ اس کا دیکھا بھالا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اسے اس وقت یہ سب کچھ غیر مانوس سا نظر آ رہا تھا۔

پہاڑی سلسلے میں بظاہر وہ بڑا محتاط ہو کر چل رہا تھا، لیکن ایک دوسرا شخص اس سے زیادہ ہوش مند نکلا جو اچانک ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''ہالٹ'' ایک پھنکار اس کے پہلو میں گونجی۔

شیرو نے مڑ کر دیکھنا چاہا، لیکن اس رائفل کی ٹھنڈی نال نے جو اس کی گردن سے آ لگی تھی، اسے واپس مڑنے پر مجبور کر دیا۔

''زیادہ چالاکی نہ دکھانا۔ ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔ کون ہو تم؟''

''شیرو۔'' اس کے منہ سے بہ مشکل اپنا نام نکلا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب سے بوکھلائے ہوئے اور حیرت زدہ لہجے میں ''شیرو؟'' کی تکرار سنائی دی۔

وہ غیر ارادی طور پر آواز کی طرف گھوما۔ اس کے سامنے فرزند کھڑا تھا...... اس کا ساتھی جو بٹوٹ سے اس کے ساتھ ہی بھاگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیرو کا ہاتھ اپنے منہ کی طرف اٹھا اور اس نے اپنے چہرے پر لپیٹے کپڑے کو گرا دیا۔

''فرزند! تم...... تم زندہ ہو؟ اوہ میرے خدایا!'' شیرو کو تو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن وہ فرزند کے دل و دماغ پر ٹوٹنے والی قیامت سے بے خبر رہا۔

''شیرو!'' فرزند نے بمشکل اپنے بند گلے کو کھولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا اور بے تابانہ اس سے لپٹ گیا۔ ''میرے خدایا مجھ سے

انجانے میں کیا ظلم ہو گیا؟'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا بات ہے فرزند؟ کیا ہوا؟'' شیرو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ادھر آ جاؤ'' فرزند نے ایک سمت اس کی راہنمائی کی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح شیرو پر ٹوٹنے والی ان قیامتوں سے اسے آگاہ کرے جن کا شکار شیرو یکے بعد دیگرے ہو چکا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کا تو سب کچھ لٹ چکا ہے...... سبھی کچھ۔ لے دے کے ایک زہراں رہ گئی تھی جو فرزند کے بہانے حالات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر قدرت نے شیرو کو روحانی عذاب کے ایک طویل سلسلے سے نکلنے کے لیے چن ہی لیا تھا تو وہ اس کھیل کا مہرہ کیوں بنا؟

وہ سوچ رہا تھا کہ خود میں اتنی ہمت کیسے لائے کہ اسے کچھ بتا سکے اور شیرو حیرت زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ دونوں قدرے محفوظ ایک گوشے میں آن کر ٹھہر گئے۔ یہاں مجاہدین کی ایک عارضی قیام گاہ شیرو کو درختوں کے جھنڈ میں بنی جھونپڑی کی شکل میں نظر آ رہی تھی جو اس وقت بالکل خالی تھی۔ بس ایک کونے میں ایک لالٹین اور مٹی کا پانی سے بھرا ہوا گھڑا رکھا تھا اور دوسرے کونے میں زمین پر گھاس پھونس سے بنی ایک چٹائی بچھی تھی۔

''بیٹھ جاؤ شیرو!''

وہ خود شیرو کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا اور اپنی تمام تر توتیں مجتمع کر کے اس نے شیرو کو ایک ایک کر کے ان تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ شیرو یہ سب کچھ سن کر دھاڑیں مار مار کر روئے گا اور بالآخر پاگل ہو جائے گا، لیکن وہ حیران رہ گیا کہ صبر وضبط کا مجسمہ اس کے سامنے پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

......آنسوؤں پر تو اس کا اختیار نہیں تھا، لیکن اس نے کمال ہمت سے اپنے اندر ہی اندر اٹھنے والی سسکیوں اور آہوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

''میں تمہارا مجرم ہوں شیرو بھائی۔'' اس نے رندھے ہوئے گلے سے شیرو کو مخاطب کیا۔

''نہیں فرزند! قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ میں ماں اور چچا کے بعد اپنی منگیتر کو بھی نہ پا سکوں۔ تم بھی سچے تھے فرزند۔ واقعی وہاں سے کسی کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ قدرت کو شاید اسی طرح زہراں کی بہتری منظور تھی، پھر شرفو کوئی غیر تو نہیں، آخر میرا دوست ہے...... میرا بھائی!'' اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے لیے اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''شیرو بخدا! تم انسان نہیں۔ دنیا کے کسی انسان میں اتنا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان پہاڑوں کے حوصلے پر حیران ہوا کرتا تھا کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر ہونے والے ایسے مظالم کو یہ صدیوں سے دیکھتے آ رہے ہیں اور ان کا سینہ شق نہیں ہوتا لیکن تم...... تم تو ان سے بھی بازی لے گئے شیرو۔'' وہ سسک پڑا۔

شیرو نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے اپنے کندھے پر رکھی چادر سے اپنے آنسو پونچھے اور جب دوبارہ منہ پھیرا تو فرزند بھی خود

پر قابو پا چکا تھا۔

دونوں کو اندر گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں جھونپڑی سے باہر آئے۔ ان کے سروں پر بوڑھا اور سرد آسمان اپنے دامن میں ٹھٹھرے ہوئے ستاروں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ درمیان راتوں کے بیمار چاند کی زرد کرنیں کپکپاتی ہوئی کشمیر کی منجمد فضاؤں سے ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔

دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ بالآخر شیرو نے ہی ہمت کر کے زبان کھولی۔ ''فرزند! وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ میرے خیال سے صبح ہونے والی ہے۔ ممکن ہے کوئی تمہاری طرف آئے اور تمہیں اپنے پہرے کی جگہ نہ دیکھ کر پریشان ہو جائے۔ یوں بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔ تم مجھ پر ایک آخری احسان کرو۔''

''کیا؟'' بے اختیار فرزند کے منہ سے نکلا۔

''دیکھو فرزند!'' شیرو نے اپنے گلے میں اٹکے غبار کو نگلتے ہوئے کمال ضبط سے کہا۔ ''تمہارے سوا اور کسی کو میری یہاں پونچھ میں آمد کی خبر نہیں۔ میں ابھی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ تم یہی سمجھنا کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں...... بس یہی جاننا کہ شیرو واقعی مر چکا ہے۔''

''شیرو......!'' فرزند نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں فرزند بھائی! اب مجھ میں زندہ رہنے والی بات بھی آخر کیا رہ گئی ہے۔ میرا اب رہا ہی کیا ہے اس دنیا میں۔ بس ایک اپنی جان ہے۔ وہ تو میں نے کبھی کی کشمیر کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اگر اب شرفو یا زہراں کو میرے زندہ ہونے کی اطلاع ملی تو ان کے دلوں پر کیا گزرے گی؟''

''شیرو خدا کے لیے مجھے کسی اور امتحان میں نہ ڈالو۔ میں تو پہلے ہی اپنے ضمیر کے ہاتھوں جانے کتنی سزا ساری عمر کے لیے بھگتتا رہوں گا۔ اوہ میرے خدایا! مجھ سے نادانستگی میں یہ کیا ظلم ہو گیا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

''فرزند!'' شیرو نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''اگر تم نے حقائق کا سامنا نہ کیا اور کسی جذباتی پن کا شکار ہو گئے تو تم ان دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دو گے۔ اگر ان کا نکاح نہ ہو گیا ہوتا تو میں اڑ کر پاکستان پہنچ جاتا لیکن اب...... اب یہ ظلم ہوگا۔ ان دونوں معصوموں نے آخر کیا گناہ کیا ہے؟ اور پھر قدرت نے اگر کسی بہانے زہراں کو خوشی کے چند لمحات دے ہی دیئے ہیں تو ہمیں کیا حق حاصل ہے اس سے یہ خوشیاں چھیننے کا اور یوں بھی فرزند...... میرے بھائی! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ بخدا مجھے اس بات کا قطعاً کوئی گلہ نہیں۔ شرفو سے بہتر خاوند زہراں کو اس روئے زمین پر شاید کوئی اور نہ مل سکے۔ وہ...... وہ اسے سب کچھ دے سکتا ہے...... سب کچھ۔''

فرزند نے سر جھکا لیا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ صبر و وفا کے اس پتلے سے آنکھیں ملا کر بات ہی کر سکے۔ اس نے بادل نخواستہ شیرو کی اس بات پر صاد کیا کہ وہ اس کی زندگی کے راز کو راز ہی رہنے دے گا۔

وہ شیرو کو چھوڑنے کے لیے پہاڑی سلسلے کے آخری کونے تک آیا۔ دونوں بڑے جذباتی انداز میں بغل گیر ہوئے اور دم رخصت گو فرزند کے آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے، لیکن شیرو نے انتہائی صبر سے خود کو نارمل رکھا۔

چاند کی دم توڑتی روشنی میں جب وہ انجانی منزل کے مسافر کو رخصت کر رہا تھا تو نجانے فرزند کو کیوں اپنی یہ ساری جدوجہد بے سود نظر آ رہی تھی۔ کوئی طاقت، کوئی نادیدہ ہستی اس کے کانوں میں بار بار سرگوشی کر رہی تھی کہ......اب وہ پونچھ کو کبھی دشمن کے پنجے سے رہائی نہیں دلا سکیں گے۔

بھاری قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دیر تک اندھیرے کی اس چادر میں کھوئے ہوئے شیرو کو ڈھونڈتی رہی تھیں جو اس کے سامنے انسانی عظمتوں کے نئے باب کھول کر اس سے رخصت ہو گیا تھا۔

............☆☆☆............

شیرو جب اس مقام تک پہنچا جہاں فرزند نے اس کی ماں کی قبر کی نشاندہی کی تھی تو اسے اچانک اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اب اس کے اندر پیدا ہونے والی جس قوت نے اسے حوصلہ دے کر مکمل مرد بنائے رکھا تھا، وہ جیسے اس کے جسم سے یک دم باہر نکل گئی۔

اور جب تک پتھروں کے اس ڈھیر تک پہنچا جسے مٹی کے اوپر کسی نے قبر کی طرح چنا ہوا تھا تو وہ ایک معصوم بچے کا مکمل روپ دھار چکا تھا۔

بے اختیار وہ پہلے قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی سمت پھیلے اور وہ قبر سے لپٹ کر بچوں ہی کی طرح سسکیاں لینے لگا۔

......ضبط کے تمام بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکے تھے۔

......روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی، پھر آہستہ آہستہ جیسے اسے صبر آ گیا۔ اس کے اندر اٹھنے والے طوفان نے آنکھوں کے راستے نکاس کی راہ ڈھونڈ کر اسے بڑے لمبے کرب سے نجات دلا دی تھی۔ وہ پھانس جو فرزند سے ملاقات کے بعد سے اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی، اب نکل چکی تھی۔ اسے اپنا وجود خاصا ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کے عقب میں سورج کی ٹھٹھرتی ہوئی کپکپاتی کرنوں نے ڈرتے ڈرتے پونچھ کے پہاڑوں اور سبزہ زاروں کو بوسے دینے شروع کر دیئے تھے۔ شاید وہ ان سربلندوں کو اس طرح نذرِ عقیدت پیش کر رہی تھیں جنہوں نے اپنا تن، من، دھن سبھی کچھ کشمیر کی آزادی کو نذر کر دیا تھا۔

شیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے، پھر دونوں ہتھیلیاں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ باری باری اس نے راہِ آزادی کے شہیدوں کے لیے فاتحہ پڑھی۔ پھر اس کی آنسوؤں سے جھلملاتی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

''خدائے ذوالجلال! ہم بے کس ہیں۔ بے سروسامان تیرے دین کی سربلندی کے لیے غنیم سے ٹکرا گئے ہیں۔ ہماری اسی طرح مدد فرما جس طرح تو نے بدر کے میدان میں کفر کے خلاف سینہ سپر ہونے والوں کی مدد کی تھی۔ الٰہی! ہمیں ہمت عطا کر کہ ہم دشمن سے اپنا حق چھین سکیں۔''

اس نے جھک کر ماں کی قبر کو بوسہ دیا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی راستے پر واپس ہو گیا۔

اب اس کی منزل سری نگر تھی......!

............☆☆☆............

20/اپریل 1948ء کو حکومت پاکستان کو پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی طرف سے ایک باضابطہ رپورٹ موصول ہوئی......اس رپورٹ میں لکھا تھا۔

"قبائلیوں کو پاکستان سے براہ راست مدد نہ ملنے کی وجہ سے بھارتی فوج نے مظفر آباد کے علاقے میں جو فتوحات حاصل کی ہیں، وہ حکومت پاکستان کے لیے اس پہلو سے بھی خطرناک ہیں کہ اس طرح طیش کھا کر وہ پاکستان کے خلاف ہی نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر حکومت پاکستان چاہتی ہے کہ وہ 25 لاکھ کشمیری مہاجرین کے سیلاب سے خود کو محفوظ رکھے، بھارتی فوج کو اپنے پہلوؤں پر سامنے اور عقب میں نہ بیٹھنے دے، فوج کا مورال نہ گرنے پائے، تخریب کار سیاسی قوتوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو تو پاکستان کے لیے لازم ہے کہ وہ بھارتی فوج کو اوڑی، پونچھ، نوشہرہ کی لائن سے آگے نہ بڑھنے دے۔

(بحوالہ: سکیورٹی کونسل ایس۔ پی۔ وی 8 فروری 50ء)"

اس رپورٹ نے سیاسی ایوانوں میں کافی ہلچل مچادی اور وہ لوگ جواب تک اس کوشش میں تھے کہ پاکستانی فوج کا براہ راست تصادم بھارتی فوج سے نہ ہونے دیں، انہیں بھی اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہونا پڑا۔

......حکومت پاکستان کی ہدایت پر کچھ فوجی دستے کشمیر کی طرف اس ہدایت سے روانہ کیے گئے تاکہ وہ آزاد کشمیر فوج کے عقب میں رہیں۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ براہ راست بھارتی فوج سے ٹکرانے کا خطرہ ناگزیر حالات ہی میں مول لیں اور صرف دفاع ہی پر اکتفا کریں۔

اپریل کے آخر ہی میں کوہاٹ چھاؤنی میں موجود جنرل طارق کو حکم ملا کہ وہ راولپنڈی پہنچے جہاں سے مئی کے وسط میں ڈویژن کمانڈر نے ان کے بریگیڈ کا کچھ حصہ جنرل ہی کی کمانڈ میں محاذ کی طرف بھیج دیا۔

بھارتی فوج کا مرکزی ہیڈ کوارٹر اب سری نگر بن چکا تھا اور ان کے ذیلی ہیڈ کوارٹروں کی پوزیشنیں دیکھ کر جنرل طارق نے اندازہ لگایا تھا کہ دشمن کا بڑا حملہ بارہ مولا اوڑی روڈ کی طرف مظفر آباد کی سمت ان کے سیکٹر پر ہوگا۔

......دشمن کے ممکنہ حملے والی جگہ اوڑی کے سامنے سڑک کے دونوں اطراف جنرل طارق نے ایک بٹالین پاک فوج، کچھ دستے فرنٹیئر فورس کے، کچھ اسکاؤٹ جن کی تعداد بمشکل ایک سو تھی اور آزاد کشمیر کے کچھ دستے لگا دیئے۔ یہ باقاعدہ بٹالین نہیں تھی بلکہ رضا کارانہ طور پر جنگ میں حصہ لینے والے بلاتنخواہ فوجیوں پر مشتمل تھی جن کے پاس ہلکا اسلحہ اور رائفلیں تھیں۔

شمال کی طرف ٹیٹوال سے آگے کرشن گنگا وادی بھی اسی سیکٹر کا حصہ شمار ہوتی تھی جسے پہاڑی سلسلے نے کاٹ کر بالکل الگ کر رکھا تھا جہاں ایک کمپنی پاکستانی باقاعدہ افواج کی رکھی گئی تھی۔ اس سے کچھ پیچھے جنرل طارق کے بریگیڈ کی تین کمپنیاں مظفر آباد، کوہالہ اور باغ میں پوزیشن لیے بیٹھی تھیں جن سے صرف مقامی دفاع مقصود تھا۔ ان کے ایڈوانس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

......بریگیڈ کی آدھی بٹالین مری میں، باقی پونچھ کے بالمقابل مورچہ بند تھی جس کی کمان جنرل کے پاس نہیں تھی اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر مری میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

جنرل طارق کی جہاندیدہ نگاہوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ اوڑی کے بالمقابل ان کی نفری دشمن کا حملہ روکنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ جنرل نے تجویز پیش کی کہ بجائے رک کر دشمن کا حملہ روکنے کے پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن پر پہلوؤں سے گھاتیں لگائی جائیں۔ اس طرح وہ

پریشان ہو کر سڑک سے ہٹ کر بکھر کر چلے گا۔ جنرل کی تجویز منظور ہو گئی اور اس کے آدمیوں نے قریباً پچاس میل لمبی سڑک کو کوہالہ سے باغ کے علاقے تک مقامی آبادی کی مدد سے آمدورفت کے قابل بنا دیا۔

18 مئی کو جنرل کو حکم ملا کہ بریگیڈ کی کمان کسی اور کے حوالے کر کے ٹیٹوال کے راستے شمالی پہاڑی علاقے کی طرف نکل جاؤ، جہاں جنرل کو پانچ ہزار قبائلیوں کے ساتھ سری نگر کی سمت آگے بڑھ کر شب خون مارنے تھے۔

......اس کارروائی کا مقصد یہی تھا کہ دشمن کی توجہ مظفر نگر سے ہٹا کر شمال کی طرف کر دی جائے۔ اس طرح اس کی نفری بٹ جائے گی اور حملے کی قوت میں بھی کمی آ جائے گی۔ قبائلیوں کو جمع کرنے میں کم از کم پندرہ دن لگتے، جس کے بعد ٹیٹوال سے آگے پہاڑیوں میں چار دن کا سفر کرنا تھا۔ یہ تجویز تو اچھی تھی لیکن دیر سے عمل میں آئی تھی۔

19 مئی کو جنرل نے رپورٹ دی کہ قبائلیوں کی آمد تک انہیں اس ''نازک محاذ'' پر رہنے دیا جائے کیونکہ دشمن کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اس رپورٹ کی روانگی کے بمشکل ایک گھنٹہ بعد بھارتی فوج نے زبردست حملہ کر دیا۔ دشمن نے اپنے حملے کا دریائے جہلم کے دونوں پہلوؤں اور شمال میں ٹیٹوال کی سمت رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل طارق کو یہ پریشان کن اطلاعات بھی ملنے لگیں کہ ہمارے ہراول دستے منظم انداز میں پسپائی اختیار کر رہے ہیں، لیکن بعض مقامات پر دشمن کو زبردست زک اٹھانی پڑی تھی۔ جہاں تک ٹیٹوال کے شمالی علاقے کا تعلق تھا، جنرل کے لیے وہاں کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ موجودہ کمپنی کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سڑک کے کناروں والے محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے جنرل نے مری میں موجود کمپنی کو اس طرف روانہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ اگر ان لوگوں کو پسپا بھی ہونا پڑا تو وہ چکوٹھی میں آ کر دفاعی پوزیشن اختیار کر لیں گے جہاں دشمن کو روکنے کا کام زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

20 مئی کی شام بٹالین کمانڈر کا پیغام ملا کہ اس کے دستے دشمن کی تباہ کن گولہ باری اور فضائیہ کے حملوں کی زد میں ہیں اور وہ لوگ مسلسل پسپا ہو رہے ہیں۔ دشمن اوڑی اور چکوٹھی کے درمیان پہنچ چکا ہے۔

یہاں آزاد کشمیر کے دستوں پر حملہ ہوا اور وہ بھاگ اٹھے۔ اب ایک وسیع و عریض علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری پاکستانی فوج کی مختصر سے جمعیت کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ جنرل نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے نکل کر محاذ پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی شام وہ اپنے دو اسٹاف افسروں کی معیت میں مظفر آباد پہنچ گیا جہاں شہریوں کے بھاگتے ہوئے قافلوں کے پیچھے پیچھے فرنٹیئر سکاؤٹس کی دو پلاٹون بھی سر پر پاؤں رکھے بھاگے چلی آ رہی تھیں۔ جنرل نے ان لوگوں کو روک لیا تھا۔ وہ محاذ پر واپس جانے سے انکاری تھے۔ پٹھانوں نے رائفلوں کی زد میں ان سے اسلحہ رکھوا لیا۔ جنرل کے حکم پر ان کے دو افسروں کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل کے ساتھیوں نے ان کی لاریوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ دونوں افسروں کو جنرل کے حکم پر حراست میں لے کر محاذ پر پہنچایا گیا۔ چکوٹھی پہنچ کر جنرل کو اطمینان ہو گیا کیونکہ یہاں موجود پاک فوج کے بٹالین کمانڈر، افسروں اور جوانوں کا مورال بہت بلند تھا اور وہ واقعی دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن چکے تھے۔

وہ کمپنی جسے جنرل نے دریا پار جانے کا حکم دیا تھا، اسی خدشے کے پیش نظر دریا کے کنارے کھڑی رہی کہ دشمن دوسری طرف آ چکا ہے۔

جنرل کے ساتھیوں نے ریکی کر کے اس خدشے کو غلط قرار دیا اور اس کی خصوصی نگرانی میں اس کمپنی کو دریا پار پہنچا کر مورچہ بند کیا گیا۔ جنرل طارق خود بھی چکوٹھی پہنچا جسے اب دفاعی قلعے میں تبدیل کرنے کا پروگرام طے پا چکا تھا......اس کا بریگیڈ انٹیلی جنس آفیسر اس دوران آزاد کشمیر کے جی ایچ کیو سے خاصی معلومات فراہم کر چکا تھا۔

............☆☆☆............

اعداد و شمار نے جنرل کو آگاہی دی کہ اس علاقے میں موجود دشمن کی نفری 12 پلٹنوں پر مشتمل ہے جن کے پاس 12 بھاری مشین گنیں، 24 توپیں، 12 ٹینک شکن توپیں اور 9 بکتر بند گاڑیاں ہیں جب کہ ان کی ایئر فورس اپنی تمام تر قوت کے ساتھ ان کے سروں پر موجود ہے۔ اس فوج کو روکنے کے لیے جنرل طارق کے پاس اس علاقے میں ساڑھے تین پلٹنیں اور صرف 4 بھاری مشین گنیں تھیں۔

ان حالات میں مختصر جمعیت کے ساتھ دشمن کے منہ لگنا جوانوں کو حرام موت مارنے کے مترادف ہوتا۔ اگر جنرل دفاعی پوزیشن بھی اختیار کرتا تو بھی غنیم اپنی طاقت کے بل پر ان کی پوزیشنوں کو جلد یا بدیر روند کر آگے نکل جاتا۔ لہٰذا اس نے اپنی جنگی حکمت عملی بدلی اور پلان یہ بنا کہ دشمن کے پہلوؤں کو پہاڑی کے اندر دور تک حملے کر کے اس طرح بکھیر دیا جائے کہ اسے اپنی قوت ایک جگہ مرکوز کرنے کے مواقع میسر نہ آئیں۔

بھارتی فوج پر پٹھانوں کی دہشت طاری تھی اور جنرل جانتا تھا کہ دشمن قبائلیوں کے حملوں سے اپنی مین فورس کو بچانے کے لیے پہلوؤں کو پھیلا دے گا۔ ابھی تک زیادہ تعداد میں قبائلی پٹھان جنرل کو میسر نہیں تھے، اس لیے اس نے پٹھانوں کا کام بھی پاکستانی فوج کے جوانوں سے ہی لیا تھا۔

جنرل نے ایک بٹالین کو دریا کے کنارے چکوٹھی پر رکھا اور دوسری کو دریا کے پار "بب ڈوری" نامی چھ ہزار فٹ بلند پہاڑی پر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی قبائلیوں اور پاک فوج کے جوانوں کے ملے جلے دستے ترتیب دے کر دشمن کے پہلوؤں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیئے۔

اس سے یہ فائدہ تو کم از کم ضرور حاصل ہوا کہ دشمن کے حملوں کی شدت دم توڑنے لگی، لیکن اس کی فائر پاور اور بے شمار نفری کا مقابلہ ممکن نہ تھا......جنرل کے دستے آہستہ آہستہ چکوٹھی اور بب ڈوری کی طرف پیچھے ہٹنے لگے۔

مئی کے آخر تک دشمن انہیں دھکیلتا ہوا دفاعی پوزیشنوں تک لے آیا تھا اور اب وہ ان کے سامنے تازہ حملے کے لیے پر تول رہے تھے۔

اسی اثناء میں چکوٹھی کے محاذ پر چھاپہ مار پارٹیاں دشمن کو بائیں سمت کو پھیلاتی چلی گئیں اور وہ ان کے تعاقب میں بے مقصد پہاڑیوں پر مورچہ بندیاں کرتا چلا گیا۔ یہ صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے دو زوردار حملے چکوٹھی پر کیے، لیکن ہر دفعہ منہ کی کھائی اور پیچھے ہٹ گیا۔

بب ڈوری پر جنرل نے اپنے دستوں کو کچھ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ دشمن نے اس طرف سے کھلا حملہ کرنے کی جرأت ہی نہ کی۔

کافی عرصے تک ان کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔

......اس دوران جنرل کے برق رفتار دستے دشمن پر قہر بن کر ٹوٹتے رہے۔ انہوں نے اسے مختلف پہلوؤں سے اس قدر نقصان پہنچایا کہ دشمن کا مرکز کمزور ہوتے ہوتے بالآخر بکھر کر رہ گیا اور وہ ایڈوانس کرنے کے بجائے رک کر اپنی نفری کو ایک مرکز پر سمیٹنے لگا۔

شمالی محاذ پر دشمن نے ٹیٹوال سیکٹر میں چار پلٹنوں کے ایک بریگیڈ سے پیش قدمی کی۔ اس علاقے کی کمان بریگیڈ افتخار احمد کو سونپی گئی تھی جو کافی عرصے تک صرف ایک رائفل بردار کمپنی کے ساتھ دشمن کے لیے باعث عذاب بنے رہے۔

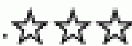
اس دوران جنرل طارق کے بریگیڈ کو مزید ایک پلٹن اور 2 فیلڈ گنوں کی کمک پہنچ گئی۔ جون کے آخر تک دشمن اپنے قریباً بارہ سو جوان ہلاک اور زخمی کروا کر اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو چکا تھا۔

وی۔ پی مینن اپنی کتاب Integration of Indian State میں لکھتا ہے:

"آٹھ صدیوں سے محمود غزنوی کے دور سے ہندوستان شمال مغرب کی سمت سے مسلسل حملوں کی زد میں رہا ہے۔ اکیلے محمود غزنوی نے 17 حملے کیے۔ اب مملکت پاکستان نے وجود میں آنے کے محض دس ہفتے بعد ہم پر شمال مغرب سے قبائلی حملہ کروا دیا تھا۔ جب میں نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کی سفارش کی تو میرے پیش نظر یہی خدشہ تھا کہ تاریخ کہیں خود کو دہرانے نہ لگے اور یہ طوفان ایک مرتبہ پھر سری نگر کو روندتا ہوا بھارت میں داخل ہو جائے۔ آج سری نگر تو کل دہلی کی باری بھی آ سکتی ہے۔ جو قوم اپنی تاریخ اور جغرافیہ بھول جائے، تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔"

مینن نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ بنیاد تھے اس جنگی حکمت عملی کے جو بھارتی فوج نے کشمیر میں اپنائی۔ وہ لوگ قبائلیوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ انہیں کشمیر ہی میں روک دینا چاہتے تھے تاکہ یہ سیلاب اپنا رخ بدل کر کہیں سارے بھارت ہی کو نہ نگل جائے۔

اوڑی محاذ سے آگے بھارتی فوج اپنی طاقت کے بل بوتے پر مزید آگے بڑھ سکتی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس سے آگے کا علاقہ قبائلیوں کی بہترین شکارگاہ تھا۔ وہ اب قبائلیوں کی بھینٹ چڑھنے پر تیار نہ تھے۔



بھارتی افواج کے زوردار حملوں کا دم خم تو ٹوٹ چکا تھا، لیکن ابھی اوڑی کا محاذ خاموش نہیں ہوا تھا۔ وہاں جنگ مسلسل ہورہی تھی۔ خصوصاً انڈین ایئر فورس کے جہازوں نے تو تباہی کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ وہ سورج کی روشنی پھیلتے ہی اپنے حملوں کا آغاز کردیتے اور شام ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایک روز جنرل طارق کو حکم ملا کہ آگے بڑھ کر پانڈو کی پہاڑی پر قبضہ کرلیں۔

''پانڈو'' نو ہزار فٹ بلند ایک پہاڑی تھی جو اپنے دامن میں بسے گاؤں کے نام کی نسبت سے جانی جاتی تھی۔ جنرل کے زیرِ قبضہ بب ڈوری کی پہاڑی کے بالکل سامنے یہ سلسلہ ہائے کوہ نظر آتا تھا جس کے دائیں جانب تین ہزار فٹ نیچے دریائے جہلم بہہ رہا تھا اور دریا کے پار نظر آنے والی سڑک پہاڑوں کے مختلف پہلوؤں کو کاٹتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس سے تھوڑا آگے آٹھ ہزار فٹ بلند ایک اور پہاڑی سلسلہ تھا۔

بب ڈوری کی بائیں طرف واقع ''تانگا نائیک'' قریباً دس ہزار فٹ بلند اور بب ڈوری کے بالکل اوپر جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سے آگے ''روسی کوتا'' ساڑھے گیارہ ہزار فٹ بلند اور اس کے سامنے دس ہزار فٹ کی اونچائی پر ''بلند سنگ'' تھا۔ اس طرح دریا کے متوازی یہ سلسلہ ہائے کوہ پھیلتا چلا گیا تھا جس کے دامن میں ''پانڈو'' واقع تھا۔

اسی پانڈو پہاڑی کی ایک ڈھلان پر غنیم کے پہاڑی توپ خانے کا ایک سیکشن دریا کے دوسرے کنارے پر مورچہ بند تھا جس نے پچھلے قریباً ایک مہینے سے چکوٹھی اور اس کے پیچھے سڑک کی پانچ میل لمبائی کو مسلسل اپنی زد میں لیا ہوا تھا انہوں نے پانچ میل علاقے کے چپے چپے کو ''مارک'' کیا ہوا تھا اور وہاں اس تواتر سے گولہ باری کررہے تھے کہ اس جانب کسی پاکستانی جوان کے لیے سر اٹھانا بھی مشکل تھا۔

چونکہ یہ سیکشن بلندی پر مورچہ زن تھا اس لیے اس کی نظروں سے رات کے اندھیرے میں بھی بچ نکلنا مشکل تھا۔ ذرا سا شک ہونے پر وہ لوگ ''روشنی راؤنڈ'' فائر کردیتے اور اس روشنی میں نقل و حرکت کرتی کسی بھی شے پر گولوں کا مینہ برسا دیتے تھے۔ اس سیکشن کو ختم کرنے کے لیے ان پر الگ حملہ کرنا بالکل ناممکن تھا، نہ ہی ان پر پہلوؤں سے حملہ ہوسکتا تھا۔ صرف ایک ہی صورت تھی کہ کسی بھی طرح پانڈو پہاڑی پر قبضہ کیا جائے جس کے بعد ہی یہ سیکشن ہمارے قابو میں آسکتا تھا۔

پانڈو پر قبضہ کرنے کے لیے ''بب ڈوری'' سے اڑہائی ہزار فٹ بلندی تک جانا پڑتا تھا جہاں سے دریا کا کنارہ شروع ہوتا تھا۔ اس علاقے میں جھاڑیاں اور درخت تو کمیاب تھے لیکن چٹانیں اور برساتی نالے بڑی اچھی اوٹ فراہم کرتے تھے۔ بب ڈوری کے سامنے والی سیدھی پہاڑی سے ذرا دور تین بلند چوٹیاں حملہ آوروں کا راستہ روکنے کے لیے سینہ تانے کھڑی تھیں جن کی بلندی چھ ہزار فٹ سے سات ہزار فٹ تک تھی اور یہ چوٹیاں درختوں سے بڑے شاندار طریقے سے قدرت نے ''کیموفلاج'' کر رکھی تھیں۔

بائیں طرف ایک چوٹی سے قریباً ڈیڑھ دو میل لمبا ایک راستہ پانڈو تک جاتا تھا، لیکن یہ راستہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا، انتہائی دشوار گزار اور ناقابل عبور تھا۔ اس راستے سے ایڈوانس کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ دشمن نے اردگرد کے تمام دروں میں توپیں نصب کی ہوئی تھیں اور اس کی محفوظ اور مضبوط مورچہ بندیاں اس راستے سے اونچائی پر اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔

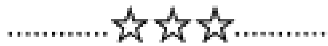
ان سارے حالات میں تمام جنگی فوائد بھارتیوں کو حاصل تھے کیونکہ ان کی ہر پوزیشن پر صرف سامنے سے اور وہ بھی ان سے انتہائی کم بلندی سے حملہ کیا جاسکتا تھا جو موت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔

یہ اس قدر مضبوط قلعہ تھا کہ ہماری فوج نے اسے خفیہ طور پر ''دہلی'' کا نام دے رکھا تھا۔ گویا پانڈو کی تسخیر دہلی کی فتح سے ہرگز کم نہ تھی جبکہ بھارتی فوج نے اپنی ان مورچہ بندیوں کو ''کراچی'' کا کوڈ نام دے رکھا تھا۔

دشمن کی نفری یہاں پاکستانی افواج کے مقابلے میں کم از کم سات گنا زیادہ تھی۔ جنرل طارق نے اندازہ کرلیا تھا کہ فتح کا دارومدار کسی ایسی چال چلنے پر ہے کہ دشمن اپنی تمام فوج کو ان کے مقابلے میں اس جگہ نہ لا سکے۔ چنانچہ کافی سوچ بچار اور ریکی کے بعد جنرل نے بالآخر ایک ایسا مقام چن ہی لیا اور وہ تھا پانڈو کا گاؤں...... یہ گاؤں ایک طرح سے اس علاقے میں مورچہ بند فوج کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔

چکوٹھی اور بب ڈوری میں جنرل نے ایسی پوزیشن میں اپنے جوانوں کو مورچہ بند کیا تھا کہ ان پر الگ الگ حملہ ہی ممکن تھا اور ایک بٹالین کے لیے کم از کم ایک بریگیڈ کو حملہ کرنا پڑتا۔ دو بریگیڈ سے کم اس علاقے میں جنرل کی اختیار کردہ پوزیشنوں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس دوران جنرل نے انتہائی ہوشیاری اور جنگی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ایسی چالیں چلیں کہ دشمن کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

اس نے پٹھانوں کی مدد سے دشمن کے پہلوؤں پر مسلسل نقب لگائے رکھی اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پوزیشنوں کو پھیلاتا چلا جائے۔ دشمن نے اپنی پھیلی ہوئی ہر پوزیشن پر کم از کم دو کمپنیاں لگادی تھیں، جن کے درمیان فاصلہ تھا اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔



پانڈو گاؤں میں دشمن کی ایک بٹالین فوج تھی۔ جس پر حملہ کرنے کے لیے جنگی اصولوں کے مطابق کم از کم تین بٹالین فوج درکار تھی جب کہ جنرل کے پاس حملہ کرنے کے لیے بہ مشکل آدھی بٹالین تھی جسے بالآخر پٹھانوں اور کشمیری مجاہدین کی مدد سے ایک بٹالین تک پہنچادیا گیا۔

......اور اس ایک بٹالین نے اپنے سامنے موجود سات ہزار فٹ بلند تہہ در تہہ پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے پانڈو تک پہنچنا تھا جب کہ ان کے راستے میں دو بھارتی کمپنیاں، جن کی مدد کے لیے توپ خانے کی بیٹریاں موجود تھیں، مورچہ بند تھیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر پاک فوج کا تصادم ان کمپنیوں سے ہو جاتا تو حملہ آور فوج کا کافی حصہ یقیناً یہیں ختم ہو جاتا اور پانڈو پر حملہ کرنے کی قوت بمشکل ایک چوتھائی ہی رہ جاتی۔

جنرل طارق کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کوئی ایسا راستہ مل جائے جس سے گزر کر وہ راستے میں کوئی جھڑپ مول لیے بغیر پانڈو تک پہنچ جائیں۔

جنرل طارق نے کچھ قبائلی سرفروشوں کو ''ریکی'' کے لیے بھیجا اور بالآخر وہ لوگ ایک ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے جس سے گزر کر وہ پانڈو گاؤں تک بحفاظت پہنچ سکتے تھے...... اس راستے سے ان لوگوں کو رات کی تاریکی میں دشمن کے مورچوں کے عین سامنے سے گزرتے ہوئے چھ ہزار فٹ بلند پہاڑی عبور کرنا تھی۔

......اس دوران وہ اتنا تھک جاتے کہ ان کے لیے کھلا حملہ کرنے سے کچھ دیر پہلے تھوڑا آرام کرنا بے حد ضروری تھا۔

یہ آپریشن 36 گھنٹوں پر محیط تھا اور ان لوگوں کو ایک رات اور اگلا سارا دن دشمن کے بالکل سامنے اور اس کے اگلے مورچوں کے عقب میں اس کی نظروں سے بہر صورت اوجھل رہنا تھا۔ ذرا سا شک گزرنے پر دشمن ان لوگوں کو با آسانی ان کے مرکز سے کاٹ کر بے بس اور محبوس پرندوں کی طرح گھیر کر مار سکتا تھا۔

ان تمام خطرات کے باوجود جنرل نے اپنی سی کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا...... دو ہزار قلیوں کی مدد سے جنرل اپنا توپ خانہ ٹارگٹ کے بالکل سامنے لے آیا۔ ان لوگوں نے دریا کے آر پار لوہے کا مضبوط رسہ باندھ لیا جس کی مدد سے بیک وقت دو آدمی اور تین سو پاؤنڈ وزن لایا اور لے جایا جا سکتا تھا۔

پٹھانوں کے تین لشکر جن میں سے ہر ایک کی نفری سو پر مشتمل تھی، ترتیب دیے گئے۔ ان میں سے دو کے ذمے دشمن پر مسلسل حملے کرنا اور تیسرے کے ذمے بھاگتے دشمن کا تعاقب کرنا تھا۔

17 جولائی 1948ء کو غازیان صف شکن اپنے سروں پر کفن باندھے غنیم پر یلغار کر رہے تھے۔

......اگلے روز عبداللہ کے سپاہی ندی عبور کر کے دشمن کے علاقے میں دور اندر تک گھس گئے۔ آسمان نے ان کی عظمتوں کو مرحبا کہا اور ان کی مدد کے لیے گھنگھور گھٹائیں برسنے لگیں جس سے ان کی آواز دشمن تک نہ پہنچ سکی۔ یہ بٹالین ایڈوانس کرتی ہوئی راستے میں بڑی کامیابی سے ٹیلی فون کے تار بچھاتی چلی جا رہی تھی۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ان کا کماندار ان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ رات گئے بٹالین کوئی جھڑپ مول لیے بغیر دشمن کے اگلے مورچوں کے عقب میں ایک میل اندر ایڈوانس کر گئی۔ صبح ہونے لگی تھی۔ وہ لوگ منصوبے کے مطابق روپوش ہو گئے اور اب انہیں اگلی رات کا منتظر ہونا تھا۔

.........☆☆☆.........

دشمن کا خیال اپنی طرف مرکوز رکھنے کے لیے قبائلی پٹھان اور کشمیری مجاہدین اس کے پہلوؤں سے چھٹے مسلسل کاری ضربیں لگا رہے تھے جبکہ جنرل نے اپنا توپ خانہ بالکل خاموش رکھا ہوا تھا تاکہ دشمن کو کسی بڑے حملے کا گمان نہ گزرے۔

اگلی رات پھر حملہ آور فوج کا مطمئن سفر جاری رہا، سوائے ایک واقعے کے...... وہ یہ کہ ان کا ایک کشمیری مجاہد جو گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا، دشمن کی گشتی پارٹی کے ہتھے چڑھ گیا۔

دشمن اس جوان مرد کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔ اس پر انہوں نے جہاں بھر کے ستم توڑے کہ کسی طرح وہ یہاں موجود کسی "غیر معمولی" کارروائی کا اقرار کر لے، لیکن آفرین ہے اس مرد غازی پر کہ دشمن اس کے لب نہ کھلوا سکا۔ الا یہ کہ وہ مرتبہ شہادت سے سرفراز ہو گیا۔

یہ رات بھی بخیر و عافیت گزر گئی۔

حملہ آور بٹالین یہاں سے دو کالموں میں بٹ گئی۔ ان دونوں کالموں کو اب مزید پانچ ہزار فٹ بلند ایک پہاڑی سلسلہ عبور کرنا تھا...... یہ

پہاڑیاں نوکیلی تھیں جن کی چٹانیں عمودی اور راستہ ناہموار تھا۔ بارش نے جگہ جگہ پھسلن پیدا کردی تھی اور جہاں اب پاؤں بمشکل زمین پر جمتا تھا۔

بہر حال اگلے روز جنرل کو خوش خبری ملی کہ دائیں کالم نے پانڈو میں نو ہزار تین سو فٹ بلند ایک چوٹی پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ چوٹی پانڈو کے بالکل سر پر کھڑی تھی۔ دشمن کو جب خبر ہوئی تو اس نے عجلت میں حملہ کیا، لیکن اب میدان اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس اثناء میں دوسرا کالم پانڈو سے قریباً پانچ سو گز دور پہنچ چکا تھا۔ اس کالم کو خلاف توقع بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اچانک دشمن کی ایک پارٹی کی زد میں آگیا، جو پیچھے جا رہی تھی۔

......تازہ دم دشمن نے اس تھکی ہاری فوج پر جس کا رابطہ بھی ہیڈ کوارٹر سے کٹ چکا تھا، اچانک حملہ کر دیا۔ اگرچہ کنٹرول اور کمانڈ ختم ہو چکی تھی، لیکن ان سربلندوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا......ان کی کافی نفری شہید اور زخمی ہو چکی تھی۔ ان حالات میں بھی انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور اسکیم کے مطابق پانڈو پر حملہ کر دیا۔

لیکن......اب دیر ہو چکی تھی۔ دشمن کا توپ خانہ نئی پوزیشن لے چکا تھا۔ یہ جیالے جی جان سے لڑے، اکثر جان سے گزر گئے اور بچے کھچے زخمی وخستہ حالت میں کسی نہ کسی طرح پسپائی اختیار کر کے اگلے روز صبح ہونے تک بب ڈوری واپس پہنچ گئے۔

......ان کی واپسی سے چھاپہ ماروں نے یہ سمجھا کہ آپریشن مکمل ہو گیا ہے لہٰذا وہ بھی واپس اپنے مرکز کی طرف آ گئے۔

............☆☆☆............

صورت حال انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر چکی تھی۔ جنرل کی نصف بٹالین اس سے کٹ کر دشمن کے علاقے میں نو ہزار تین سو فٹ کی بلند چوٹی پر پھنسی ہوئی تھی جس پر دشمن کا توپ خانہ اور اس کی فضائیہ اندھا دھند گولہ باری کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو کمک پہنچانے کے راستے مسدود تھے کیونکہ جنرل طارق اور ان کے درمیان دشمن مورچہ بند تھا، لیکن آفرین ہے ان جیالوں پر، کیا مجال کہ ان کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو۔

ان کی جواں ہمتی نے جنرل طارق کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تمام فوجی احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ان کی مدد کو نکلے۔ ان تک پہنچنے کے لیے کم از کم 24 گھنٹے درکار تھے، لیکن اسی رات جنرل نے اپنے تمام ریز رو دستوں کو اس آگ میں جھونکنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔

"رات آٹھ بجے کے بعد ایڈوانس شروع کرو اور اپنے گھیرے میں آئے ہوئے ساتھیوں سے جا ملو۔ میں کل صبح پانڈو پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کرنے والا ہوں۔ آخری گولی......آخری جوان۔" اس نے اپنی فوجی زندگی کا انتہائی خطرناک فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی جنرل نے تینوں قبائلی لشکروں کو دوبارہ دشمن کے پیٹ میں گھس کر اندر سے پھاڑ دینے کے احکامات کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس مرتبہ یہ تینوں لشکر انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔

ان کے تابڑ توڑ حملوں نے دشمن کا مورال تباہ کر دیا۔ وہ خدا کا قہر بن کر دشمن پر ٹوٹے۔ پہاڑی علاقے میں لڑائی کے ماہران سے زیادہ روئے زمین پر اور کون تھے؟ انہوں نے جہاں دشمن کا کوئی سیکشن دیکھا، اس پر اتنی پھرتی اور برق رفتاری کے ساتھ گھات لگائی کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

وہ آندھی کی طرح حملہ آور ہوتے اور بگولے کی طرح بھاگ جاتے۔ انہوں نے دشمن کی تین کمپنیوں کا صفایا کر دیا۔ مار دھاڑ کرتے یہ جیالے پانڈو گاؤں تک پہنچ گئے اور وہاں موجود بھارتی بٹالین پر اچانک حملہ آور ہوئے۔ رات تک انہوں نے دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔

......اس دوران مددگار فوج چوٹی پر قابض کالم سے جا ملی۔ یہ لڑائی کا پانچواں روز تھا۔ دشمن نے قبائلیوں کے شب خون کو ہی بڑا حملہ جان لیا اور انہیں پسپا کر کے قدرے مطمئن ہو گیا جبکہ قبائلی وہاں سے بھاگے نہیں، انہوں نے صرف ''شکار گاہ'' بدل لی تھی۔ وہ اب ٹکڑیوں میں بٹ کر دشمن کے پہلو چاٹنے لگے تھے۔

''دہلی (پانڈو) پر سنگینوں سے حملہ کر دو۔''

جنرل طارق کا نعرہ مستانہ گونجا اور ''اللہ اکبر'' کے فلک شگاف نعرے بلند کرتے غازیان صف شکن دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

دشمن ابھی تک صورت حال کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس پر ''بڑا حملہ'' آ گیا۔ اب تک جنرل نے اسے اس بری طرح الجھائے رکھا تھا کہ دشمن کچھ کرنے کی پوزیشن ہی اختیار نہ کر سکا تھا۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ فی الوقت اپنی نفری کو سمیٹے اور مورچوں میں دبکا رہے۔ اس دوران رات ہو گئی۔ نو ہزار فٹ کی بلندی پر رات کو خاصی سردی تھی۔ جوانوں نے سردی کی شدت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جگہ جگہ الاؤ روشن کر لیے کیونکہ وہ پانڈو کی بلندیوں پر ہر طرف پھیل گئے تھے۔ اس لیے بادی النظر میں یہی دکھائی دے رہا تھا کہ پانڈو ہر طرف سے گھیرے میں آ چکا ہے۔ دشمن گھبرا گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ پاکستان کی تازہ دم فوج یہاں موجود جوانوں کی مدد کو آ گئی ہے۔ صبح ہونے تک ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ رات بھر قبائلی چھاپہ مار الگ ان کی جان کو آئے رہے۔ انہوں نے ساری رات دشمن کو تگنی کا ناچ نچائے رکھا۔

علی الصبح پاکستانی فوج کے حملے سے پہلے ہی دشمن کے بھاری توپ خانے نے آگ اگلنا شروع کر دی، لیکن یہ داؤ بظاہر انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے کھیلا تھا۔ ان کی فوج اس بھاری بمباری کی آڑ میں دم دبا کر بھاگ اٹھی۔

جب جنرل طارق کے جیالے پانڈو پہنچے تو وہاں ایک بھی بھارتی فوجی موجود نہیں تھا۔ وہ لوگ قریبی جنگل کو محفوظ پناہ گاہ سمجھ کر اس طرف نکل گئے تھے، لیکن ان بوکھلائی ہوئی بھیڑوں پر قبائلی پٹھان چیتوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ انہوں نے جنگل کو جانے والے راستوں کو پہلے ہی گھیر لیا تھا۔ جنگل بھگوڑوں کی شکارگاہ بن گیا جہاں ان کی کئی کمپنیاں قبائلیوں کے خنجروں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

............☆☆☆............

قافلہ راستے کی صعوبتیں برداشت کرتا کسی نہ کسی طرح آزاد کشمیر تک آن پہنچا تھا۔

پونچھ سے مظفر آباد تک کا سفر بڑا جان لیوا تھا۔ لوگ زخموں، موسم کے عذابوں اور بیماریوں کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ شرفو کے ہمراہیوں میں بیشتر تعداد میں وہ مجروح مجاہد تھے جو پونچھ کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔ ان کے لیے مرہم پٹی یا فرسٹ ایڈ کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ اول تو مجاہدین میں کوئی ڈاکٹر ہی نہیں تھا اور اگر کوئی میڈیکل کی شدبد رکھنے والا میسر بھی تھا تو اسے دوائیں دستیاب نہیں تھیں۔ بڑے بڑے اور گہرے زخموں کے لیے بھی دیسی علاج تجویز کیے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے اکثر کے زخم بگڑنے لگے، بالآخر ان زخموں نے ان کی جان لے لی۔

اس کی نظر جب ان معصوم بچوں پر پڑتی جن کے باپ اس جہاد میں شہید ہو چکے تھے اور جواب ننگے پاؤں، رسیوں سے بنی ہوئی جوتیاں پہنے یا اپنے پیروں پر چیتھڑے باندھے سردی سے کپکپاتے ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آرہے تھے تو شدت غم سے اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا۔

اس نے ان بدقسمت بیواؤں کو بھی دیکھا جو بمشکل چند ہفتوں یا پھر چند مہینوں کے لیے سہاگنیں بنیں، جنہوں نے ابھی ازدواجی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا کہ بیوہ ہو گئیں۔ وہ شریف زادیاں بھی اس کے ہمراہ تھیں جن کی ایک جھلک بھی کبھی کسی کو نظر نہ آئی تھی، لیکن جو آج ننگے سر کھلے بالوں اور پھٹے گریبانوں کے ساتھ بین کرتی ہوئی ان کے ہمراہ چلی آرہی تھیں۔

اس کی نظریں ان بدبخت کشمیر کی بیٹیوں پر بھی تھی جو پناہ کی تلاش میں آئی تھیں، لیکن انسانوں کے بھیس میں موجود بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ کر بازاروں کی زینت بن چکی تھیں۔

بڑے دلخراش نظارے کیے تھے اس نے۔

بڑے جگر پاش منظر دیکھے تھے اس کی آنکھوں نے۔

ان واقعات کا اس پر ایک ہی اثر ہوا کہ اس کا غم اب انفرادی سے اجتماعی ہو گیا۔ وہ سارے راستے اس آگ میں جلتا آیا تھا کہ اس دشمن سے کیسے ان تمام زیادتیوں کا انتقام لے جوان کی بربادی کا باعث بنا تھا۔ اس کے سینے میں الاؤ دہک رہا تھا اور شرفو جانتا تھا کہ اس دہکتے الاؤ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے تو دشمن کا بہتا ہوا خون...... صرف اس کا خون، ورنہ تو یہ آگ کسی روز اسے بھسم کر ڈالے گی۔

زہراں کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ وہ تمام راستے شیرو، اپنے باپ اور رشتے داروں کی موت کا ماتم کرتی آئی تھی...... کبھی کبھی قدرت کی ستم ظریفی پر حیران بھی رہ جاتی کہ آج وہ شرفو کی بیوی بن کر جا رہی ہے۔ اس نے قافلے میں شامل ہونے سے پہلے تک اپنے آپ کو کشمیر کی سب سے مظلوم لڑکی جانتا تھا کہ جس کا پورا کنبہ آزادی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا، لیکن جب اس کے ہمراہ آنے والی عورتوں کی کہانیاں اس کے علم میں آئیں تو اسے اپنے دکھ ان کے سامنے بالکل ہیچ نظر آنے لگے۔ وہ اس لحاظ سے ان مظلومین میں شاید خوش قسمت ترین لڑکی تھی کہ اپنے ساتھ وہ شرفو کی شکل میں مضبوط سہارا لے کر جا رہی تھی...... شاید قدرت کو اس کے بزرگوں کی قربانیوں پر رحم آ گیا تھا کہ اس نے شرفو کی شکل میں زہراں کو قدرے محفوظ مستقبل کی ضمانت بہم پہنچا دی تھی جبکہ اس کی ہمراہیوں کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کا کل کیا ہے؟

وہ سب بے چاریاں تو ایک دیوانگی کی سی کیفیت میں غم کے ہاتھوں بے حال، بے بس پتھر کے انسانوں کی طرح قدم بقدم گرتی پڑتی، ڈگمگاتی چلی جا رہی تھیں۔ انہیں اپنی منزل کا، اپنے راستے کا احساس تھا نہ علم، کون جانے ان الم نصیبوں میں سے کتنی ایسی تھیں جنہیں گھر دیکھنا بھی نصیب ہوا یا وہ صرف انسانی ہوس کی بھینٹ چڑھ کر بازار کا بکاؤ مال ہی بن کر رہ گئیں۔

☆☆☆

آزاد کشمیر افواج کے جی ایچ کیو میں شرفو کو کئی آشنا چہرے، مانوس نگاہیں نظر آئیں لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب وہ مجاہدوں کے نہیں، سیاستدانوں کے نرغے میں گھر چکا ہے۔ وہ لوگ پونچھ میں تھے تو اپنی جانوں سے گزر جانے کو سعادت جانتے تھے، لیکن یہاں آئے تو سیاست کی

بھینٹ چڑھ گئے۔ان کی کمانڈ مجاہدوں سے چھن کر انگلی کو لہو لگا کر سورما کہلانے والوں کے ہاتھ میں آ گئی......خون دینے والے گوشہ عزلت میں جا گرے اور دودھ پینے والے مجنوں اقتدار کی دیوی کے قدموں سے لپٹ گئے...... یہاں سب اپنی اپنی لڑائی لڑ رہے تھے۔

راشن کی لڑائی......!

مکانوں کی لڑائی......!

زمینوں اور باغات کی لڑائی......!

عہدوں اور اقتدار کی لڑائی......!

وہ خارش زدہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنے کے لیے جھپٹ رہے تھے۔اقتدار کے غلیظ نشے نے انہیں اندھا کر دیا تھا...... ان کی آنکھوں پر ہوس کی ایسی پٹی بندھی تھی کہ ساون کے اندھے کی طرح انہیں ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دینے لگا تھا۔وہ ندیدے بچوں کی طرح چھینا جھپٹی کرنے لگے اور دشمن کی مراد بر آنے لگی۔

اس کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے کم عمری میں ہی آزاد کشمیر فوج نے اس کے خاندان کی قربانیوں کے پیش نظر حوالدار کا عہدہ دے دیا اور بھرتی ہوتے ہی اسے محاذ کی طرف جانے کے احکامات مل گئے۔

......اسے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے، اپنے ہاتھوں سے، اپنی قوم کے لٹنے کا منظر تو نہیں دیکھے گا۔

محاذ پر روانہ ہونے سے پہلے وہ زہراں کے پاس آیا......زہراں اور وہ دونوں نور ولی کے گھر والوں کے ساتھ ہی قیام پذیر تھے۔مکان میں داخل ہوتے ہی پہلا کمرہ اشرف کا تھا جب کہ آخری کمرے میں زہراں رہتی تھی۔وہ دن میں ایک دو مرتبہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آتے اور بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود کچھ نہ کہہ پاتے۔بس ایک دو روایتی سے جملوں کا ان کے درمیان تبادلہ ہوتا اور اچانک ہی زہراں کو کوئی کام یاد آ جاتا اور وہ ''اچھا جی چلتی ہوں'' کہہ کر اشرف خان کو سوچوں کے منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی۔

آج جب زہراں اس کے لیے ناشتہ لے کر آئی تو شرفو کے ذہن کی الجھنیں اس کے چہرے پر بھی نمایاں ہونے لگیں۔زہراں اس کی بیوی تھی جس کا سارا کنبہ حال ہی میں کٹ چکا تھا۔لے دے کے بس وہی تو اس کا سہارا رہ گیا تھا اور اب وہی اس سے محاذ پر جانے کو کہنے والا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے اس عمل کو کس بات سے تشبیہ دے؟ بظاہر تو شرفو کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ زہراں کو اپنے محاذ پر روانگی کی اطلاع دے کر اس کے ساتھ ہی نہیں، اپنے ساتھ بھی زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے، لیکن وہ اسے بے خبر بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

''زہراں'' اس نے برتن رکھ کر لوٹتی زہراں کو مخاطب کیا۔جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی یا پھر زہراں کی چھٹی حس تھی جس نے اسے پہلے ہی سے اگلی اطلاع دے دی تھی کہ وہ ٹھرا کر رہ گئی۔

''جی'' اس نے جیسے تھوک نگل کر ایک لمحے کے لیے شرفو کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا زہراں کہ میں تمہیں کیا کہوں؟ کل ساری رات میں اس الجھن کا شکار رہا کہ صبح میں اس خبر کے ساتھ تمہارا سامنا کیسے کرسکوں گا کہ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔''

''کیا؟'' زہراں اچانک گھبرا گئی، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل چکی تھی۔

''ہاں زہراں۔ وہ عظیم مقصد جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد صدیوں سے قربانیاں دیتے آ رہے ہیں، جس کے لیے ہماری جان سے بڑھ کر پیاروں نے جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں، اس مقصد سے اگر میں پیچھے ہٹ گیا یا کسی ذمے داری یا بزدلی نے مجھے محاذ پر جانے سے منع رکھا تو روز قیامت ہم اللہ کے حضور تو جواب دہ ہوں گے ہی، اپنوں سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکیں گے۔ مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے زہراں کہ اگر اپنے مقصد کے راستے میں مجھے موت آ جائے تو اس کا غم نہ کرنا، اس لیے کہ میری جان شیرو کی جان سے قیمتی ہرگز نہیں۔ پھر ہم دونوں نے اکٹھے جینے مرنے کے پیمان بھی تو کئی مرتبہ باندھے تھے۔'' وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس نے آخری فقرہ بول کر کوئی غلطی کی ہو۔ زہراں آخر ایک عورت تھی، ایک کمزور سی لڑکی جو اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اسے تو چاہیے تھا کہ وہ زہراں کو حوصلہ دیتا، اس کی ڈھارس بندھاتا۔ شاید اسی ارادے کو ذہن میں لیے اس نے بالکل ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

......اس کا یہ فعل قطعاً غیر ارادی تھا لیکن زہراں کے رگ و پے میں ایک برقی رو سی دوڑنے لگی تھی۔ شرفو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اسے قدرے بلند کر لیا۔

''مجھے معلوم ہے زہراں۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔ ''کہ تمہیں یہ سب کچھ کہہ کر میں بہت دکھ دے رہا ہوں، لیکن ہم سب کے دکھ مشترک ہیں۔ ہمارا دکھ کشمیر کے دکھ سے بڑا نہیں۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے دل میں کوئی ملال نہ لانا۔'' اس سے آگے وہ ہزار کوشش کے باوجود ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

زہراں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جب ایک مرتبہ چشمے کے کنارے اور پھر اس کی پناہ گاہ پر شیرو نے اسی طرح اس سے باتیں کی تھیں، پھر وہ چلا گیا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ کر...... کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کیا شرفو بھی......؟ اس نے سوچا اور وہ اس تصور ہی سے لرز کر رہ گئی۔

''نہیں...... نہیں۔'' بے ساختہ اس کے ہونٹ وا ہو گئے۔ ''آپ......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کا گلا رندھ گیا اور وہ سسکیاں لیتی بے اختیار شرفو کے سینے سے لگ گئی۔

''کشمیر کی بیٹیاں بہت حوصلے والی ہوتی ہیں زہراں۔'' شرفو نے اس کی کمر سہلاتے ہوئے اسے مخاطب کیا اور زہراں کو یوں لگا جیسے وہ اچانک کسی گہرے خواب سے بیدار ہو گئی ہے۔ اس نے الگ ہٹتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

''مجھے معاف کر دیجیے۔ میں جذباتی ہو گئی تھی۔ یقین کیجیے اگر اجداد کے راستے پر چلتے ہوئے آپ نے آزادی کے لیے اپنی جان کا

نذرانہ دے دیا تو میں آپ کی موت پر فخر کروں گی اور ساری زندگی آپ کی یاد میں گزار دوں گی۔ خدا نہ کرے کبھی دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہوئے میں آپ کی کوئی کمزوری بن جاؤں۔''

اس کے لہجے کی اچانک تبدیلی نے شرفو کو حیران کر دیا تھا۔ ''مجھے تم پر فخر ہے زہراں...... مجھے تم پر ہمیشہ ناز رہے گا۔''

''فی امان اللہ!'' زہراں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور واپس جانے لگی۔

''خدا حافظ......!'' شرفو بڑبڑایا۔ اس کی نظریں زہراں کے چلے جانے کے کافی دیر بعد تک بھی دروازے پر جمی رہیں۔

............☆☆☆............

شرفو ایک سیکشن کے ساتھ مینڈھر کی وادی میں مورچہ بند تھا۔ پچھلے دس پندرہ دنوں سے وہ لوگ مسلسل حالت جنگ میں تھے۔ ہر روز وہ اپنی پوزیشنوں سے نکلتے اور دشمن پر گھات لگا کر لوٹ آتے۔ انہیں چوبیس گھنٹے میں بمشکل چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا تھا۔ ان پندرہ دنوں میں اس کے بے شمار ساتھی زخمی ہوئے اور کئی ایک نے اس کے ہاتھوں میں دم دیا۔

......اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ وہ کوئی لاش دشمن کے علاقے میں نہ رہنے دے۔

اسے گھر سے نکلے تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران زہراں کی خیریت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ وہ رضا کار تھے جو مظفر آباد سے بھرتی ہو کر اس طرف آتے رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی نورولی کے گھر والوں کا یا اس کا واقف نکل آتا، جس سے وہ نورولی کے گھر والوں کی خیریت معلوم کر لیتا۔

اس کے سیکشن کے جوانوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ انہیں کبھی آگے جانے اور کبھی پیچھے آنے کے احکامات ملتے رہتے تھے۔ اس نے تین مہینوں میں آزاد کشمیر کے جی ایچ کیو سے اپنی بہادری کا لوہا منوالیا تھا اور اس کی کمان میں نکلنے والی پٹرول اور چھاپہ مار پارٹیاں جب لوٹ کر آتیں تو ہر کسی کی زبان پر شرفو کی بہادری کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی تھی۔

اس کی اپنی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح وہ حملہ کر کے پونچھ میں موجود مجاہدین کی مدد کو پہنچ جائے۔ وہ ان فضاؤں میں دوبارہ سانس لینا چاہتا تھا جو اس کے اندر رچی بسی تھیں۔ رہ رہ کر اس کے جی میں ایک ہی آرزو مچلتی تھی کہ وہ ان گلیوں میں، ان پہاڑوں پر، ان باغات میں جی بھر کے بھاگے اور بھاگتا چلا جائے جہاں اس کا بچپن بکھرا ہوا تھا، جہاں اس کے شیرو کی یادیں پھیلی ہوئی تھیں اور جہاں اب دشمن اپنے خونی پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔

مظفر آباد پر موسم گرما کے حملے سے مایوس ہو کر بھارتی افواج نے بھی اپنی جنگی حکمت عملی بدل لی، اب ان کی ساری توجہ پونچھ کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

......جموں سے مغرب کی طرف جو کچی سڑک پاکستانی سرحد کے متوازی بمشکل چند میل کے فاصلے سے گزرتی تھی، وہاں سے بھارتی فوج کا ایک بریگیڈ ایڈوانس کرتا ہوا نوشہرہ کی طرف بڑھا تھا۔ مجاہدین اپنی نفری اور ناکافی اسلحے کے ہاتھوں مجبور ہو کر پسپا ہو گئے اور یہ بریگیڈ نوشہرہ پہنچ کر

ریاستی فوج سے ''ملاپ'' کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچ کر بھارتی فوج نے میرپور پر جو منگلا ہیڈ ورکس کے نزدیک واقع ہے، قابض ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مقام سے جہلم نہر نکلتی ہے۔ اس کے اس حملے کو کشمیریوں، پٹھانوں اور پاکستانی رضا کاروں کے ملے جلے دستوں نے ناکام بنا دیا تھا۔ یہاں تاریخ حریت کا کبھی نہ بھولنے والا معرکہ لڑا گیا اور مجاہدین نے بھارتی فوج کو میرپور کے گرد و نواح میں رک جانے پر مجبور کر دیا۔

عین اس وقت شمال مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع کوٹلی کے علاقے سے مجاہدین اٹھے اور انہوں نے کوٹلی پر قبضہ کر لیا۔

............☆☆☆............

ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اگست 1947ء سے اب تک مجاہدین نے پونچھ میں ریاستی فوج کے گیریژن کو دبائے رکھا تھا، لیکن ارد گرد کے علاقے سے پسپا ہونے والی فوج اور غیر مسلم باشندے پونچھ شہر میں آ جانے کی وجہ سے وہ ابھی تک پونچھ شہر پر قابض نہیں ہو سکے تھے...... اب بھارتی فوج کے آ جانے کے بعد بھی مجاہدین نے اپنے محاصرے کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنا گھیرا دشمن کے گرد اگرد روز بروز تنگ کر رہے تھے۔

مئی 1948ء میں اوڑی محاذ سے دشمن نے زوردار حملہ پونچھ کا محاصرہ توڑنے ہی کے لیے کیا تھا لیکن یہاں منہ کی کھائی اور دشمن کے ہاتھوں سے پانڈو جیسا اہم اور مرکزی حیثیت کا حامل علاقہ بھی نکل گیا۔ اس فتح سے جنرل طارق نے فائدہ اٹھایا اور اوڑی پونچھ روڈ کو مکمل بند کر دیا۔ اس طرح پونچھ سارے کشمیر سے کٹ کر رہ گیا۔

13/ اگست 1948ء کو جب اقوام متحدہ نے کشمیر میں جنگ بندی کی تجویز پیش کی تو بھارت کے انکار کی وجہ صرف یہی تھی کہ ان حالات میں فائر بندی ہونے سے پونچھ کے ہزاروں غیر مسلم شہری اور فوجی پاکستانی اور کشمیری مجاہدین کے پاس یرغمالی بن جاتے اور اسی یرغمال کے بل پر ہم بھارت کو رائے شماری کیلئے مجبور کر سکتے تھے۔ اس تلخ حقیقت کا احساس بھارت سرکار کو بھی تھا، اسی لیے اس نے اپنی تمام صلاحیتیں پونچھ کے محاصرے کو توڑنے پر صرف کر دیں۔

وادی مینڈھر کی ایک حفاظتی چوکی میں موجود حوالدار اشرف خان تک روز بروز بھارتی فوج کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں۔

24/ اگست کو دشمن کی طرف سے نوشہرہ سیکٹر میں تازہ مورچہ بندیوں کی خبر ملی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے نوشہرہ کے چاروں اطراف پھیلی مجاہدین کی پوزیشنوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ قریباً ایک ماہ مجاہدین اور دشمن کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔ اس ایک ماہ میں کئی جگہ دشمن کا اور کئی جگہ مجاہدین کا پلہ بھاری پڑا۔

25 ستمبر 1948ء کو دشمن نے نوشہرہ سے راجوڑی کو کمک پہنچانی شروع کر دی۔ یہاں 9/ اکتوبر تک بڑی خون ریز جھڑپیں ہوئیں۔

10/ اکتوبر کو راجوڑی کے شمال مشرق میں بھارتیوں نے زبردست حملہ کیا۔ حملہ آوروں کی تعداد خاصی تھی، لیکن مجاہدین نے انہیں پسپا کر کے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تین چار روز شدید لڑائی جاری رہی۔ ہر روز دشمن نئی تیاریوں کے ساتھ حملہ آور ہوتا اور منہ کی کھا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ ان کی فضائیہ نے بڑھ چڑھ کر زمینی فوج کو مدد دی۔

19 راکتوبر کو دشمن نے پورے بریگیڈ کے ساتھ راجوڑی پر حملہ کیا۔ اس روز نوشہرہ کے شمال مغرب میں پٹھانوں اور کشمیری مجاہدین نے دشمن کی کمک پر گھات لگائی اور اسے زبردست نقصان پہنچا کر پیچھے ہٹ آئے۔

26 راکتوبر کو پونچھ میں موجود گیریژن نے محاصرہ توڑنے کے لیے زبردست دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

2 نومبر تک دشمن کئی سیکٹروں میں اپنے بکتر بند ڈویژنوں کی مدد سے ایڈوانس کر چکا تھا۔

4 نومبر کو راجوڑی چنگاس روڈ مجاہدین نے بند کر دی اور اس پر اس طرح رکاوٹیں کھڑی کر دیں کہ دشمن کے لیے ایڈوانس کرنا مشکل ہو گیا۔

5 نومبر کو دشمن اپنے ٹینک بھی میدان کارزار میں لے آیا۔ 12 سے 15 نومبر تک اس کے پینک رسالوں نے بڑھ چڑھ کر حملے کیے، لیکن اپنے کمترین وسائل کے ساتھ بھی پاکستانی فوج، کشمیری اور پٹھان مجاہدین نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور غنیم کو حتی الوسع آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔

18 نومبر کو جموں میں دو تازہ دم بریگیڈ اور ایک توپ خانہ رجمنٹ آ گئی جس کے بعد دشمن کے بڑے حملے کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ محصور فوج نے چلاس کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، لیکن محاصرہ قائم رہا۔

...........☆☆☆...........

19 نومبر کی رات کو شرفو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے حملے کا منتظر تھا۔

......ان لوگوں کو اطلاعات مل چکی تھیں کہ ریاستی پونچھ کے علاقے میں دشمن کے تین ڈویژن سرگرم عمل ہیں اور اس ساری فوج کی مرکزی کمان نوشہرہ میں رکھی گئی تھی۔ انہیں رات کو تیار رہنے کا حکم ملا تھا کیونکہ دشمن راجوڑی سے کوٹلی اور مینڈھر پر ایک زبردست حملہ کرنے والا تھا۔ مجاہدین نے راتوں رات دشمن کے علاقے میں "ریکی" کر کے اس کی بے پناہ جمع شدہ قوت کی نشاندہی کر دی تھی۔

اگلے ہی روز آزاد کشمیر کے فرسٹ بریگیڈ پر جس کے پاس رائفلیں یا چند مشین گنیں تھیں، دشمن نے زبردست حملہ کیا اور اسے دھکیلتا ہوا دریائے پونچھ کے کنارے مدار پور تک پہنچ گیا لیکن فرسٹ بریگیڈ کے غضب ناک جوابی حملے نے اسے دوبارہ شہر میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس دوران پونچھ سیکٹر کے کمانڈر بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) اعظم خان اپنے ہیڈ کوارٹر کو دشمن کے ارادوں سے خبردار کرتے رہے، لیکن ان کی شنوائی اقتدار کے ایوانوں میں نہ ہوئی۔

20 نومبر کو حوالدار اشرف خان نے جو اگلے مورچوں میں دوربین لیے بیٹھا تھا، دشمن کی زبردست نقل و حرکت نوٹ کی۔ اس نے دائیں طرف گھوم کر حالات کا جائزہ لینا چاہا کہ اچانک زوردار دھماکے کی آواز نے اسے غیر ارادی طور پر جھک جانے کے لیے مجبور کر دیا۔

اس سے محض چند گز دور دشمن کی میڈیم گن کا گولہ آن گرا تھا۔ اگر وہ غیر ارادی فعل کے تابع جھک نہ جاتا تو اس کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ پتھروں کے کچھ ٹکڑے اڑ کر اس کے چہرے پر لگے۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ خون میں بھیگ گیا۔ اس کے باقی ساتھی بھی زخمی تھے۔

اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور دوبارہ آنکھوں سے دوربین لگالی۔

دشمن نے اچانک بڑی تیز گولہ باری شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آسمان پر اس کے طیارے چنگھاڑتے ہوئے نمودار ہوئے......

انہیں کھل کر اپنا کام کرنے کا موقع دینے کے لیے دشمن نے گولہ باری روک دی۔

بے بس مجاہدین دشمن کے طیاروں کو آگ برساتے دیکھتے رہے۔ان کے پاس کوئی طیارہ شکن گن بھی نہیں تھی۔

شرفو نے جھک کر ٹیلی فون اٹھایا کہ پیچھے کمانڈ کو دشمن کی نقل وحرکت سے مطلع کرے،لیکن ٹیلی فون کے تار کٹ چکے تھے۔اس کے سامنے والے مورچے میں موجود وائرلیس آپریٹر شہید ہو چکا تھا اور اس بات کے امکانات بہت کم رہ گئے تھے کہ اس کا سیٹ سلامت رہ گیا ہو۔مورچے سے سر باہر نکالنا خودکشی کے مترادف تھا،لیکن وہ یہاں بیٹھ کر تماشا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود وہ رینگتا ہوا مورچے سے نکلا اور قیامت کی گولہ باری میں اس مورچے تک جا پہنچا۔

اس نے مورچے میں اتر کر وائرلیس سیٹ پر گرے شہید کو سیدھا کیا۔شاید وہ شہادت سے پہلے اپنا آخری فرض ادا کرنا چاہتا تھا،لیکن موت نے مرحوم کو مہلت ہی نہیں دی تھی۔شرفو نے جھک کر سیٹ کا جائزہ لیا اور اسے شدید دھچکا لگا کہ سیٹ بھی ناکارہ ہو چکا تھا۔

وہ پلٹا......دشمن کے طیارے اپنا کام مکمل کر کے جا چکے تھے اور ایک مرتبہ پھر توپ خانہ حرکت میں آ گیا تھا۔اس پر دیوانگی طاری تھی۔وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو وہیں ڈٹے رہنے اور دشمن کی انفنٹری کا انتظار کرنے کا حکم دے رہا تھا اور خود گھسٹتا ہوا پیچھے جا رہا تھا کہ کمانڈر کو صحیح صورت حال بتا سکے۔اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اب آنکھوں میں گرنا شروع ہو گیا تھا اور شرفو کو بار بار آستین سے اپنی آنکھیں صاف کرنا پڑتی تھیں۔

لیکن ابھی اس نے بمشکل پہاڑی کا پہلا موڑ ہی کاٹا تھا جب اسے دشمن کی ایک سیکشن کے کچھ جوان بڑی چالاکی سے چھپ چھپ کر گولہ باری کی آڑ میں اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دشمن کی نظر اس پر نہ پڑی ورنہ وہ بالکل اس کے نشانے پر تھا۔

دشمن کو دیکھتے ہی اس کی رگوں میں انگارے تڑپنے لگے۔

......شرفو نے بے چینی سے نظریں گھما کر حالات کا جائزہ لیا۔وہ کسی ایسی آڑ کی تلاش میں تھا جہاں سے دشمن کا یہ سیکشن اس کی زد میں آ سکے اور اپنی مطلوبہ جگہ نظر آتے ہی وہ بڑی پھرتی سے وہاں تک پہنچ گیا۔اب وہ ایک چٹان کی آڑ میں اپنے پوچ سے دستی بم نکالے ایک خاص پوائنٹ پر سیکشن کی آمد کا منتظر تھا۔

اس نے دانتوں سے پن نکال دی کیونکہ دشمن بڑے محتاط طریقے سے چلتا اس کے پھندے کی طرف بڑھ رہا تھا۔شرفو کے دل کی دھڑکن غنیم کے قدموں سے بہت تیز تھی۔ڈیڑھ دو منٹ کے جان لیوا اور اعصاب شکن انتظار کے بعد گوہر مقصود اس کے ہاتھ آ گیا۔گرنیڈ بد قسمت سیکشن کے عین درمیان پھٹا تھا۔اس کے ساتھ ہی شرفو کی اسٹین گن کی لمبی سرخ زبان انہیں چاٹنے کو لپکی اور سیکشن پر قہر ٹوٹنے لگا۔اس کا مقابلہ تربیت یافتہ فوج سے تھا۔اسی لیے شاید ایک گولی اس کے بازو میں گھس گئی اور اس کا ہاتھ ناکارہ ہو گیا۔

شرفو گلے میں اسٹین گن لٹکائے اور اس کے سلنگ میں ہاتھ اڑسے جب کمپنی کمانڈر تک پہنچا تو اس کے لیے سامنے دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا۔سر بے تحاشا خون بہہ کر اس کی آنکھوں میں گرنے لگا تھا۔دو جوانوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

''سر!''اس نے ڈوبتی آواز میں اپنے سامنے کھڑے پاکستان آرمی کے میجر کو مخاطب کیا۔''سر! ادھر دشمن......''

میجر نے منہ پرلی طرف پھیر لیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے کانوں میں کہیں دور کسی گہرے کنوئیں سے آتی میجر کی آواز سنائی دی۔ ''بہت دیر ہوگئی میرے بیٹے۔ ہم لڑائی ہار گئے ہیں......!''

حوالدار اشرف خان دو جوانوں کے بازوؤں میں جھول گیا۔

''......اسے میری جیپ میں پیچھے ہسپتال لے جاؤ'' میجر نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

............☆☆☆............

اسی روز شام تک دشمن مینڈھر پر قبضہ کر چکا تھا۔ دو تین روز بعد ہی اس نے پونچھ کا محاصرہ توڑ ڈالا اور نوشہرہ اور پونچھ کو آپس میں ملا دیا۔ اس طرح اس لائن کے مشرق کا تمام علاقہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا۔ اگلے چار پانچ روز میں اٹھائیس ہزار سے زائد مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے جہلم پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے بھی مزید قافلے چلے آ رہے تھے۔

دشمن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی اور اس نے پونچھ کا محاصرہ توڑ دیا تھا۔ دشمن نے یہ حملہ بے خبری میں نہیں کیا تھا۔ پاکستانی جی ایچ کیو کو اس سلسلے میں وہ تمام معلومات تھیں اور مقامی محاذوں کے کمانڈر پل پل کی اطلاعات روانہ کر رہے تھے۔

...... کشمیری حریت پسند دشمن کے علاقے میں دور اندر تک جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ریکی کرتے اور اس کی منصوبہ بندیوں کی خبر پہنچا رہے تھے۔ انٹیلی جنس کا بڑا مربوط جال ابتدا ہی میں بھارتی فوج کے خلاف بچھا دیا گیا تھا اور گو یہ سب کچھ عوامی سطح پر ہو رہا تھا، لیکن جی ایچ کیو کو اس سے ہمیشہ باخبر رکھا گیا۔

مینڈھر کی تحصیل ہاتھ سے نکلی تو پاکستانی عوام نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اخبارات نے حکومت کو لتاڑنا شروع کر دیا۔ عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حکومت نے قبائلیوں، کشمیری حریت پسندوں اور پاکستان آرمی کی مختلف یونٹوں کو ملا کر پچیس ہزار کا لشکر ترتیب دیا...... اس لشکر میں پچاس توپیں بھی تھیں اور اس فورس کو آگے روانہ کر دیا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس فورس نے جموں سے پونچھ تک دشمن کی طویل رابطہ لائنوں کو درمیان سے توڑ ڈالا اور دشمن کی ایک بڑی نفری کو جو نوشہرہ میں تھی، درمیان سے کاٹ کر قریباً مفلوج کر دیا۔ ان کا نوشہرہ سے آگے قریباً ایک سو میل تک فلینک (پہلو) ہماری زد میں تھا جو قبائلی اور کشمیری حریت پسندوں کی بہترین شکارگاہ بن سکتا تھا، لیکن اس محاذ پر کچھ نہ کیا گیا۔

دسمبر کے اوائل میں پاکستانی توپ خانے سے پانچ ہزار گولے بھارتی علاقے میں پھینک کر پاکستان نے ایک مرتبہ تو دشمن کی نبضیں ساکت کر دیں۔ بھارتی بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگے کیونکہ جنگی اصولوں کے مطابق اس زبردست گولہ باری کے بعد انفنٹری کا حملہ ہونا چاہئے تھا، لیکن مقام حیرت ہے کہ یہ حملہ نہ کیا گیا اور پانچ ہزار قیمتی گولے ضائع کر دیئے گئے۔ نہ صرف یہ کہ حملہ نہیں کیا گیا بلکہ چھاپہ ماروں کو بھی روک دیا گیا۔

21 دسمبر 1948ء کی نصف شب کو ایک طویل لڑائی کا اختتام ہوا اور کشمیر کے تابوت میں پہلا کیل ٹھونک دیا گیا۔

فائر بندی اب ہونی ہی تھی کیونکہ کوئی ایسا پہاڑی علاقہ یا محفوظ مقام اس وقت تک باقی نہیں رہ گیا تھا جس کی بھارت کو سری نگر، لداخ یا

جموں کے تحفظ اور دفاع کیلئے ضرورت ہو۔

......کٹھوعہ روڈ انگریز سرکار کی مہربانیوں سے پہلے ہی ان کے قبضے میں تھی اور اب جموں سے پونچھ اور سری نگر تک انہوں نے اپنی رابطہ لائن بڑی مضبوطی سے قائم کر لی تھی۔

دوسری طرف ہمارے ہاتھ کوئی بھی تاش کا ایسا پتہ نہیں رہ گیا تھا جسے دکھا کر ہم ہاری ہوئی بازی جیت جاتے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا مضبوط محاذ نہیں تھا کہ بھارت پر دباؤ ڈال کر ہم اسے رائے شماری کیلئے مجبور کر سکتے۔

قائداعظم کی رحلت کے ساتھ ہی اصل میں مسئلہ کشمیر کو بھی موت آ گئی تھی۔ بابائے قوم نے حکم دیا تھا: ''انہیں گولیوں اور بموں کی زبان میں سمجھاؤ۔''

......وہ جب تک زندہ رہے، کشمیر کے متعلق فکر مند رہے اور جب یہ آخری چراغ بھی بجھ گیا اور ایوان اقتدار میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی تو ارباب بست وکشاد اپنی گدیوں کے متعلق فکر مند ہوئے۔ انہوں نے قائد کی وفات کے بعد جتنا عرصہ بھی جنگ جاری رکھی، انتہائی بددلی سے، بالآخر اسے کسی منطقی نتیجے پر پہنچائے بغیر ختم کر دیا۔

شرفو کو لڑائی ختم ہونے کی اطلاع ہسپتال کے ایک کمرے میں ملی تھی۔ وہ تڑپ اٹھا، لیکن وہ اکیلا ہی کیا سارا کشمیر تڑپ اور سسک رہا تھا۔ سارا پاکستان اس سانحے سے لرز اٹھا، لیکن یہ آہ وزاریاں کبھی حکمرانوں کے دل نہ پسیج سکیں۔ ان کی کراہیں اور چیخیں ایوان اقتدار کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر اپنی موت آپ ہی مر گئیں۔

شرفو روبصحت ہو کر واپس آ گیا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا، لیکن اسے زہراں کے لیے بہر حال ایک محفوظ مستقبل تلاش کرنا تھا۔ فوج میں رہتے ہوئے اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ نورولی اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ انتہائی بددلی اور مایوسی کے عالم میں واپس آ گیا۔ جس روز زہراں دلہن بن کر شرفو کے گھر آئی۔ اس کے بمشکل تین ماہ بعد ہی اسے سابقہ خدمات اور مطلوبہ تعلیمی استعداد کے پیش نظر کمیشن مل گیا۔

اب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ اشرف خان بن چکا تھا۔

☆☆☆

اقوام متحدہ میں ''کشمیر ایشو'' پر پاکستان نے اپنے موقف کو اس مدلل اور شاندار طریقے سے پیش کیا کہ بھارتی وفد کو لینے کے دینے پڑ گئے اور گوپالا سوامی آئینگر نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت جانی۔ اس نے اقوام متحدہ کو بتایا کہ اسے دہلی سے ہدایت موصول ہوئی ہے کہ وہ حکومتی صلاح مشورے کے لیے واپس آ جائیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اسٹیفورڈ کرپس کا رسوخ جو برطانوی وزیراعظم اٹیلی پر تھا، کام کر گیا، برطانیہ انتہائی منافقت کی پالیسی اپناتے ہوئے بھارت کو تحفظ فراہم کرتا رہا اور پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ برطانوی مندوب نوئیل بیکر کو مسٹر اٹیلی کے غضب کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا کیونکہ وہ اس معاملے میں پاکستان کو برحق جانتے اور رائے شماری پر زور دیتے تھے۔

اپریل 1948ء تک پاکستان کی اشک شوئی کے لیے برطانیہ اور امریکہ U.N.C.I.P (United Commission On India & Pakistan) مقرر کر دیا۔ اس کو بعد میں "کشمیر کمیشن" کا نام دیا گیا۔

پاکستانی مندوب نے اس دوران حالات کا جائزہ لینے کے بعد وزیراعظم کو اس مضمون کا Cypher تار دے دیا تھا۔

"کشمیر کا فیصلہ نیویارک میں نہیں، کشمیر میں ہوگا"

کشمیر کمیشن کے ارکان پہلی مرتبہ جنیوا سے 7 جولائی 1948ء کو کراچی آئے۔ یہ کمیشن امریکہ، کولمبیا، بلجیم، چیکوسلواکیہ اور ارجنٹائن کے نمائندوں پر مشتمل تھا، لیکن زیادہ تر کام چیکوسلواکیہ کے نمائندے ڈاکٹر کوربیل کو کرنا ہوتا تھا۔ وہ حالات اور بھارت کے رویے سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ 1949ء کے آغاز میں مستعفی ہوگئے۔ ان کے الگ ہوتے ہی کمیشن نیم مردہ ہوگیا اور بالآخر اپنی موت مر گیا۔

انہوں نے علیحدگی کے وقت پاکستانی مندوب سے کہا تھا۔

All Yours Suspicions Of Pandat Nehru Were More Than Fully Justified.

(پنڈت نہرو کے متعلق آپ کے تمام شبہات حق بجانب ہیں۔)

کشمیر کمیشن کی پہلی قرارداد کی رو سے جنگ بند ہوگئی۔ 4 جنوری 1949ء کو دوسری قرارداد پر عمل کرتے ہوئے کشمیر کمیشن موقع پر دونوں فریقین کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد کمیشن کو 13/اگست 1948ء کی قرارداد کے مطابق Truce Agreement یعنی فوجی انخلاء کے معاہدے کو ترتیب دینا تھا۔ دلی میں فریقین کے نمائندوں کو اس سلسلے میں طلب کیا گیا۔ انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے ہمراہ "منصوبہ انخلاء" بھی تیار کر کے لائیں۔

وقت مقررہ پر پاکستان نے اپنا منصوبہ پیش کر دیا، لیکن بھارتی وفد نے حسب روایت ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا کہ ان کے کمانڈر انچیف اور وزیراعظم ابھی منصوبے پر نظر ڈالنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔ قریباً دس پندرہ روز بعد انہوں نے بالآخر اس شرط کے ساتھ منصوبہ پیش کیا کہ اسے امن کمیشن تو دیکھ لے، لیکن پاکستان کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ یہ ان کی طرف سے پاکستان اور امن کمیشن کا تمسخر اڑانے کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ فتح کے نشے نے بھارت کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

فوجی انخلاء کے متعلق یہ طے پایا تھا کہ مجاہدین آزادی (جو قبائلیوں، کشمیریوں اور پاکستانی رضاکاروں پر مشتمل تھے) ریاست کی حدود سے فوراً نکل جائیں۔ اس کے بعد پاکستانی فوج ساری کی ساری ریاست سے باہر چلی جائے، جبکہ بھارتی فوج کا Bulk کثیر حصہ ریاست سے نکل جائے۔

اس Bulk کی تشریح کمیشن اور بھارت سرکار میں ٹھن گئی۔ چنانچہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ بھارتی منصوبے پر تو ہم بحث کرنے کے مجاز ہی نہیں کہ اس طرح بقول بھارت سرکار منصوبہ انخلاء انشاء ہو جائے گا۔ ذاتی غور و خوض کے بعد کمیشن کے الفاظ تھے:

The Plan Neither Quantitatively Nor Qualitatively Complies With The Terms Of The Resolution.

(کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے منصوبہ قرارداد کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔)

اس مرحلے پر کمیشن بھارت کے سرد رویے کی وجہ سے اپنے تقرر کو فضول سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

مجلس امن نے آسٹریلیا کے ایک جج سر اوون ڈکسن کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ وہ دونوں فریقین سے گفت وشنید کے بعد اس معاملے کو خوش اسلوبی سے طے کر لیں۔ مسٹر اوون نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ کوئی علیحدہ حل اس مسئلے کا تجویز کرنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے پنڈت نہرو سے پوچھا اگر کوئی ایسا منصوبہ ہو تو کیا وہ اس پر پاکستانی وزیر اعظم کی موجودگی میں مذاکرات کریں گے؟ پنڈت نے ہاں کر دی۔

جب مسٹر اوون یہی تجویز لے کر پاکستان آئے تو پاکستانی وزیر اعظم نے بخوشی رضامندی ظاہر کر دی اور وہ اپنی دانست میں ''قابل عمل منصوبہ'' تیار کرنے بیٹھ گئے۔

احتیاطاً انہوں نے پنڈت نہرو کو مطلع کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اب اپنی تجاویز تیار کرنے لگے ہیں۔ مسٹر اوون کو اپنی ٹیلی گرام کے جواب میں جو پیغام ملا، اس پر وہ سٹپٹا کر رہ گئے۔ پنڈت نہرو نے لکھا تھا:

''مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔ میرے لیے یہ بالکل نیا معاملہ ہے۔ تم دلی آؤ سوا اس پر گفت وشنید کرتے ہیں۔''

سر اوون کا واسطہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے شخص سے پڑا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پنڈت جی کی دعوت پر دلی چلے گئے۔ دلی ہوائی اڈے پر سر گرجا شنکر باجپائی سے جب انہوں نے پنڈت نہرو کے اس ناقابل فہم رویے کا ذکر کیا تو انہوں نے کمال بے حیائی سے جواب دیا:

Sir Owen! I Concieve The Prime Minister Must Have Suffered an Attack of Temporary Amnesia.

(سر اوون! میرے خیال سے وزیر اعظم پر نسیان کا عارضی لیکن شدید حملہ ہوا ہے۔)

''آپ انہیں کسی ہسپتال میں داخل کروائیں۔ ایسے ذمہ دارانہ عہدے پر ایسے بھلکو آدمی کا تقرر مناسب نہیں۔'' سر اوون نے فی البدیہہ جواب دیا۔ گرجا شنکر تلملا کر رہ گیا اور سر اوون پنڈت نہرو کے رویے کے خلاف احتجاجاً لوٹ آئے۔

اس کے بعد مجلس امن نے کینیڈا کے جنرل میکناٹن سے درخواست کی، لیکن ان کی بھی بھارت کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔

میکناٹن کے بعد ڈاکٹر فرینک گراہم کا تقرر ہوا۔ انہوں نے فوجی انخلاء کے لیے یکے بعد دیگرے چھ رپورٹیں پیش کیں۔ پاکستان نے ہر رپورٹ سے اتفاق کیا جبکہ بھارت نے ہر تجویز کا تمسخر اڑا کر اسے رد کر دیا۔

پاکستان نے یہاں تک کہا کہ اعتراض تو Bulk of Force پر ہے۔ بھارت جسے Bulk سمجھتا ہے اسے نکال لے۔ جو حصہ اس کے خیال میں کم فوج پر مشتمل ہے، اسے رہنے دے لیکن بھارت نے یہ تجویز بھی نہ مانی۔

اس دوران بھارت سرکار نے کشمیری عوام کو اپنے حق میں پھسلانے کے لیے ہر حربہ آزمالیا۔ ان کے کچھ لیڈروں کو چکر بازی سے اور کچھ کو لالچ و تحریص سے خرید لیا گیا تھا۔ بالآخر کشمیر میں ایک نام نہاد مجلس آئین ساز کھڑی کر کے کشمیر اور بھارت کے مکمل الحاق کا اعلان کروا دیا گیا۔

بھارتی نمائندے کرشنا مینن نے موشگافی کی کہ ریاست کا الحاق تو روزِ اول ہی سے غیر مشروط اور مستقل ہے۔ اس میں اب کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں، چونکہ پاکستانی افواج آزاد کشمیر سے واپس نہیں گئیں، اس لیے بھارت بری الذمہ ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حالات اب بدل چکے ہیں، لہٰذا بھارت سرکار ''استصواب رائے'' کی قطعاً پابند نہیں رہی۔

ان کی اس لن ترانی کا شافی جواب دیا گیا لیکن جب کوئی کسی کا حق غصب کرنے پر مصر ہو تو اس کا علاج تقریریں، تحریریں یا دلائل نہیں ہوا کرتے۔ ظالم صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے جو پاکستان نے ذرائع، نفری، حالات ہونے کے باوجود کسی ان دیکھے، ان جانے خوف کے تحت کبھی استعمال نہ کی اور آہستہ آہستہ مسئلہ کشمیر صرف کاغذات پر زندہ رہ گیا۔

شیخ عبداللہ جو خود کو سیاست کا چیمپئن کہا کرتا تھا اور جس کو قائداعظم نے کہا تھا کہ وہ گاندھی اور نہرو کے چکر میں نہ آئے ورنہ ایک روز اسے پچھتانا پڑے گا، بالآخر معتوب ٹھہرا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے فوراً بعد ہی نہرو نے جس کی دوستی پر شیخ عبداللہ فخر کیا کرتا تھا اور جو تمام بھارت بلکہ دنیا بھر میں شیخ عبداللہ کا سب سے بڑا حمایتی تھا، شیخ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا...... اور کشمیر میں کٹھ پتلی سرکار قائم کر کے وہاں قابض ہو گیا۔

............☆☆☆............

شیرو بڑی حیرت سے نو وارد کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

...... آنے والے نے خفیہ کوڈ کے ذریعے اپنا تعارف کروانے کے بعد اسے اطلاع دی تھی: ''ان کا ہیڈ کوارٹر گھیرے میں لینے کے لیے فوجی ٹرک تھوڑی دیر میں روانہ ہونے والے ہیں۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' شیرو دھاڑا۔

آسیہ اس کی آواز سن کر ہی گھبرا کر باہر نکلی تھی۔ ''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''کچھ نہیں۔ تم اندر چلو۔'' شیرو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔

''ادھر آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے نو وارد کو مخاطب کیا۔

پچھلے سات سال سے وہ ''صاعقہ'' کے لیے سرگرم عمل تھا۔

...... یہ سات سال اس کی زندگی کے سات سنگ میل تھے اور حالات نے اس کی زندگی کے ہر سنگ میل پر بڑے گہرے نقش چھوڑے تھے۔ پونچھ سے جب وہ سری نگر پہنچا تو پے در پے ٹوٹنے والی قیامتوں نے اسے نڈھال کر دیا...... وہ سیدھا نبی خان کے پاس آیا تھا اور اس نے بلا کم و کاست ساری داستان نبی خان کو سنا دی تھی۔ نبی خان نے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے تمام جزئیات پر بحث کرنے کے بعد اس کے فیصلے کو دانش مندانہ قرار نہیں دیا تھا۔

''شیرو اس سب کچھ کے باوجود بھی بہت سے راستے کھلے ہیں۔تم اگر چاہو تو پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر کے ہجوم میں کھو سکتے ہو اور اگر پاکستان نہیں جانا چاہتے تو بھارت کے کسی بڑے شہر کی طرف نکل سکتے ہو۔''

''یہ سب فرار کے راستے ہیں نبی خان۔'' شیرو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''کچھ بھی کہو، لیکن ایک بات سوچ لینا۔ سانپ گزرنے کے بعد لکیر پیٹنے والوں کے لیے اس دنیا میں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ شیرو! صبح کا بھولا صرف شام تک ہی گھر لوٹ سکتا ہے۔ اس کے بعد لوگ اسے بھلا دیتے ہیں۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم کل اپنے کسی فیصلے پر پشیمانی کا اظہار کرو......ہم موت کی شاہراہ کے مسافر ہیں۔ ہماری منزل بالآخر ایک باوقار موت پر ختم ہوتی ہے۔

......یہ راستہ بہر حال پھولوں کا نہیں، صرف کانٹوں کا ہے اور انسان مصیبت جھیلتا ہے تو اس جذبے سے کہ وہ کل کوئی لابھ حاصل کر سکے جب کہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔

......ہم تو سب ایک روز مر جائیں گے۔ خدا جانے ہماری زندگیوں میں کشمیر آزاد ہو گا بھی کہ نہیں، یا ہم یہ لڑائی اپنے بچوں کو منتقل کر جائیں گے اور اگر کبھی ہمارے جیتے جی ایسا ہو بھی گیا تو کون یاد رکھے گا کہ شیرو یا نبی خان کون تھے؟ ہماری کوئی پہچان نہیں۔ ہم کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں۔ ہمارا تو صرف ایک مصرف ہے کہ ہماری لاشوں پر آنے والی نسلیں اپنے اقتدار کے ایوان سجائیں......اب بھی وقت ہے شیرو! لوٹ جاؤ۔''

شیرو نے ایک لمحے کے لیے آنکھ بھر کر نبی خان کی طرف دیکھا۔ ''نبی خان! کشمیر آزاد ہو گا یا ہم مر جائیں گے۔''

اس نے فیصلہ کن جواب دیا تھا......اور پھر!

شیرو ''صاعقہ'' کا ہو کر رہ گیا۔

شیرو ڈکیت

نبی خان کو اس کی آسیہ سے ملاقات کا علم تھا۔ وہ شیرو کو بتائے بغیر ہی ایک روز وہاں چلا گیا۔ آسیہ کے بھائیوں نے شیرو کے چچا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نبی خان دل میں ایک ارادہ کر کے وہاں سے واپس آیا تھا۔ اس کے بضد ہونے پر ہی شیرو آسیہ کے بھائیوں کو ملنے گیا تھا۔ جب اس کی آمد پر آسیہ کے بھائیوں نے گرم پانی سے اس کے پاؤں دھوئے تو کشمیری روایات کے مطابق انہوں نے اسے صرف عزت ہی نہیں دی تھی بلکہ اس سے ایک خاص نسبت طے کرنے پر بھی اپنی خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

نبی خان نے جب اسے بتایا کہ آسیہ کے بھائی اسے رشتہ دینے کے لیے رضامند ہیں تو اس کا ردعمل بڑا عجیب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اطلاع پر مسرت کا اظہار کرے یا ان کی پیش کش کو ٹھکرا دے۔

''نبی خان'' اس نے جذبات سے قطعی عاری آواز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ ''میں تمہیں اپنا راہنما ہی نہیں بلکہ بزرگ بھی تسلیم کرتا ہوں اور میرے متعلق تمہارے جو جذبات ہیں، میں ان سے بھی آگاہ ہوں لیکن ہم لوگ جس راستے کے مسافر ہیں وہاں کسی کو اپنا ہمراہی بنانا اس کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی؟''

''شیرو!'' نبی خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہو تو میرا فیصلہ بغیر کسی بحث کے قبول کر لو۔ میں جو کچھ سوچوں گا تمہاری بھلائی کے لیے ہی سوچوں گا۔''

شیرو نے صرف چند لمحے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں، جہاں اس کے لیے شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''ٹھیک ہے چاچا'' اس نے گردن جھکالی۔



آسیہ پڑھی لکھی لڑکی تھی جس نے ایک خاص سیاسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی تربیت ایک مخصوص نہج پر کی جا رہی تھی۔ اپنے والدین کی موت تک وہ کانگریسی خیالات رکھتی تھی، لیکن جو سلوک اس کے گھر والوں کے ساتھ کانگریسی ذہنیت نے کیا تھا، اس نے آسیہ کو یقین دلا دیا تھا کہ گاندھی یا شیخ عبداللہ لاکھ امن کے پرچارک بنیں، ہندو مسلم اتحاد زبانی کلامی تو ممکن ہے، لیکن عملی طور پر نہیں۔ مسلمان کتنا ہی غیر متعصب ہو، ہندو کے لیے کیسے نیک جذبات رکھے، لیکن اس کی فطرت میں چھپی مسلم نفرت ہمیشہ ہندو پر غالب رہے گی۔ اس حادثے نے آسیہ کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ اسے گاندھی اور شیخ عبداللہ کے نظریات کھوکھلے، بے بنیاد اور ناقابل عمل دکھائی دینے لگے تھے۔

جس روز وہ شیرو کی دلہن بن کر آئی، بہت خوش تھی کہ زندگی میں اسے کم از کم وہ خاوند تو ملا جس کی اس نے خواہش کی تھی۔ شیرو کو نبی خان

اور آسیہ کے بھائیوں نے فروٹ کا کاروبار بھی کروا دیا تھا۔ اس کے آبائی باغ پونچھ میں موجود تھے جو اس نے موقع ملتے ہی اونے پونے داموں ایک مقامی مسلمان کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی کچھ پونجی بنالی تھی۔

پہلے پہل تو اس نے آسیہ کو اپنی ''نجی مصروفیات'' کی خبر نہ ہونے دی، لیکن بہر حال وہ اس کی بیوی تھی اور شیرو نے اس کے اندر چھپی مسلمان اور کشمیری عورت کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ اپنے اکثر غائب ہو جانے کو ''کاروباری مصروفیات'' کا بہانہ بنالیا کرتا تھا، لیکن ایک روز اسے آسیہ کو اعتماد میں لینا پڑا۔

''آسیہ نے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کی باتیں سنیں اور اس کے ردِ عمل سے تو شیرو بھونچکا رہ گیا۔ آسیہ نے اسے بتایا کہ جو بات وہ اسے آج بتا رہا ہے، اس کا علم اسے پچھلے ڈیڑھ سال سے ہے۔ اس نے شیرو کو بتایا کہ اس کی غیر معمولی حرکات پر وہ تجسس صرف اس لیے ظاہر کرتی تھی کہ مبادا کبھی شیرو شکوک و شبہات کا شکار ہو کر اپنے عظیم مشن کو سلیقے سے نبھا نہ سکے۔

''میں خود کو آج سے پہلے تو اس لیے خوش قسمت جانتی تھی کہ میں ایک مجاہد کی بیوی بن کر اس کی خدمت کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔'' آسیہ نے کہا۔ ''لیکن آج میری خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں، آپ نے مجھے اس قابل جانا کہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی اصلیت ظاہر کر دی۔''

''میں ہی نہیں، کشمیر بھی تم پر ہمیشہ فخر کرے گا آسیہ۔'' شیرو نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

شادی کے تیسرے سال اللہ نے انہیں ایک بیٹی دے دی تھی۔ عاکفہ کی آمد نے بھی شیرو کے معمولات میں کوئی فرق نہ ڈالا۔

''......صاعقہ'' کی سرگرمیاں اگرچہ سخت ترین حفاظتی انتظامات اور خفیہ پولیس کے ٹڈی دل کی وجہ سے کچھ محدود ہو کر رہ گئی تھیں، لیکن سری نگر میں ان لوگوں نے کبھی ٹک کر بیٹھنا گوارہ نہ کیا۔ آئے دن وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا کیے رکھتے تھے۔ گو کہ جنگ بندی نے نبی خان کی کمر توڑ دی تھی لیکن اس نے تو جیسے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔

شیرو دیکھ رہا تھا کہ کل کے دشمن آج کے دوست اور کل کے دوست آج کے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔ بنیا ذہنیت نے مسلمانوں کی کمزوریاں ڈھونڈ کر ان کا علاج بھی تجویز کر دیا تھا۔ کانگریسی خیالات کے حامل لیڈروں کو جائیدادوں اور عہدوں سے نوازا جا رہا تھا۔ ان کے کنگال خاندان لکھ پتی بنتے جا رہے تھے۔ پاکستان نواز عناصر کی بری طرح حوصلہ شکنی ہو رہی تھی اور شیرو کے اکثر ساتھی بددل ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تنظیم کے دو تین مرکز بھی اپنوں کی غداری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

لیکن آج کی صورت حال نے تو واقعی اسے بوکھلا دیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی جو خفیہ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں ملازم تھا، خبر لایا تھا کہ چن زیب نے جوان کا بے حد قابلِ اعتماد ساتھی تھا، لالچ میں آ کر ان کا ٹھکانہ بتا دیا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد پولیس اور فوج اس کی سرکوبی کے لیے یہاں پہنچنے والی ہے۔

............☆☆☆............

نو وارد کو ساتھ لیے وہ دوسرے کمرے میں پہنچا جہاں نبی خان اور اس کے ساتھی صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ ان پر چن زیب کی غداری کی خبر بجلی بن کر گری تھی۔

''اپنا اسلحہ سنبھالو اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

......نبی خان نے سنبھلتے ہوئے حکم دیا۔ پھر وہ شیرو سے مخاطب ہوا۔ ''شیرو! میرے بیٹے۔ آج میری آخری بات مان لو۔ آسیہ اور اپنی بچی کے ساتھ پاکستان چلے جاؤ۔ یہ غلامی کی سیاہ رات ڈھلتی دکھائی نہیں دیتی۔ میرے بچے! ہمارا مقابلہ دشمن سے نہیں، اپنوں سے ہے اور ہمارا جوابی وار بھی اپنے اوپر ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کبھی تقدیر کو ہم پر رحم آ جائے اور وہ ہمیں کم از کم اپنوں کے عتاب سے بچ نکلنے کی مہلت نصیب کر دے۔''

''چاچا!'' شیرو کا گلا رندھ گیا۔ ''چاچا کشمیر کا آخری حصار بھی ٹوٹ جائے گا۔'' وہ قریباً رو پڑا۔

''یہ خدائی فیصلہ ہے میرے بچے۔ اسے قبول کرنا ہی ہوگا۔ ہمارے اعمال نے ہمیں یہ دن دکھانے ہی تھے۔ یہ لو اسٹین گن۔'' اس نے ایک گن شیرو کی طرف بڑھائی اور دوسرے کمرے میں موجود آسیہ کو بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ ننھی عاکفہ آنے والی قیامت سے بے خبر اپنی ماں کے سینے سے چمٹی گہری نیند سو رہی تھی۔

''آسیہ میری بچی!'' نبی خان نے جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ''اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ وہ سامنے والے راستے کی طرف سے نکل کر گاؤں کے باہر والے مندر تک پہنچو۔ ہم تمہارے پیچھے آتے ہیں۔''

نبی خان نے آسیہ کو خفیہ راستے کی طرف روانہ ہونے کی ہدایت کی۔

......شیرو نے بے اختیار آگے بڑھ کر سوئی ہوئی عاکفہ کا منہ چوم لیا۔ ''اللہ کے حوالے آسیہ۔ فی امان اللہ!!'' اس میں آسیہ سے نظریں ملانے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

''خدا حافظ......!'' آسیہ کا گلا رندھ گیا۔

اس نے بچی کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس راستے پر گامزن ہو گئی جو کسی ہنگامی ضرورت کے وقت اسے اختیار کرنا تھا۔

نبی خان نے آنکھوں سے لگی دوربین سے وہ ٹرک دیکھ لیے تھے جنہوں نے گاؤں کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔

''ادھر آؤ شیرو۔ ہم دوسری طرف سے نکلیں گے۔''

......اس نے آسیہ کی مخالف سمت میں بڑھتے ہوئے شیرو سے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اپنی اپنی گنیں سنبھالے چل رہے تھے، لیکن دونوں یہ بات بھول چکے تھے کہ چن زیب نے سب سے پہلے دشمن کو فرار کے خفیہ راستے ہی سے آگاہی دی ہوگی۔

اور دونوں بمشکل چند گز آگے بڑھے تھے جب ہوائی فائرنگ نے ان کے قدم تھام لیے۔

نبی خان نے ایک آڑ میں رکتے ہوئے دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگائی تو جیسے اس کا وجود پتھر ہو گیا۔ وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ آسیہ کے فرار والے راستے کے عین سامنے سے اچانک نمودار ہونے والے فوجیوں نے اسے للکارنے یا ''ہالٹ'' کہنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔

بیک وقت تین چار گنوں کی سرخ زبانیں اس طرف لپکیں اور آسیہ کا جسم خون میں نہانے لگا تھا۔

کشمیر لہو میں غرق ہو رہا تھا۔

نبی خان نے کشمیر کی بیٹی کو لہو کا غسل لیتے ہوئے تیورا کر گرتے دیکھا۔ اس کی معصوم بچی عاکفہ کو ماں کی گود میں آواز نکالنے کی مہلت بھی شاید نصیب نہیں ہوئی تھی جب فرشتہ اجل نے اسے آلیا۔ آسیہ ڈگمگا کر پہلو کے بل گری تھی۔ اس کی گرفت اپنی بچی کے گرد اتنی سخت تھی کہ وہ آخر دم تک اس سے جدا نہ ہوئی۔

ماں بیٹی کا خون ایک دوسرے کے خون میں مل کر ایک ہو گیا تھا۔

......ننھی عاکفہ ابھی تک اپنی ماں کے پہلو سے چمٹی ہوئی تھی۔ ان کے جسموں سے بہنے والا لہو اب نبی خان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کے دانت ایک دوسرے سے اس طرح سختی سے جڑے ہوئے تھے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ حملہ آوروں نے رک کر ماں بیٹی کی موت کی تصدیق بھی نہیں کی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس پہاڑی کی طرف آ رہے تھے جہاں ''صاعقہ'' کے جانبازوں کی موجودگی نے ان کے تن بدن میں آگ لگائی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے چاچا......؟ کیا ہوا؟ مجھے دکھاؤ۔'' شیرو نے جب ٹکٹکی باندھے نبی خان کو اس سمت نظریں جمائے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔

......اس نے نبی خان کے ہاتھ کو ذرا سا جھٹکا دے کر دوربین اس کی آنکھوں سے ہٹالی تھی اور......پھر دوربین شیرو کی بے چین آنکھوں پر جم گئی۔

اور سامنے کا منظر دیکھنے کی تاب نہ رہی تھی۔

......بمشکل چند لمحے ہی دوربین اس کی آنکھوں پر رہی تھی، جب اسے اپنا وجود مٹی ہوتا محسوس ہوا۔ اسے یوں گمان گزرنے لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ قسطوں میں مر رہا ہو......دوربین اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح خود بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔

......اس کا بدن سرسام کے مریض کی طرح جھٹکوں سے کپکپا رہا تھا۔ اس کے سامنے کا منظر دھندلانے لگا تھا اور اس کی بیوی اور بچی کے مقدس اور معصوم خون کی چادر اس کی آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی......اسے اردگرد کے مناظر اور اپنے گرداگرد کھڑے ساتھی اسی لہو میں ڈوبتے، غرق ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی آنکھوں سے ٹپکتا لہو انگارے بن کر اس کے گالوں پر بہنے لگا، پھر جیسے اس کے لہو کا خمیر بدلنے لگا۔ اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے طاقتور انجکشن کے ذریعے اس کے لہو میں آگ بھر دی ہے۔ اس کے بدن میں انگارے تڑپنے لگے اور روح جو اپنے بدن سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی، آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اسے زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

''میں انتقام لوں گا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''انتقام......انتقام!''

اس نے گردن موڑی تو نبی خان کی انگارہ آنکھوں سے خارج ہوتی برقی لہریں اسے اپنے جسم میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔ بوڑھے نبی

خان کی انگلیاں اس کے بازو کے گوشت میں اترنے کے بعد ہڈی کے گرد اپنا شکنجہ تنگ کر رہی تھیں۔

''شیرو!'' نبی خان کی آواز کا قہر تھا کہ شیرو اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے صرف سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے ہی پر اکتفا کیا۔ ''تو نے ''صاعقہ'' میں شمولیت کے وقت ایک حلف دیا تھا مجھے۔'' نبی خان غرایا۔

''ہاں چاچا۔'' شیرو کو بولنے کے لیے بڑا زور صرف کرنا پڑا۔

''میرے بیٹے! تو نے کبھی میری اطاعت سے منہ نہیں موڑا اور آج بھی میرا یہ آخری حکم تجھے ماننا ہوگا۔ جس طرح بھی ممکن ہو، چن زیب کو جان سے مار ڈالنا، پھر پاکستان چلے جانا۔ میں دشمن سے تمہاری بیوی اور بچی کا انتقام لوں گا اور تم سارے کشمیر کے بے گناہوں کے خون کا انتقام لینے کے لیے تیاری کے ساتھ واپس آنا۔ شیرو! اگر تو ہمارے پیچھے آیا یا یہاں سے فوراً نہ نکل گیا تو صف توڑنے پر میں روز قیامت تیرے گریبان پر ہاتھ ڈالوں گا۔ جا میرے بیٹے! نکل جا یہاں سے۔ تیرے سوا اور کوئی مجھے ایسا نظر نہیں آتا کہ جو میرے مشن کو جاری رکھ سکے۔''

شیرو کی حالت اس بپھرے اور تلملائے ہوئے شیر کی سی تھی جس کے سامنے سے اس کا شکار اچانک ہٹا لیا جائے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کچھ کر گزرے۔

چاچا نبی خان نے قرآن مجید پر اٹھایا ہوا حلف یاد دلا کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے تھے۔

وہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ آسیہ اور اپنی بچی کی طرح، ان لوگوں کی طرح جو اس کے سامنے مرنے جا رہے تھے، دشمن سے لڑتا ہوا مر جائے، لیکن نبی خان اس کے اور موت کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا خنجر نکال کر اسے تھما دیا تھا۔

''شیرو! چن زیب کو اس خنجر سے قتل کرنا۔ اس کی موت جتنی اذیت ناک ہوگی، ہماری روحوں کو اتنا ہی سکون ملے گا۔ جاؤ...... جاؤ! خدا تمہارا نگہبان ہو۔ ادھر آزاد کشمیر کی فضاؤں کو ہمارا سلام پہنچا دینا۔ وہاں کے لوگوں کو بتانا کہ ابھی ایسے سرپھرے یہاں زندہ ہیں جنہوں نے کشمیر کو بھلایا نہیں...... کشمیر کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ کے ایوانوں میں نہیں، سری نگر کی پہاڑیوں میں ہوگا۔ ہم اپنے خون سے آزادی کا جو باب لکھیں گے، وہی ہماری تاریخ بنے گا...... وہی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ آؤ ساتھیو۔''

نبی خان نے ساکت کھڑے شیرو کے ایک ہاتھ میں خنجر تھما کر دوسرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر شدت جذبات سے دبایا۔ اس کے ماتھے کو بوسہ دیا اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اس راستے کی طرف بڑھا دیا جو انہوں نے اس طرف سے حملہ کرنے والوں کی ممکنہ مدافعت کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔

............☆☆☆............

شیرو دل پر پتھر رکھ کر پلٹا تھا۔

......اس نے اپنا سفر یہاں سے روانہ ہونے والے سربلندوں کی مخالف سمت میں شروع کیا تھا۔ اس کی جیب میں کچھ کرنسی تھی۔ ایک خنجر کپڑوں کے نیچے بندھا ہوا ریوالور اور بیلٹ میں گولیوں کے علاوہ اس نے ہاتھوں میں اسٹین گن اور پہلو سے لٹکتے تھیلے میں بھری ہوئی کچھ میگزینیں

اور گرنیڈ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

روانگی کے وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ عاکفہ اور آسیہ کے خون میں لتھڑے ہوئے جسم اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ بیک وقت زندہ بھی تھا اور مردہ بھی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوا تھا۔

یہ تھا اس کی تمام تر جدوجہد کا نتیجہ۔ اس روز بد کو دیکھنے کے لیے اس نے اتنی قربانیاں دی تھیں کہ ان میں سے انہی کا کوئی ساتھی اٹھے اور چند ٹکے اپنے ضمیر کی قیمت وصول کر کے ان سب کے کیے کرائے پر پانی پھیر دے؟ اس نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھا اور کانوں سے سنا تھا جو کشمیر آزاد کروانے کے لیے اپنی جان سے گزر جانے کی قسمیں کھایا کرتے تھے، لیکن جونکوں کے مول بک گئے۔ معمولی عہدوں اور سکوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کل تک جو لوگ بھارتی حکومت کا نام سننا گوارہ نہیں کرتے تھے وہ آج اس حکومت کے ستون بنے ہوئے تھے۔

شیخ عبداللہ کا حشر بھی ان لوگوں کو خواب غفلت سے نہیں جگا سکتا تھا۔

......1952ء کے بعد سے جو حشر شیخ عبداللہ کا ہو رہا تھا، وہ سب کے سامنے تھا، لیکن سب اقتدار کی کرسیوں سے چپٹے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی فکر میں تھے۔ کل تک کشمیر کے جو وفادار تھے، آج بڑھ چڑھ کر غاصبوں کی وفاداری کے گن گا رہے تھے۔ شیرو سوچ رہا تھا۔ ''یہ سب بکواس ہے۔ کوئی انقلاب نہیں آئے گا یہاں۔ یہ لوگ محض چند ٹکڑوں کے لیے سارے کشمیر کی عزت سے ہمیشہ کھیلتے رہیں گے۔ یہ سب چور ہیں، ڈاکو ہیں۔ انہوں نے گھات لگا کر خود اپنا شکار کھیلا ہے۔''

اچانک ہی زوردار دھماکوں نے اس کے قدم ڈگمگا دیے وہ سمجھ گیا کہ...... دشمن اس کے ساتھیوں کے نرغے میں پھنس چکا ہے اور انہوں نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیے ہیں۔

لیکن شیرو جانتا تھا کہ اب اس کے ساتھیوں کے بچ نکلنے کے امکانات بھی ختم ہو رہے تھے۔

............☆☆☆............

اس نے فرار کے لیے طویل پہاڑی راستہ منتخب کیا تھا کیونکہ نزدیک کے دو تین دیہات بھی فوج نے اپنے گھیرے میں لے رکھے تھے اور اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر مرنا اسے گوارہ نہیں تھا۔ رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے کسی اڈے کی بجائے اس کا رخ سری نگر کی اس ماڈرن آبادی کی طرف تھا جو حال ہی میں آباد ہوئی تھی جہاں چن زیب کو جو سرکاری افسر ہونے کے علاوہ ان کا ساتھی بھی تھا، ایک خوبصورت بنگلا الاٹ ہوا تھا۔

ان لوگوں نے چن زیب کے متعلق کبھی غداری کا تصور بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے نیاز اور ہر طرح سے مطمئن زندگی گزار رہا تھا اور یہاں بہر حال ایک بہتر مستقبل کے ساتھ قیام پذیر تھا، لیکن وہ انہیں ''ڈبل کراس'' کر گیا۔ محض چند ہزار روپوں کے لالچ میں کیونکہ سرکار نے نبی خان اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔

شیرو کے لیے اسٹین گن کے ساتھ یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ اسے اپنی گن خود سے جدا کرتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا تھا، لیکن اس کے

سوا چارہ بھی کیا رہ گیا تھا۔

ماڈرن آبادی کا یہ بنگلہ کہرے اور اندھیرے کی چادر میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک سرکاری جیپ کھڑی تھی جس کے پیچھے لگی تختی چن زیب کا عہدہ بڑھ جانے پر دلالت کرتی تھی۔ بنگلے کے وسط میں بنے کمرے سے نکلتی روشنی شیرو کو چوکنا کر رہی تھی کہ عمارت کے مکین ابھی جاگ رہے ہیں۔ شیرو بخوبی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ چن زیب ان لوگوں کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کے خوف سے نہیں جاگ رہا کیونکہ اس کے ''آقاؤں'' نے اسے یقین دلا دیا ہوگا کہ تمام ''غدار'' مارے گئے ہیں۔ خود اسے بھی یقین تھا کہ کوئی زندہ بچ کر نہیں جا سکتا کیونکہ اس نے فرار کے تمام راستوں کی نشاندہی کر دی تھی۔

بنگلے کی چھوٹی سی اونچائی والی دیوار پھلانگ کر جب وہ اندر داخل ہوا تو ان لوگوں کی اس قدر بے پروائی پر وہ متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ باہر کوئی ذی روح بھی تو موجود نہیں تھا۔

......اور اس احساس نے کہ وہ اپنی بیوی اور معصوم بچی کے قاتل کے گھر آ گیا ہے، اس کے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے خونخوار چیتے کی طرح چن زیب پر جھپٹ کر اسے چیر پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ اس کا سارا دکھ قہر میں بدل رہا تھا اور وہ کسی بھی لمحے اجل بن کر اس پر ٹوٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

کسی بھی ممکنہ مدافعت کا بندوبست اس نے وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں رک کر کر لیا تھا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمرے سے شراب کے نشے میں دھت آوازیں اب اسے بخوبی سنائی دینے لگی تھیں۔ کبھی کبھی مردانہ قہقہوں کے ساتھ نسوانی چیخ نما ہنسی بھی ابھر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غدار اندر داد عیش دے رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے کچھ سوچا پھر خنجر کو جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، دوبارہ اپنی لمبی گرم جراب میں اڑس لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ریوالور کو ہاتھوں میں تول رہا تھا۔ اچانک آسمان پر بادل زور سے دھاڑے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ جوش انتقام سے اس کے سانسوں کی ترتیب بگڑنے لگی تھی۔ اس نے منہ کے ذریعے دو تین لمبے لمبے سانس باہر پھینک کر خود کو نارمل کیا۔

دروازے پر اس نے اتنی زوردار لات مار کر اسے کھولا تھا کہ اس کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ اندر چن زیب اور ایک فوجی صوفے کے سامنے میز پر ......شراب کی بوتل رکھے بیٹھے تھے جو قریباً خالی ہو رہی تھی۔ ایک آبرو باختہ لڑکی ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی جس کی آنکھیں شیرو کو دیکھتے ہی خوف سے پھٹ چلی تھیں اور چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

چن زیب کا نشہ شیرو پر نظر پڑتے ہی ہرن ہو گیا جس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی نالی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''تت......تت......تم۔'' اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

''کک......کک......کون ہو تم؟'' فوجی افسر خوف سے منجمد ہو چلا تھا۔

''کوئی آواز منہ سے نہ نکالنا۔'' شیرو پھنکارا۔ اس کی لہو بھری آنکھیں چن زیب کو اپنے سینے میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔

تینوں لرز کر رہ گئے۔

''تم۔'' اس نے لڑکی کی طرف ریوالور کی نال سے اشارہ کیا۔ ''اٹھو اور اپنے کپڑے پہن کر سامنے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو جاؤ۔''

لڑکی ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کپڑوں تک پہنچی۔ کپڑے پہنتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ اس نے جیسے تیسے کپڑے پہنے اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے حلق کو تر کرنے کے لیے اسے بار بار تھوک نگلنا پڑ تا تھا۔

''تم میجر ٹنڈن ہو؟'' شیرو نے کمرے میں ایک کھونٹی سے لٹکی فوجی جرسی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فوجی کو مخاطب کیا۔

''شیرو......دیکھو......'' میجر کی بجائے چن زیب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

''بکومت۔'' شیرو دھاڑا۔ وہ چن زیب کو آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ چن زیب سہم کر خاموش ہو گیا۔

''بیوقوف مت بنو جوان۔'' اس کا مخاطب بہر حال آرمی انٹیلی جنس کا میجر تھا۔ جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا دے لیا۔ ''تم یہاں سے بچ کر نہیں جاسکتے۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ میں......''

''میں جہاں سے بچ کر آ گیا ہوں، وہاں تم نے اس غدار کی مخبری پر بہت فوج بھیجی تھی مجھے مارنے کے لیے۔'' شیرو اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ ''میجر تم کو بہر حال مرنا تھا جلد یا بدیر۔ کیونکہ تمہارے ہاتھ بہت سے بے گناہوں کے خون سے رنگے ہیں۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو۔'' میجر کو واقعی غصہ آ گیا۔

''ہاں اور میرے پاگل پن کا شکار تم چن زیب سے بھی پہلے بنو گے۔ میں تم دونوں کو مار ڈالوں گا میجر ٹنڈن۔ صرف یہ فاحشہ تمہاری کہانی سنانے کے لیے زندہ رہے گی۔'' وہ غصے سے بری طرح کھول رہا تھا۔

بادل اتنی زور سے دھاڑا کہ شیرو کے ریوالور سے نکلنے والی گولی کی آواز بھی اس میں دب کر رہ گئی۔ میجر ٹنڈن نے اپنے سامنے رکھی میز کو پاؤں مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاید شیرو کی ٹانگوں کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

گولی اس کے ماتھے کے وسط میں دونوں آنکھوں کے بالکل درمیان لگی تھی۔ شیرو کے نشانے کے متعلق چن زیب کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ میجر نے شاید اسے کوئی عام سا بدمعاش ہی سمجھا تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خون کی ایک لکیر اس کے ماتھے سے پھوٹی اور وہ آگے کو جھک کر میز پر گر پڑا۔ بالکل ایسے جیسے اس نے بیٹھے بیٹھے ستانے کے لیے اپنا سر میز پر ٹکا دیا ہو۔ ڈکراتے ہوئے بکرے کی طرح اس نے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن دوبارہ اسے اپنی گردن موڑنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اس مرتبہ شیرو نے اس کا بھیجا ہی باہر نکال دیا تھا۔ لڑکی کے لیے یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ وہ اپنی جگہ کھڑی کھڑی دھڑام سے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ شیرو نے اس کی طرف مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ وہ اب براہ راست چن زیب کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا اور خون کی ایک رمق بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''مم......مجھے......معاف کر دو۔'' وہ گھگیانے لگا۔

''شٹ اپ!'' شیرو اتنی زور سے دھاڑا کہ بادل کی گرج میں بھی اس کی آواز نمایاں تھی۔ ''تم ناقابل معافی ہو۔ تمہیں خدا بھی معاف نہیں

کرے گا۔ ذلیل...... غدار!''میں تمہیں اذیت ناک موت ماروں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''اس نے پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال کر نبی خان کا دیا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔خنجر شیرو کے ہاتھ میں دیکھ کر خوف اور دہشت سے چن زیب کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

''اٹھو......اس طرف آؤ۔''اس نے چن زیب کو کمرے کی خالی سمت اشارہ کیا اور وہ خوف سے تھرتھراتا اس کے حکم کی پابندی کرنے لگا۔

ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے جب اچانک شیرو اپنی جگہ سے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس کے پہلو میں آ گیا اور اس سے پہلے کہ چن زیب کوئی مدافعت کرے، اس کے خنجر کے بھرپور وار نے چن زیب کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔اس کے بعد تو جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا۔اسے یاد بھی نہ رہا کہ اس نے چن زیب کو کتنے گھاؤ لگائے تھے۔چن زیب کی چیخوں نے آہستہ آہستہ دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔لڑکی کو ہوش آ چکا تھا،لیکن سامنے کا منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔اس کے حلق سے بڑی بے ہنگم اور ڈراؤنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔اس نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر منہ زانوں میں چھپا لیا تھا۔

شیرو جب چن زیب سے الگ ہوا تو اس کی لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔شیرو کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے تھے۔اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے غصے سے ہانپتے ہوئے بھی چن زیب کی لاش کو ٹھوکر ماری اور اس پر تھوک کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

خنجر ابھی تک مضبوطی سے اس کے ہاتھ میں تھا۔شیرو نے ایک نظر خنجر کے دستے پر بنے''شاہین''پر ڈالی۔یہ''صاعقہ''کا امتیازی نشان تھا اور اسے چن زیب کی لاش پر پھینک دیا۔

اب اسے آہستہ آہستہ قرار آنے لگا تھا۔چن زیب کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اسے ایک عجیب سا روحانی سکون محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے اوپر پڑا منوں بوجھ اتار کر پھینک دیا ہو۔وہ ایک آگ سی جو شام سے اب تک اس کے اندر مسلسل دہک رہی تھی چن زیب کے خون کے چھینٹوں نے اس پر شبنم کا کام کیا تھا۔

اچانک ہی آسیہ اور اس کی بچی کے خون میں نہائے ہوئے لاشے اس کے سامنے سوال بن کر آن کھڑے ہوئے اور اس کی دہکتی آنکھوں سے گرم آنسوؤں کے دھارے نکل کر اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔

اس نے لڑکی کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے کو کہا اور باتھ روم کے کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔اپنا پستول اور گولیاں ایک طرف رکھ کر اس نے اپنے کپڑے چند لمحوں میں اتار دیئے تھے۔بمشکل دو منٹ بعد وہ اپنا منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو گیا تھا۔بظاہر اب اس کے جسم پر خون کا کوئی دھبہ نہیں رہا تھا۔الماری سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔لڑکی کو اس نے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔

کمرے میں رک کر اس نے کپڑوں کے اوپر میجر کا ویسٹ کوٹ پہنا۔ٹوپی سر پر جمائی اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے سے جو چابیوں کا گچھا برآمد ہوا تھا،اسے ہاتھ میں تولتا باہر نکل آیا۔دوسرے ہی لمحے باہر کھڑی میجر ٹنڈن کی جیپ دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ہری پرست اور بادام وادی سے گزرتا وہ اس سڑک پر آ گیا تھا جو سری نگر کو سورہ سے ملاتی تھی۔جھیل کے کنارے جیپ روک کر اس نے چند لمحے کچھ سوچا، پھر جیپ کو پہلے گیئر میں ڈال کر پہاڑی سلسلے پر اوپر ہی اوپر چڑھنے لگا۔ایک جگہ رک کر جیپ روک کر وہ باہر نکل آیا۔

انجن اسٹارٹ تھا جب اس نے گیئر دبا دیا۔ جیپ کو جھٹکا لگا اور وہ لڑھکنیاں کھاتی سینکڑوں فٹ نیچے جا گری۔

سورج نے اپنا خونیں چہرہ چٹانوں کی اوٹ سے باہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بنے گاؤں نیل بل کے ایک دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ درمیانی عمر کے ایک کشمیری نے کھولا تھا۔ شیرو پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا، پھر سنبھل گیا۔

''اندر آجاؤ......!'' اس نے شیرو کو اشارہ کیا۔ یہ اس کا ساتھی جمال تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دوبارہ کنڈی لگا کر دروازہ بند کر دیا شیرو اس دوران ایک چارپائی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

جمال نے صرف ایک ہی نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

''مجھے تمام حالات کا کل ہی علم ہو گیا تھا شیرو۔'' اس نے اپنی حالت پر قدرے قابو پا لیا تھا۔ ''افسوس ہم بالآخر اپنوں ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔ مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے شیرو۔ میں ہی جانتا ہوں یا پھر خدا کی ذات کہ جب اسی طرح ظالموں نے میرے جوان بیٹے اور اس کی ماں کو مار ڈالا تھا، لیکن میرے دوست آزادی کے لیے......''

''چپ ہو جاؤ جمال۔'' شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''کس آزادی کی بات کرتے ہو جو کبھی ہمارے مقدر میں نہیں تھی جمال۔ جب اپنے اپنوں کو کھانے لگیں، جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر تلا ہو محض چند ٹکوں اور اقتدار کے لیے، جب ہم خود ہی اپنی غیرت کو بیچنے لگیں تو آزادی کیسی؟ یہاں کس کی حکومت ہے؟ کون حکمران ہے ہمارا؟ کس نے ہاتھ مضبوط کر رکھے ہیں برہمنوں کے؟ نہیں جمال نہیں۔ یہ سب فراڈ ہے......سب لٹیرے ہیں۔''

''میں تمہارے لیے ناشتے کا بندوبست کروں۔'' جمال کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

قہوے کی پیالیاں دونوں کے آگے رکھی ہوئی تھیں، شیرو نے جمال کو اپنی ساری کہانی سنا دی تھی۔

''میں پاکستان جا رہا ہوں۔'' اس نے سگریٹ کا کش لگا کر جمال کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے علم ہے اب تم یہاں ایک پل رکنا گوارہ نہیں کرو گے۔'' جمال بولا۔ ''شیرو! کوئی طاقت مجھے بار بار اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ تم زندہ ہو، میں کل ہی چلا جاتا لیکن میں شاید لاشعوری طور پر تمہاری ہی آمد کا منتظر تھا۔ میں نے آج سے دو سال پہلے نبی خان کو کہہ دیا تھا کہ یہ زمین اب غیرت مندوں پر تنگ ہونے لگی ہے، لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام بزدلوں یا بھاگ جانے والوں کی فہرست میں آئے۔ میرا اب یہاں ہے ہی کیا؟ بیٹا تھا یا بیوی......اب تو دونوں ہی نہ رہے......'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو رہا۔

دونوں دوست کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں نے شام ڈھلنے پر یہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ منصوبے کے مطابق جمال کو بارہ مولا کے راستے سرحد عبور کرنا تھی اور شیرو نے جموں کی طرف نکلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ آزاد کشمیر کے بجائے پنجاب کو اپنا مسکن بنانا چاہتا تھا۔

شام ڈھلے وہ دونوں اس گھر سے چھپتے چھپاتے باہر نکل آئے۔

''شیرو! تم سے بحث کرنا فضول ہے کیونکہ تم نے زندگی بھر کسی کو اپنے فیصلوں میں شریک نہیں کیا، لیکن بہتر ہوتا اگر ہم اکٹھے سفر کرتے۔''

جمال نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔

"نہیں جمال!" شیرو نے کہا۔ "یہ امر خطرے کا باعث ہوگا۔ وہ لوگ سورہ تک جیپ کے تعاقب میں آئیں گے اور یہاں کی سکیورٹی بھی جلدی ہوشیار ہو جائے گی۔ تم ابھی ان بھیڑیوں کی نظر میں نہیں آئے جب کہ میری بات اور ہے۔ میں ان کو اپنے پیچھے لگا کر سری نگر تک واپس لے جاؤں گا۔ اس کے بعد میں فرار کے لیے شاید کوئی اور بارڈر منتخب کروں گا۔"

گاؤں کے باہر ایک پہاڑی کے دامن میں جہاں سے دو راستے متضاد سمتوں کو پھوٹتے تھے، وہ رک گئے۔

"جمال! میری بڑی خواہش تھی کہ یہ جنگ کسی کے ہاتھوں میں منتقل کر کے یہاں سے رخت سفر باندھتا۔ میں جانتا تھا کہ میری زندگی میں ممکن ہے، کشمیر آزاد نہ ہو لیکن اگلی نسل کو ہم آزاد زندگی اور محفوظ مستقبل دے کر جائیں مگر......" شیرو اپنی بات مکمل نہ کر پایا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

"خدا حافظ میرے دوست! الوداع۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ پاکستان میں تمہاری دوستی مجھے نصیب رہے۔" جمال کے لیے یہاں مزید ایک پل رکنا بھی ناممکن تھا۔

"فی امان اللہ!" شیرو کے ہونٹ کپکپائے اور وہ آگے بڑھ گیا۔

کافی دور جا کر اس نے پلٹ کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دوست بارہ مولا کی طرف جا رہا تھا۔ "خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے!" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی منزل کی طرف ہو گیا۔

............☆☆☆............

سری نگر چھوڑنے سے پہلے شیرو نے آسیہ کے بھائیوں سے ملاقات کر لی تھی۔ وہ لوگ اس کے دکھ درد بانٹنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شیرو بھارت کے کسی دوسرے صوبے میں رہائش اختیار کر لے۔ وہ اسے مکمل تحفظ کے ساتھ کاروبار کروانا چاہتے تھے، لیکن شیرو نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں کسی کے منہ سے نہ نکل سکا۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ آسیہ کی پہچان سی آئی ڈی والے نہیں کر سکے تھے ورنہ اب تک وہ زندہ درگور ہو چکے ہوتے۔

"شیرو بھائی" آسیہ کے بڑے بھائی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہارے فیصلے پر اس لیے تو خوش ہیں کہ تم کم از کم ان موذیوں سے محفوظ رہو گے لیکن جب تمہاری جدائی کا تصور کرتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہمارے پاس ایک تم ہی تو ہو۔ آسیہ اور عاکفہ کو تو......" وہ سسک پڑا۔

شیرو نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔

"شیرو!" جلد یا بدیر بالآخر ہمیں بھی پاکستان جانا پڑے گا۔ خدا کرے ہم پھر اکٹھے ہو جائیں۔" اس نے دم رخصت شیرو سے کہا اور اس کے انکار کے باوجود زبردستی ایک خطیر رقم اس کے حوالے کر دی۔

"یہ آسیہ کا حصہ تھا۔ ہم پر حرام ہے۔" آسیہ کے بھائی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سری نگر سے جموں تک کا سفر اس نے برہمن کے روپ میں کیا تھا۔ راستے میں وہ اپنے اکثر ساتھیوں سے ملتا آیا تھا۔ کسی نے اس کے فیصلے کو سراہا اور کسی نے خاموشی اختیار کر لی لیکن اس کے فیصلے پر تنقید کسی نے بھی نہ کی۔ وہ سب شیرو کے غم سے بخوبی آگاہ تھے۔ اب بھی ان میں زیادہ تعداد انہی افراد کی تھی جنہوں نے اپنی زندگیاں ملک وملت کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور وہ جیتے جی کشمیر سے نکلنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔

شیرو نے کسی سے بحث نہ کی، کسی کو اپنے حق میں دلائل نہ دیئے۔ بس ایک دیرینہ رفیق کار کی حیثیت سے اس نے ان سب سے آخری مرتبہ ملنا مناسب سمجھا۔ اب جانے زندگی میں وہ دوبارہ ان سر بلندوں سے ملاقات ہو یا نہ ہوا۔

............☆☆☆............

اسے سری نگر سے چلے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا اور آج وہ جموں کے ایک ہوٹل میں بیٹھا اس بات پر مغز کھپا رہا تھا کہ سرحد کہاں سے عبور کی جائے۔ یہ ہوٹل جموں شہر کے لاری اڈے کے نزدیک ہی بنا ہوا تھا اور زیادہ تر اس راستے پر سفر کرنے والے مسافر ہی یہاں قیام کیا کرتے تھے۔

ایک فیصلہ پر پہنچنے کے بعد وہ کھانے کا بل ادا کر کے باہر نکل رہا تھا کہ ایک چہرے پر نظریں پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے آنے والے نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔ شیرو سے بمشکل پانچ سات قدم آگے نکل کر وہ رک گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی مڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نو وارد کی بانہیں آگے کو پھیل گئیں۔

''شیرو!'' اس نے سرگوشی کی اور شیرو اس کے سینے سے لگ گیا۔

''میرا نام منہ سے دوبارہ نہ نکالنا۔'' شیرو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ نو وارد سب کچھ سمجھ گیا۔

دونوں نے وہیں کھڑے کھڑے اس طرح ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی جیسے وہ رشتے دار ہوں اور مدتوں بعد ملے ہوں۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے شہر کے دوسرے حصے میں پہنچ گئے جہاں ایک قدرے خالی ہوٹل میں بیٹھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی رام کہانی سنائی۔

یہ شوکت تھا۔ شیرو کا 'صاعقہ' کا ساتھی، لیکن دو واڑھائی سال پہلے ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا تھا۔ شیرو نے اسے اپنی حکایت خونچکاں شروع سے آخر تک سنا دی۔ ایک طنزیہ سی آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ شوکت کے ہونٹوں پر پھیلی۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''شیرو!'' میں نے آج سے ڈھائی سال پہلے تمہیں بتا دیا تھا کہ غیرت مندوں پر یہ زمین اب تنگ ہونے لگی ہے۔ ہوتا تو میرے دوست وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو، لیکن کاش تم میرے ساتھ پاکستان آ گئے ہوتے۔

''تم یہاں کس چکر میں؟'' شیرو کو اب ہوش آیا۔

اس کے سوال پر شوکت ہنس پڑا پھر مسکرا کر بولا۔ ''اپنے کام کے سلسلے میں۔''

''کیسا کام؟''

''تجارت۔''

''تجارت؟'' شیرو ابھی تک حیرانی سے اسے گھور رہا تھا۔

''ہاں......اور کیا بھئی میں یہاں سے مال خرید کے لے جاتا ہوں اور پاکستان میں فروخت کر دیتا ہوں۔''

''یار کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔'' شیر و کو الجھن ہونے لگی تھی۔

''میں چوری کے جانور ادھر سے پاکستان لے جاتا ہوں شیر و اور وہاں فروخت کر دیتا ہوں۔ ادھر مجھے ''شوکا بلیکیا'' کہتے ہیں۔'' اس کا لہجہ یکدم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لمحے بھر کو ناچی، پر اس کی رگیں تن گئیں۔ ''شیر و میں نے سوچا اگر وقت مجھے میرے حصے کی خوشیاں نہیں دیتا تو کیوں نہ اس سے اپنا حق چھین لوں۔ میں کسی کا نقصان نہیں کرتا۔ یہاں سرحد پر بسنے والے چور مال اکٹھا کرتے ہیں اور میرے ہاتھوں اونے پونے بیچ دیتے ہیں۔ میں یہ مال اپنی ہمت سے سرحد پار لے جا کر خاصا منافع وصول کر کے فروخت کر دیتا ہوں۔'' اس نے لفظ چبا چبا کر اپنی بات مکمل کی تھی۔

شیر و نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بے مقصد خلا میں کوئی کھوئی ہوئی شے تلاش کر رہا تھا۔ شاید اپنا بچھڑا ہوا نصیبا۔ ''سب چور ہی تو ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''شوکت تو اس کے بزعم خویش لیڈروں سے بہت اچھا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر شرافت اور قربانی کا سائن بورڈ لٹکا کر تو یہ دھندا اختیار نہیں کیا۔ وہ کسی کے حق پر ڈاکہ تو نہیں ڈالتا، کسی کا گھر نہیں لوٹتا۔ اس کے راہنماؤں نے تو اس کی ساری قوم کو کوڑیوں کے مول ہندو کے پاس رہن رکھ دیا تھا۔ شوکت تو پھر بھی جانوروں کا مول چکاتا تھا۔

ایک نفرت سی اس کے اندر جاگی اور اس کے جبڑے بھنچ گئے، پھر شوکت نے اس کی سرگوشی سنی۔ ''شوکے؟ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''

اسی رات دونوں ایک سرحدی گاؤں میں بیٹھے تھے۔ یہ گاؤں پنجاب اور کشمیر کے سنگم پر واقع تھا۔ ان کا میزبان ایک سانسی تھا۔ شام ڈھلے ان کے میزبان نے دونوں کو روانگی کا سگنل دیا۔ اس کے گھر سے باہر کچھ فاصلے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں تین بڑی تگڑی گائیں اور ایک بیل کی رسیاں تھامے دو آدمی کھڑے تھے۔

شوکت کو دیکھتے ہی انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔ یہ شاید اس کے ساتھی تھے جو اس کے کارندوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے جانوروں کا ناقدانہ جائزہ لیا، پھر اپنے سر کو مطمئن انداز میں ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

ان کا میزبان سانسی انہیں رخصت کرنے سرحدی لکیر تک ان کے ساتھ آیا تھا۔ شاید یہ بھی اس ''کاروبار'' کا حصہ تھا کہ میزبان کو سرحدی لکیر تک مہمان کے ساتھ آنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان سے الگ ہو گیا۔ جانوروں کی رسیاں انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیں اور انہیں ہانکتے ہوئے وہ صبح دم ایک اور سرحدی گاؤں تک پہنچ گئے۔

یہ شوکے بلیکیے کا گاؤں تھا۔ پاکستانی علاقہ شروع ہوتے ہی شیر و کے محسوسات بدلنے لگے تھے۔ وہ گھٹن سی جواب تک اس پر طاری تھی رخصت ہو گئی اور وہ اپنے اندر ایک نئے شیر و کو جنم لیتے محسوس کرنے لگا تھا۔

گاؤں پہنچتے ہی وہ گہری نیند سو گیا اور سہ پہر کو اس کی آنکھ گاؤں کی مسجد سے بلند ہونے والی اذان کی آواز سے کھلی۔

دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ وہ شیر محمد سدھن سے اب ''شیر و ڈکیت'' بن چکا تھا۔ دولت اس کے گھر کی باندی

تھی۔ وہ ملک کے کونے کونے میں گھوما، لیکن کبھی اس نے جہلم کے پانیوں کی پرلی طرف نہ جھانکا۔ اس کے ساتھی حیران تھے کہ اس نے مقامی مکینوں والی کوئی بھی ''بدعادت'' نہیں اپنائی تھی۔

شوکت کئی مرتبہ بضد ہوا کہ وہ شادی کر لے، لیکن اس نے شادی نہ کی۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب شوکت سرحدی پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا اور اب وہ اکیلا اس ڈیرے کا مالک تھا۔ شوکے کی موت نے اسے ایک مرتبہ پھر دکھی کر دیا، لیکن اب تو جیسے اسے جینے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔

اس کے معمول میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ہی خود سرحد عبور کرتا تھا۔ اس کا سارا کام اس کے کارندوں نے سنبھال رکھا تھا۔

کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ آزاد کشمیر جائے اور شرفو اور زہراں کو دیکھے، لیکن اس سوچ کے ساتھ ہی بے نام سے خوف کی پرچھائیاں اس کے ذہن پر لرزنے لگتیں۔ دو تین مرتبہ تو وہ منگلا تک جا کر واپس آیا تھا۔ اسے ایک ہی خدشہ وہاں جانے سے روکے ہوئے تھا۔ وہ سوچتا: ''خدانخواستہ اس کی اچانک آمد کہیں دونوں کو پشیمانی میں مبتلا نہ کر دے؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شرفو اور زہراں کی زندگیوں پر اس کی وجہ سے ایک لمحے کو بھی یاسیت طاری ہو۔

......اس دوران اسے دو تین واقف کاروں سے دونوں کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی تھی۔ اس نے سن لیا تھا کہ شرفو پاکستانی فوج کا کیپٹن بن چکا ہے اور زہراں دو بیٹیوں کی ماں۔

.............☆☆☆.............

ایف آئی یو کے کیپٹن اشرف خان کے سامنے شیرو کی تصویر رکھی تھی جس کے ساتھ مقامی صوبے دار کی رپورٹ موجود تھی کہ اس علاقے میں کام کا آدمی صرف شیرو ڈکیت ہے اور شرفو دیوانوں کی طرح ٹکٹکی لگائے تصویر کو گھور رہا تھا۔

''شیرو! تم زندہ تھے۔ تم نے کتنا ظلم کیا شیرو۔'' آہستہ سے تصویر کو گھورتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

جب اس کا اردلی صاحب کے لیے چائے لے کر اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کے صاحب کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ حیران رہ گیا: ''کیپٹن صاحب کو کیا ہوا؟'' لیکن دوبارہ وہ اپنے صاحب کے چہرے کو دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔

اگلے روز شام تک اس کے پاس شیرو کی ''بریف ہسٹری'' پہنچ چکی تھی اور خاصی رات گئے تک وہ کروٹیں بدلنے کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے او۔ سی کو یقین دہانی کروادی تھی کہ وہ شیرو کو ضرور کام کے لیے آمادہ کر لے گا۔

''یہ ملک کے لیے بہت بڑی خدمت ہوگی کیپٹن۔'' کرنل صاحب نے گہری سوچوں سے ابھر کر روانگی کے وقت اسے کہا تھا۔

اور آج 15 مئی 1965ء کو وہ یہی مشن لے کر اپنے دوست سے ملنے آیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے اور......کیپٹن اشرف خان وقت کی ستم ظریفی پر حیران تھا کہ وہ شخص جس نے اسے اور اس جیسے کتنے اور نوجوانوں کو آزادی کی راہ دکھائی تھی۔

......جس کا خاندان پچھلی تین نسلوں سے کشمیر کے لیے اپنا خون بہاتا چلا آ رہا تھا، آج وہی شیر محمد سدھن اس کے سامنے شیرو ڈکیت بن کر

بیٹھا ہوا ہے۔

اس کی کہانی میں کئی ایسے موڑ آئے تھے کہ شرفو کا دل بھر بھر آیا، لیکن اس نے بطور فوجی شیرو کے سامنے آنسو بہانا بزدلی سمجھا۔ وہ جان چکا تھا کہ ایسے حالات جن سے گردش وقت نے اس کے دوست کو ٹکرایا تھا کسی کو بھی پاگل کر دینے کے لیے کافی تھے...... اس کا دوست مجاہد سے ڈاکو یونہی نہیں بن گیا تھا۔ وہ تو اپنے اندر دہکتے الاؤ کو نکاس کی راہ دکھا رہا تھا جو آگ اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی، وہ اسی کو نہیں، سارے کشمیر کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔

''مجھے کہنا تو نہیں چاہیے شیرو بھائی۔'' کیپٹن اشرف نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''میں تو کبھی تم سے بحث نہیں کیا کرتا تھا۔ یوں بھی تم نے زندگی میں اپنی ہر بات مجھ سے منوائی ہے، لیکن شیرو بھائی میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے ہمارے ساتھ بہت ظلم کیا...... بہت ظلم کیا تم نے ہمارے ساتھ۔ میں کیا جواب دوں گا زہراں کو...... کیا بتاؤں گا اسے؟''

''شرفو! حالات نے موم کی گڑیا کی طرح میری ناک جس طرف چاہی گھما دی۔ میں تو ہمیشہ سے وقت کی ٹھوکروں میں رہا ہوں اور آج بھی گردش حالات نے مجھے اٹھا کر تمہارے سامنے پھینک دیا ہے۔ میں واقعی تمہارا گناہگار ہوں لیکن بخدا میرا کوئی بھی عمل اختیاری نہیں تھا۔''

............☆☆☆............

دونوں کے سامنے رکھا کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا، لیکن دونوں ہی ابھی تک وقت کی دھول میں اپنے ماضی کے نقوش کریدر ہے تھے۔

......ان کے گرداگرد شام اور گہری ہوتی جا رہی تھی اور باہر جیپ میں بیٹھا صوبیدار بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا...... پچھلے تین چار گھنٹے سے اس کے کیپٹن صاحب اور شیرو ایک علیحدہ کمرے میں بند تھے۔

جیپ میں نصب ریڈیو ٹرانسمیٹر پر اب تک دو مرتبہ ہیڈ کوارٹر اس سے ان لوگوں کی خیریت دریافت کر چکا تھا اور اس نے دونوں ہی مرتبہ ''او۔کے'' کہنے پر اکتفا کیا تھا۔

''کھانا کھاؤ شرفو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' شیرو نے اسے پونچھ سے اس سرحدی علاقے میں واپس بلا لیا۔

''شیرو۔'' اچانک جیسے شرفو نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔

''ہوں۔'' شیرو نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''آج تک تو تم نے مجھ سے اپنی ہی بات منوائی ہے، لیکن آج تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔''

''وہ کیا؟''

''تمہیں میرے ساتھ کشمیر جانا ہو گا...... سری نگر۔''

......کہنے کو تو شرفو نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا، لیکن اسے یوں لگا جیسے اس نے شیرو کو بجلی کا شاک لگا دیا ہو...... ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس نے دوبارہ پلیٹ میں رکھ کر جب شرفو سے نظریں ملائیں تو اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

''کس کشمیر کی بات کرتے ہو کیپٹن اشرف خان؟'' اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا تھا۔

''اس کشمیر کی شیرو بھائی!'' شرفو کا انداز بالکل ناصحانہ ہو گیا تھا۔ ''جس کے لیے تمہارے والد، چچا، ماں، بیوی اور بچی نے اپنا خون دیا''

''پاگل تھے وہ سب۔'' شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

''اور تم بہت عقلمند ہو نا۔'' شرفو کا لہجہ خاصا طنزیہ ہو گیا جو اپنا سب کچھ لٹا کر اب بزدلوں کی طرح یہاں چھپے بیٹھے ہو۔''

''چپ رہو خدا کے لیے۔ شرفو! خاموش ہو جاؤ ذرا۔'' شیرو کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''اچھا صلہ دیا تم نے ان کی قربانیوں کا۔'' شرفو نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چوٹ کی، آخر وہ انٹیلی جنس کا کیپٹن تھا۔

''بس کرو شرفو......! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔'' شیرو پھر تڑپا۔ ''کھانا کھاؤ پھر باتیں کریں گے۔''

شرفو سے اس کی جذباتی حالت پوشیدہ نہ تھی۔ وہ خاموشی سے لقمے زہر مار کرتا رہا۔

شام ڈھلے جب دونوں کمرے سے باہر نکلے تو صوبیدار حکم داد نے سکھ کا سانس لیا۔ اس نے یہ چند گھنٹے انتہائی کرب کی حالت میں گزارے تھے۔

''شرفو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میں بے غیرت نہیں ہوں، بزدل بھی نہیں۔ کشمیر کو آزاد دیکھنے کے لیے مجھے ہزار مرتبہ جینا اور ہزار مرتبہ مرنا بھی پڑے تو میرے لیے سعادت کا باعث ہوگا۔''

شرفو کے چہرے پر اس کی بات سے خود بخود ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور...... بے اختیار وہ اپنے جگری یار کے سینے سے لگ گیا۔

شیرو ڈکیت کے ڈیرے والے بڑی حیرت سے اسے کیپٹن اشرف خان کے ساتھ جیپ میں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اپنے استاد کی روانگی سے پہلے انہوں نے اس بات کی تصدیق بخوبی کر لی تھی کہ اسے سکیورٹی کا کپتان کہیں پستول کے زور پر اغوا کر کے تو نہیں لے جا رہا؟ لیکن شیرو نے سب کو مطمئن کر کے پرسکون رہنے کی تاکید کی تھی۔

صوبے دار حکم داد تو سارے راستے خود کو یہی یقین دلاتا آیا تھا کہ واقعی اس کے ساتھ جیپ میں شیرو ہی بیٹھا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اپنے سامنے لگے شیشے میں اس کا عکس دیکھا تھا اور شیرو ہر مرتبہ اسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا۔

اللہ کا سپاہی

جس تپش کو محسوس کرتے ہوئے چارسدہ (صوبہ سرحد) کے اس سادہ لوح پٹھان...... جنرل طارق نے ساحل کشمیر پر قدم رکھا تھا۔

......اس حرارت کو برسر اقتدار طبقہ سمجھنے سے یکسر قاصر تھا۔

وہ کوتاہ اندیش محض اقتدار کی جنگ لڑنا جانتے تھے...... اپنی کرسی کی حفاظت کے لیے تو وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

جب سینڈ ہرسٹ ملٹری اکیڈمی (انگلستان) کے اس گریجوایٹ نے مڑ کر دیکھا تو وہ تنہا تھا...... بالکل اکیلا!

اور...... وقت اس کی تنہائیوں میں اضافہ ہی کرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھی کٹتے گئے...... اور کسی نے اس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش بھی نہ کی۔

کشمیر ہمیشہ ایک سلگتا ہوا سوال بن کر برصغیر کے ماتھے پر دہکتا رہا۔ 1948ء کے بعد سے دونوں ملکوں کی حکومتیں یہی سمجھنے لگی تھیں کہ اب کشمیر کا مسئلہ شاید ختم ہو گیا ہے، لیکن وہ بھول رہے تھے کہ تاریخ اپنا عمل دہراتی ہے اور دبی چنگاریاں کبھی نہ کبھی بھڑک کر شعلوں کا روپ ضرور اختیار کرتی ہیں۔ قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہا تھا۔ اس میں مبالغہ بھی نہیں کہ اگر یہ شہ رگ کٹ جاتی تو پاکستان کی شریانوں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچڑ جاتا۔ کشمیر کی پہاڑیوں سے اترنے والے دریاؤں کے سوتے اگر پاکستان کے لیے خشک کر دیے جاتے تو اس کی ہریالی کو موت آ جاتی۔

کشمیر پاکستان کے لیے ناگزیر تھا......!

اس حقیقت کو پاکستانیوں سے زیادہ کشمیری عوام نے محسوس کیا...... ان مظلوموں کو ہمیشہ یہی امید رہی کہ پاکستانی کبھی نہ کبھی ان کی مدد کو ضرور آئیں گے، لیکن وہ دن شاید ان کا پھر مقدر نہ بن سکا اور کشمیر میں حالت تنگ آمد بجنگ آمد پر پہنچ گئی۔

جلد ہی خبریں ملنے لگیں کہ کشمیر میں کفن بردوش مجاہدین زیر زمین روبہ عمل ہیں۔

............☆☆☆............

1964ء کے آخری مہینوں میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ وہاں ''زیر زمین'' پہلے سے مصروف عمل تحریکوں نے اب کھل کر سامنے آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خصوصاً ''حضرت بل'' کے جھگڑے نے ایسی خطرناک صورت اختیار کی کہ مقبوضہ کشمیر کے چپے چپے سے آزادی کے نعرے گونجنے لگے اور انہیں نعروں کی گونج میں پاکستان میں ایک منصوبہ...... ''آپریشن جبرالٹر'' ترتیب دیا گیا۔

اس منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ جیسے ہی پاکستانی کمانڈوز جنہیں مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر گوریلا نوعیت کی کارروائیاں پہلے سے مصروف عمل مجاہدین کے ساتھ مل کر انجام دینی تھیں، کو چند کامیابیاں نصیب ہوئیں تو عام کشمیری بھی اس ''بغاوت'' میں عملاً شامل ہو جائیں گے۔

......اور اس سلسلے میں اس وقت کے وزیر خارجہ کی یہ یقین دہانی موجود تھی کہ امریکہ بہادر نے ضمانت دی ہے کہ اگر بین الاقوامی سرحدوں (سوائے حد متارکہ جنگ کشمیر) پر کوئی ہنگامہ پاکستان نہ کرے تو بھارت بھی پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔

......ابتداہی میں جب اس منصوبے کے لیے کارفرمانفری کا جائزہ لیا گیا تو دو نئے ڈویژن کھڑے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن ایک سازش کے تحت وزارت خزانہ نے اس مد میں فنڈ فراہم کرنے سے معذرت کر دی۔

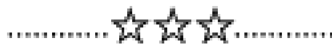
نامکمل اسباب کے باوجود بہرحال اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا گیا اور اس تین مرحلوں میں آپریشن جبرالٹر ترتیب پایا۔

1۔ Deep Peneteration Force. اس ''فورس'' کو یہ فرض سونپا گیا کہ کمانڈو چوری چھپے ''سویلین راہبروں'' کی راہنمائی میں مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں۔ ہر ٹولی اپنے تین تین چار چار ''آرمز'' اور ایمونیشن بھی لے کر جائے گی جو سری نگر پہنچ کر انہوں نے میر واعظ کشمیر (جن کے دعوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ سارا منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا۔) اور ان کے پہلے سے مصروف عمل ساتھیوں کو پہنچانا تھا۔

اس ''فورس'' میں موجود کمانڈوز کو سری نگر میں موجود حریت پسند کشمیری مجاہدین کے ساتھ مل کر ان کے لیے ''منصوبہ بندی کے مرکز'' اور ''راہنمائی کرنے والوں'' کا کردار ادا کرنا تھا۔

2۔ دوسری ''فورس'' کو Medium Peneteration Force. کا نام دیا گیا۔ اس ''فورس'' کو ''پہلی فورس'' اور اپنے درمیان رابطے اور دیگر کارروائیوں کے لیے سیکنڈ لائن کا فرض ادا کرنا تھا۔ اس ''فورس'' نے بھی کشمیر کے کافی اندر گھس کر کام کرنا تھا۔

3۔ ''تھرڈ فورس'' نے جنگ بندی لائن کے پندرہ میل اندر داخل ہو کر اپنا مرکز قائم کرنا اور دونوں روبہ عمل فورسز کے لیے ایک طرح سے ''ہیڈ کوارٹر'' کی حیثیت اختیار کرنا تھی۔



جنوری 1965ء میں آپریشن پر عمل شروع ہوا اور دوسرے مرحلے کے لیے منتخب مسلح یونٹ مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے ''فورس نمبر 1'' کے جانباز ٹولیوں کی شکل میں مقبوضہ کشمیر میں کافی اندر تک گھس چکے تھے۔ ان کے ساتھ ''معمولی گڑبڑ'' یہ ہوئی کہ ان میں سے کچھ ٹولیوں کا ''بھاری جنگی سامان'' نظروں میں آ گیا۔ یوں بھی اس سامان کا پوشیدہ رہنا ناممکن تھا۔

اس سامان کی اطلاع ''مقامی مخبروں'' نے انڈین انٹیلی جنس کو کر دی اور ان کی توقعات کے بالکل برعکس ابتدا ہی میں انہیں بھارتی فوج نے گھیرے میں لے لیا۔

آفرین ہے ان جیالوں پر کہ وہ کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہ لائے اور لڑتے بھڑتے کسی نہ کسی طرح اپنی منزل یعنی سری نگر پہنچ گئے جہاں کشمیر کی تحریک کا سب سے سنگین مذاق ان کا مقدر بنا۔ جب انہوں نے میر واعظ کشمیر سے رابطہ کیا تو اس نے نہ صرف خود اسلحہ وصول کرنے اور پہنچانے سے انکار کر دیا بلکہ انہیں کسی بھی قسم کا تحفظ بہم پہنچانے سے بھی معذوری ظاہر کر دی۔

لیکن کچھ غیرت مند ابھی باقی تھے۔ انہوں نے بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اپنی اور اپنے خاندانوں کی زندگی داؤ پر لگا کر پاکستانی

کمانڈوز کی امداد پر تل گئے۔اس سلسلے میں سری نگر کے ''بٹ مالوا ریا'' (Butmalo Area) کے مجاہدین کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

......انہوں نے ان کمانڈوز کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور چھپا لیا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا ''دوسری فورس'' کو بھی کرنا پڑا، لیکن وہ ہر طرح کا خطرہ مول لے کر ''مقررہ علاقوں'' تک بالآخر پہنچ گئے اور یوں مقبوضہ کشمیر کے اندر پاکستانی کمانڈوز اور بھارتی فوج میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔

بھارتی وزیراعظم نے اس مرحلے پر بیان بازی کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور بالآخر اسے یہ دھمکی بھی دینا پڑی کہ اگر پاکستانی کمانڈوز مقبوضہ کشمیر سے باہر نہ نکلے تو وہ اپنی مرضی کا محاذ کھول دے گا۔

......اس دھمکی کا واضح مطلب یہی تھا کہ......اب بھارت رن کچھ اور کشمیر کا بدلہ لینے کے لیے مغربی محاذ پر حملہ کرے گا۔

......اور اس کے ساتھ ہی اس کی فوج نے بڑی تیزی سے مغربی سرحدوں کا رخ کر لیا۔

..........☆☆☆..........

یہ مسئلہ پاکستانی کابینہ میں زیر بحث آیا تو ایک مرتبہ پھر وزیر خارجہ نے یقین دہانی کروائی کہ......اگر پاکستان مغربی سرحدوں پر بھارت کے لیے اشتعال پیدا نہ کرے تو امریکہ اس بات کی ضمانت دے رہا ہے کہ بھارت مغربی سرحدوں پر حملہ آور نہیں ہوگا اور امریکہ اسے کسی بھی صورت میں بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرنے دے گا۔

اب اس مسئلے پر ''سیاسی سیانے'' سر جوڑ کر بیٹھے کہ بھارت کو کس طرح یقین دلایا جائے کہ پاکستانی فوج ''مغربی سرحدوں'' پر اشتعال انگیزی نہیں کرے گی۔

پھر یہ ''سیانے'' خود ہی ایک فیصلے پر بھی پہنچ گئے اور مسلح افواج نے رن کچھ اور مقبوضہ کشمیر کی صورت حال کے پیش نظر جو دفاعی اقدامات مغربی محاذ پر کیے ہوئے تھے انہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حکم جاری ہوا کہ سرحدوں کے ساتھ ساتھ (خصوصاً لاہور فرنٹ پر) بنائی گئی تمام Forward Posts کو پیچھے ہٹا لیا جائے اور ''متوقع حملے'' کے علاقے میں جو بارودی سرنگیں (مائنز) دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے دبائی گئی ہیں، انہیں صاف کر دیا جائے۔

''......فارورڈ ایریا'' کے کمانڈنگ آفیسر جو دشمن سے دو بدو جنگ کی آرزو نہ جانے کب سے اپنے سینوں میں پروان چڑھا رہے تھے اور جنہیں گردش حالات نے بہ مشکل دل کے ارمان نکالنے کا موقع بہم پہنچایا تھا، اس وقت ٹپٹا کر رہ گئے جب جنرل ہیڈ کوارٹر سے انہیں اس قسم کے سگنل موصول ہونے لگے:

''خبردار! کوئی ایسی حرکت نہ ہو جسے ''اشتعال انگیز'' قرار دیا جا سکے۔''

وہ لوگ حیران ہوتے تھے کہ آخر اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر کوئی دفاعی منصوبہ بندی کرنے سے دوسرے ملک کی فوجوں کو اشتعال کیسے آ سکتا ہے؟ بہرکیف ہائی کمان کی مہربانیوں سے بھارتی فوج کے لیے لاہور اور سیالکوٹ پر چڑھ آنے کے لیے میدان خود بخود ہموار ہو گیا۔''

..........☆☆☆..........

اگست کے اوائل ہی میں فورس نمبر 2 نے جنرل اختر ملک کی کمانڈ میں ''آپریشن'' شروع کیا اور کشمیر پر پہلا بھرپور وار چھمب کے بائیں پہلو سے ہوا۔

پاکستانی فوج نے بھارت کی ''جے اینڈ کے'' 8 رائفلز کو shorts میں پکڑ لیا اور دشمن فوج کو رگیدتے ہوئے پاکستانی دستے دیوا، چھمب، گھوڑا، گھوڑی اور بالآخر اپنی منزل مقصود Red Hill تک بغیر کسی قابل ذکر نقصان کے پہنچ گئے۔ یہ فورس دریائے توی کے کنارے کیساتھ ساتھ پھیل گئی۔

5 تا 15 اگست کے درمیان یہ سارا علاقہ قبضے میں آ گیا۔ بھارت نے گورکھا بریگیڈ کے ساتھ جوابی حملہ کیا، لیکن منہ کی کھا کر اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ پاکستانی فوج کی اچانک اور تیز یلغار نے بھارتی جوانوں کا مورال تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کا مورال بلند کرنے کے لیے ہی بھارت کے مایہ ناز مونٹین ڈویژن کو کشمیر کی سرحد پر ڈیپلائے کر دیا گیا...... بھارتی سورما جانتے تھے کہ پاکستان کے پاس کوئی...... مونٹین بریگیڈ'' نہیں ہے۔

25 اگست کی رات بھارتی توپ خانہ حرکت میں آیا اور اس نے درہ حاجی پیر، بھارت گلی (ٹیٹوال سیکٹر) پر صرف بارہ گھنٹوں میں 20 ہزار گولے داغ دیئے۔ اس اثناء میں پاکستانی فوج ''قلیل نفری'' کا شکار ہونے لگی تھی اور مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے مزید نفری میسر نہیں آتی تھی۔ ٹیٹوال سیکٹر میں بھی صرف تین سو جوانوں کی ایک کمپنی باقی بچی جس کے پاس اس شدید اور تباہ کن گولہ باری کا کوئی ''عملی جواب'' نہیں تھا۔

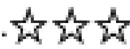
26 اگست کو دشمن نے پورے بریگیڈ کے ساتھ انفنٹری کا ایڈوانس کروایا۔ ہراول میں پیرا بٹالین تھی۔ دشمن اس رات بے پناہ جانی نقصان اٹھا کر قریباً پچاس ساٹھ گز ایڈوانس کر گیا۔ 27 اگست کی رات سکیم بدل کر دشمن نے رات ایک بجے حملہ کیا۔ اس مرتبہ دشمن کے بریگیڈ کو پورے ڈویژن کے توپ خانے کی مدد حاصل تھی۔

آٹھ دن تک دشمن آتش و آہن کی مسلسل اور موسلا دھار بارش کرنے کے بعد بالآخر درہ حاجی پیر اور بیڈوری کی چوکیوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ادھر حالت یہ تھی کہ پاکستانی پلاٹون میں سے جس کی نفری 25 تھی، 22 جوان شہید ہو چکے تھے۔

30 اگست کی رات پونچھ کے شمالی پہاڑیوں سے دشمن کا توپ خانہ آگ برسانے لگا۔ اس نے ''چاند ٹیکری'' کو اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ اس کا پلان پونچھ کے شمالی علاقے سے نکل کر ''باغ'' پر قبضہ کرنا تھا، لیکن دشمن کو اس حملے کی جو قیمت اگلے روز ادا کرنی پڑی، اس کا تصور بھی اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

یکم ستمبر کی صبح چھمب چھاؤنی پاکستان جوانوں کے قدموں تلے سسک رہی تھی۔ بھارتی رعونت کو جیالوں نے دریائے توی میں غرق کر دیا تھا۔

مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی کمانڈوز کی مسلسل کامیابیوں سے تنگ آ کر بھارت نے اقوام متحدہ کا رخ کیا اور یہاں مباحثے کا آغاز ہوتے ہی ...... پاکستانی ہائی کمان نے حملوں کا سلسلہ روک دیا۔ پہلے سے مصروف پیکار جوانوں کو حکم ملا کہ اپنا قبضہ مستحکم کریں اور ایڈوانس روک دیں۔ اس کے فوراً بعد نیا حکم جاری ہوا کہ مقبوضہ علاقہ اسی طرح خاموشی سے خالی کر دیا جائے جس طرح خاموشی سے اس پر قبضہ کیا گیا تھا۔ بادل نخواستہ اس عجیب وغریب حکم کی پابندی میں تمام یونٹ 28 اگست تک واپس اپنی سرحد پر پہنچ گئے۔



ابھی دو تین روز ہی گزرے تھے کہ ایک مرتبہ پھر باسی کڑھی میں ابال آیا اور یکم ستمبر کو حکم جاری ہوا کہ پہلے سے خالی کیے گئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا جائے۔ اس مرتبہ ''کھل کر حملہ'' کرنے کی آزادی بھی میسر تھی۔

اس عجیب وغریب صورت حال نے جوانوں کو پریشان کر دیا۔ چوہے بلی کا جو کھیل ہائی کمان ان کے ساتھ کھیل رہی تھی، اس نے فیلڈ ایریا میں موجود افسران کو چکرا کر رکھ دیا۔

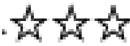
انہوں نے دوبارہ حملہ گومگو کے عالم میں کیا، لیکن دشمن بھی اب لنگوٹ کس کر میدان میں آچکا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنی مورچہ بندیاں نئے سرے سے بہت مضبوطی کے ساتھ ترتیب دی تھیں۔

پہلے سے خالی کردہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کیا حکمت عملی کارفرما تھی؟

......اس کی سمجھ کسی کو نہیں آرہی تھی۔

......اگر دشمن کو ٹھنڈا رکھنا مقصود تھا تو قابض ہونے کی صورت میں اس نے طیش کھا کر کب مغربی سرحدوں پر حملہ کر دیا تھا؟ اور پھر......اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ پاکستانی فوج کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد اب اس کی مغربی سرحدوں پر حملہ نہیں کرے گا؟

ان سوالات کا جواب نہ تب کسی کے پاس تھا نہ اب ہے۔ ہوشیار اور تازہ دم دشمن پر چڑھ دوڑنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا، لیکن آفرین ہے ان جانبازوں پر کہ جو جان توڑ کر لڑے۔ دشمن کے چوکنا ہونے کے باوجود اس کی مورچہ بندیوں کے زعم کو اپنے قدموں تلے روندتے دریائے توی کی لائن پر آگے بڑھتے چلے گئے اور چھمب جوڑیاں پر قبضہ کرنے کے بعد ''کالی دھارا'' تک جا پہنچے۔



اس دوران ایک اور قیامت ان پر ٹوٹی، جب ''ہائی کمان کے سیانوں'' نے انہیں ایڈوانس کرتے ہوئے چوبیس گھنٹوں کے لیے روک لیا۔

وہ لوگ اس بات کا اس دوران جائزہ لیتے رہے کہ اس علاقے میں کیا ٹینک قابل استعمال ہیں یا نہیں؟

......اور بھاگتا ہوا دشمن اس ''موقع'' سے بھرپور فائدہ اٹھا گیا۔ وہ پلٹ کر اپنی مورچہ بندیاں مضبوط کرنے لگا۔

ان حالات میں کہ حملہ ہو چکا ہے اور کمانڈر کسی ایک ''نکتہ'' پر چوبیس گھنٹے بحث میں ضائع کر دیں (جبکہ ایک ایک لحہ قیمتی ہو) ایسی کامیابیاں نصیب ہو جانا محض عطیہ خداوندی نہیں تو اور کیا تھا؟

چوبیس گھنٹوں کے بعد ہائی کمان اس نتیجے پر پہنچی کہ ٹینک یہاں استعمال ہو سکتے ہیں، حالانکہ مقامی کمانڈروں نے پہلے ہی روز اس بات کی تصدیق کر دی تھی۔

......چنانچہ ٹینک میدان کارزار میں لائے گئے، لیکن اب مطلوبہ نتائج حاصل کرنا قریباً ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ 24 گھنٹوں میں جو نقصان ہم نے اٹھا لیا تھا وہ اب نفع میں بدلنے سے رہا۔

اور یہ سب کچھ کون اور کیوں سرانجام دے رہا تھا......؟ شاید تاریخ کے اوراق کبھی اس راز کو اگل سکیں۔ فی الحال ہر کوئی خاموشی اختیار کیے

ہوئے ہے۔ البتہ یہ بات ہم ضرور بتانا چاہیں گے کہ اس پر ہی بس نہ کیا گیا بلکہ برسرِپیکار افواج کا مورال تباہ کرنے کی ایک اور سازش بھی کی گئی، وہ یہ کہ...... آپریشن کمانڈر جنرل اختر حسین ملک سے کمان واپس لے لی گئی اور جنرل یحییٰ اس کی بجائے نئے کمانڈر بن گئے۔

موصوف نے آتے ہی مزید ایک دن "محاذ کی حکمت عملی" کو سمجھنے میں ضائع کر دیا اور ان کے اس فیصلے نے میدان کارزار میں لڑتی افواج پر زبردست منفی اثرات مرتب کیے اور حملے میں سست روی آ گئی۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود کچھ مقامی کمانڈروں کی انفرادی شجاعت اور جوانوں کا جذبہ حریت رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ وہ دشمن کو کاٹتے ہوئے 5 ستمبر کو اکھنور کے پہاڑی سلسلے تک جا پہنچے اور پھر 6 ستمبر کا دن اکھنور پر حملے کے لیے مقرر ہوا۔

پلان یہ تھا کہ اکھنور کی سڑک پر قبضہ کر کے دشمن کی سپلائی منقطع کر دی جائے اور اس کا رابطہ جموں کشمیر (مقبوضہ) سے بالکل کاٹ دیا جائے۔

بھارت کے لیے سوائے اس کے اب کوئی اور چارہ نہ رہا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر پر پاکستانی فوج کی یلغار روکنے کے لیے مغربی محاذ پر حملہ آور ہو جائے...... اور اس نے ایسا ہی کیا۔

6 ستمبر 1965ء کی علی الصبح بھارت نے لاہور پر 3 ڈویژن فوج سے سہ طرفی حملہ کر دیا۔ برکی پر بھارت کے نمبر 17 انفنٹری ڈویژن نے اور بھینی اور باٹا پور پر نمبر 5 انفنٹری ڈویژن نے حملہ کیا۔ اس سہ طرفی حملے کو کمک دینے کے لیے نمبر 23 ماؤنٹین ڈویژن ان کے ساتھ تھا اور امرتسر کے باہر ایک اور تازہ دم ڈویژن ریزرو میں تیار کھڑا تھا۔

ان سب ڈویژنوں کے ساتھ ایک ایک اضافی ٹینک رجمنٹ اور عقب میں کور کا توپ خانہ تیار کھڑا تھا۔

6 ستمبر ہی کی صبح بیدیاں ہیڈ ورکس کی طرف سے قصور کے راستے لاہور تک پہنچنے کے لیے بھارت کے نمبر 4 ماؤنٹین ڈویژن، نمبر 41 ماؤنٹین بریگیڈ اور نمبر 2 انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ نے حملہ کر دیا۔

اس حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی دستوں کی پیش قدمی روک کر دفاعی پوزیشنیں اختیار کر لی گئیں اور وہاں سے فوراً بریگیڈ نکال کر لاہور کی طرف روانہ کیے گئے جہاں بلوچ رجمنٹ کی چند کمپنیاں دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر اس کے حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھیں۔

اس حملے کے بمشکل 72 گھنٹے بعد انڈین ہائی کمان نے اپنے پلان کے مطابق 8 ستمبر کی صبح سیالکوٹ سیکٹر میں زبردست حملہ کر دیا۔ اس حملے میں بھارت کے نمبر 1 بکتر بند ٹینک ڈویژن (جس میں دو ٹینک رجمنٹس، 62 کیولری اور 2 رائفل لانسرز اضافی تھیں) نمبر 26 انفنٹری ڈویژن اور نمبر 6 ماؤنٹین ڈویژن نے ایک لڑاکا موٹرائزڈ بریگیڈ اور توپ خانے کی کم و بیش پانچ سو توپوں کی مدد سے جنرل ڈن کی کمانڈ میں حصہ لیا تھا۔

بلاشبہ یہ دنیائے حرب کی تاریخ کا بہت بڑا بکتر بند حملہ تھا۔ اس حملے نے کشمیر محاذ پر آگے بڑھنے کے امکانات بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیے تھے اور پاکستانی ہائی کمان نے اپنی ساری توجہ لاہور اور سیالکوٹ کو دشمن سے بچائے رکھنے پر مرکوز کر دی۔

جب دشمن نے للکارا

اور آخر......وہ ساعت بھی آ گئی جس کا ایک مدت سے خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا۔

......بھارت نے پاکستان کے خلاف اپنی مرضی کا محاذ کھول دیا۔ برصغیر میں کفر اور اسلام کی جنگ شروع ہو گئی......ایک طرف سے لات و ہبل کے جے پکاری جانے لگی تو دوسری طرف سے اللہ اکبر کے نعرے فضاؤں میں گونجنے لگے۔

......اور انہی نعروں کی گونج میں اللہ کے سپاہی اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر چودہ سو برس پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ان کی نظریں اس مقام پر آ کر ٹھہر گئی تھیں جہاں بدر کے مقام پر اللہ کے آخری رسول ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چھوٹے سے گروہ کے تحفظ کی دعا مانگ رہے تھے۔

''اے خدا! اپنی امداد کے وعدے کو نہ بھولنا، اے خدا! اگر......یہ چھوٹا سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری حقیقی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔''

......سر سے پاؤں تک اسلحے میں لیس کفار مکہ مسلمانوں کو اپنے برق رفتار گھوڑوں تلے کچلنے پر تلے ہوئے تھے اور آج بھی وہی کفار اپنے ٹینکوں پر سوار ہو کر اسی سرکار مدینہؐ کے غلاموں کو نیست و نابود کرنے کے لیے پاکستان کی سرحدیں عبور کر رہے تھے۔

دراصل شمع اسلام کی وہ ننھی کرنیں جو قرون اولیٰ کے مسلمان اس برصغیر پر روشن کر گئے تھے......وہ ہمیشہ ان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھی۔

اور آج وہ اسی روشنی کو معدوم کرنے کے لیے پاکستان کے در و دیوار کو مسمار کر دینا چاہتے تھے۔

کتنی مشابہت تھی اس وقت اور......اس دور میں! اس وقت بھی مسلمانوں کو اللہ پر بھروسہ تھا اور آج بھی ان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

لاہور پر دشمن کے بے پناہ لشکر کو روکنے کی سعادت جنرل سرفراز خان کے حصہ میں آئی جن کے پاس صرف ایک ڈویژن فوج تھی۔اس کا تناسب کچھ اس طرح بنتا تھا کہ ہمارے ایک جنرل کا مقابلہ بھارت کے تین جنرلوں سے تھا۔دشمن کے نو بریگیڈیئر ہمارے تین اور اس کے قریباً چار سو توپوں کے مقابلے میں صرف سو توپیں تھیں۔

جنگ کے دو ہی روز بعد دشمن نے اپنا پیرا ٹروپر بریگیڈ نمبر 50 بھی واہگہ کے میدان میں اتار دیا۔اب اس کی نفری 35 ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کا مقابلہ ہمارے پانچ ہزار سرفروشوں نے کرنا تھا۔

16 ستمبر 65ء کو لاہور بارڈر کے ایریا کمانڈر نے ''آرڈر آف دی ڈے'' جاری کیا۔

''پاکستانی فوج کے جوانو! آخری سپاہی......آخری گولی تک لڑو، سنگینوں سے، خالی ہاتھوں سے، ناخنوں سے لڑو اور دشمن کو نیست و نابود کر ڈالو، اپنے وطن کی زمین کا ایک انچ بھی دشمن کے ناپاک قدموں تلے نہ جانے دینا۔''

اس حکم نے جوانوں کے خون میں انگارے دوڑا دیئے۔ وہ جنونی کیفیت میں دشمن پر ٹوٹ پڑے اور واقعی تاریخ حریت کا وہ باب اپنے خون سے لکھ گئے جس کی سرخی اور عظمت ہمیشہ بڑھتی رہے گی۔

جنرل چوہدری نے اپنی نفری اور اسلحے کے زعم میں کہہ تھا کہ وہ 6 ستمبر کی صبح 9 بجے لاہور جم خانہ میں شراب کی پارٹی اڑائے گا، لیکن وہ بھول گیا تھا کہ اس کا مقابلہ کس قوم سے ہے۔

بھارتی ٹڈی دل کا پہلا ٹکراؤ سرحدی محافظوں سے ہوا جو اپنی تھری ناٹ تھری گنوں کے ساتھ دشمن کے آرمرڈ ڈویژنوں کے سامنے ڈٹ گئے اور اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلے جب تک کہ آہن پوش لشکری ان کے جسموں کو روندتے ہوئے نہ گزر گئے۔

اس دوران جنرل نے کچھ کمپنیاں نہر کے پار پہنچا دی تھیں جو سیسہ پلائی دیوار کی طرح غنیم کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ ان خدا کے پراسرار بندوں نے دشمن کو پہلے ہی باقاعدہ معرکے میں احساس دلا دیا کہ وہ ناقابل تسخیر ہیں۔ ایک ایک کر کے وہ کٹتے گئے۔ اپنے خون سے عظمت کردار کی گواہی دیتے ہوئے یہ شیر دل صف شکن جیالے دشمن کے حملے کا زور توڑ کر ڈوگرائی تک آ گئے۔

جنرل جانتا تھا کہ یہ لوگ مر جائیں گے لیکن اپنے قدم نہیں ہٹائیں گے۔ اس نے سختی سے جوانوں کو ڈوگرائی تک پسپائی اختیار کروائی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی توپ خانہ حرکت میں آ گیا۔ کرنل امداد علی کا نعرہ مستانہ گونجا اور توپچیوں کے ''اللہ اکبر'' کے فلک شگاف نعروں نے فضاؤں کا کلیجہ چھلنی کر دیا......ان کا سارا غضب ان کے گولوں میں سمٹ آیا اور ایڈوانس کرتے دشمن کے پیادہ دستے گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔

سورج نکلتے ہی فضائیہ کی امداد آ گئی۔ شاہینوں کی پہلی ''فارمیشن'' خدا کا عذاب بن کر لشکر ہنود پر ٹوٹنے کو فضا میں بلند ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کو علی الصبح سورہ انفعال کی یہ آیات لکھ کر پہنچا دی گئی تھیں۔

''اے نبی ﷺ! مومنین کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آئیں گے۔ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے۔

اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے۔ سو اگر تم میں سے آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔'' (انفعال 65/66)

لاہور کی فضاؤں میں پہنچتے ہی اس فارمیشن نے اپنے لیڈر کی کمان میں ''ساؤنڈ بیریئر'' کراس کیا اور لاہور کی مقدس فضاؤں کو سلامتی کا مژدہ سناتے آگے نکل گئے۔

غیظ و غضب کے عالم میں فضائیہ کے یہ شاہین آہن پوش لشکریوں سے ٹکرا گئے۔ وہ زمین سے بمشکل سو ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر رہ کر دیوانگی کی سی کیفیت میں دشمن پر اپنی گنوں سے آگ اگل رہے تھے۔

ڈوگرائی سے اٹاری اور راوی سائفن سے ہڈیارہ تک انہوں نے جی بھر کے شکار کھیلا اور دشمن کو سمجھا دیا کہ لاہور اس کا مرگھٹ تو بن سکتا ہے مسکن نہیں۔ سرحدی شہروں کے وہ لٹیرے جو بسیں بھر بھر کر لاہور کی طرف اڑے چلے آ رہے تھے کہ یہاں 47ء والے قتل عام اور لوٹ مار کی تاریخ ......

دہرائیں گے، اب ان کی لاشوں کے گرد گدھ منڈلانے لگے تھے۔

پاکستان کی آرٹلری، انفنٹری اور فضائیہ نے دشمن کو احساس دلا دیا تھا کہ اسے لاہور تک پہنچنے کے لیے یہ تین ڈویژن کتے کی موت مروانے پڑیں گے۔

باٹا پور کا پل دشمن کے لیے پل صراط بن گیا تھا......!

7 ستمبر کی صبح اس پل کو اڑا کر پاکستانی جیالوں نے بھارتی ہراول کی بدبختی پر آخری مہر ثبت کر دی اور 6 ستمبر کی صبح نو بجے لاہور جم خانہ میں جشن فتح منانے والوں کے لیے 7 ستمبر کی صبح اپنی لاشیں سمیٹنا ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ دشمن کے بڑے حملے کا دم ٹوٹ چکا تھا اور وہ محض کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق نئی نفری مروانے کے لیے میدان میں اتار رہا تھا۔

............☆☆☆............

عین ان لمحات میں جنرل سرفراز نے تاریخ حریت کا انتہائی خطرناک فیصلہ کیا اور بریگیڈیئر قیوم شیر کی کمان میں Stick Force (ریزرو فوج) کو دشمن پر جوابی حملے کا حکم دے دیا۔ یہ بڑا سنگین فیصلہ تھا کیونکہ محفوظ فوج کی نفری خطرناک حد تک کم تھی۔

8 ستمبر کی صبح حملہ آور فوج کے جیالے نہر پار کر گئے۔ انجینئرز نے ہنگامی پل بنا کر کچھ ٹینک بھی پار اتار دیے تھے۔ بریگیڈیئر قیوم شیر نے بھینی کی طرف سے واہگہ پر اور بریگیڈیئر آفتاب نے شمال سے طوطی، رانی اور شمشیر پوسٹوں پر سرفروشانہ یلغار کی۔

یہ یلغار اتنی تیز اور زوردار تھی کہ دشمن کے پندرھویں ڈویژن کا کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد اپنے ہیڈکوارٹر کی چار جیپیں جن میں اس کی ذاتی جیپ بھی شامل تھی مع جنگی دستاویزات بھسین کے قریب چھوڑ کر بھاگ گیا اور ہماری محفوظ فوج نے بی آر بی کے پار مورچے قائم کر لیے۔ ڈوگرائی پر قبضہ کر کے ڈیڑھ میل آگے اپنا مورچہ بنا لیا۔ فائر بندی تک دشمن نے اس مورچے پر چھبیس حملے کیے اور اپنی کئی پلٹنیں اور ٹینک اس ناقابل تسخیر مورچے کی فتح کے لیے واصل جہنم کروا لیے، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ہڈیارہ میں بھارتی سورمے گھونڈی اور ہڈیارہ کے دیہاتیوں کا قتل عام کر کے اپنی بدبختی کا رونا رو رہے تھے۔ جب بریگیڈیئر اصغر نے دو بٹالین فوج کے ساتھ دشمن کے پورے ڈویژن کو للکارا۔

میجر شفقت بلوچ نے ہڈیارہ نالے پر دشمن کو روک لیا اور کرنل نواز کا توپخانہ دشمن پر آگ برسانے لگا۔ ہمارے او۔ پی نے دشمن کے عین درمیان گھس کر ایمونیشن سے بھرے ٹرکوں کو نشانہ بنوا دیا۔ یہ ٹرک ہڈیارہ نالے کے پل پر سے گزر رہے تھے جب ان پر قیامت ٹوٹی جس سے پل بند ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی بچ جانے والے پلوں کی حفاظت کے لیے فرنٹیئر فورس کی آر آر جیپیں اور مشین گنیں پوزیشن میں چلی گئیں......اور میجر شفقت بلوچ کو نہر پار کر آنے کا حکم مل گیا۔ دشمن کے سامنے ہڈیارہ سے برکی تک کا سارا علاقہ پڑا تھا، لیکن جہاں کہیں اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی، مستعد اور بیدار او۔ پی پوسٹوں نے اسے توپ خانے کی مدد سے کچل کر رکھ دیا۔

10 ستمبر کو برکی پر دشمن کا حملہ اب تک کے بھرپور حملوں میں سے ایک تھا۔ دشمن کے ٹینک اور انفنٹری برکی کے اندر گھس آئی۔ توپ خانے

کے صوبیدار شیر دل اور میجر عزیز بھٹی نے ایک چوبارے پر آبزرویشن پوسٹ قائم کر کے اتنی موثر گولہ باری کروائی کہ دشمن کی ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ افسر بھی مارا گیا اور برکی گلیاں اس کے پیادہ سپاہیوں کی لاشوں سے اٹ گئیں۔ بے شمار جلتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرکوں نے بچے کھچے زخمیوں کو بھی بھسم کر ڈالا۔ یہیں جنگ ستمبر کا پہلا نشان حیدر میجر عزیز بھٹی کا مقدر بنا۔

یہ پاکستانی فوج کے صف شکنوں کا جنون تھا کہ وہ جہاں جم گئے، وہاں سے موت بھی انہیں نہیں ہلا سکی۔ وہ رات اپنے دامن میں انسانی عظمت و کردار اور جان نثاری کی سینکڑوں داستانیں لے وقت کی گرد میں کھو گئی۔

اس معرکے کے بعد دشمن نے لاشعوری طور پر اپنی ناکامی تسلیم کر لی تھی کیونکہ اس کے بعد وہ بزدلوں کی طرح مورچوں میں بیٹھ کر گولہ باری ہی کرتا رہا، کبھی باہر نکل کر ایڈوانس کی جرأت نہ کر سکا۔

عشق کا شین (II)

کتاب گھر پر **عشق کا عین** اور **عشق کا شین** پیش کرنے کے بعد اب پیش کرتے ہیں **عشق کا شین (II)** عشق مجازی کے ریگزاروں سے عشق حقیقی کے گلزاروں تک کے سفر کی روداد...... امجد جاوید کی لازوال تحریر۔ **عشق کا شین (II)** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

عشق کا شین (III)

عشق کا عین اور **عشق کا شین** کے بعد کتاب گھر اپنے قارئین کے لیے جلد پیش کرے گا...... **عشق کا شین (III)**۔ ناول ایک مکمل کہانی ہے۔ امجد جاوید کی لازوال تحریروں میں سے ایک بہترین انتخاب۔ **عشق کا شین (III)** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

آپریشن نیپال

بھارتی سورما اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ 72 گھنٹے کے اندر پاکستانی فوج کو مکمل مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔ اس لیے سیالکوٹ پر حملہ اڑتالیس گھنٹے بعد کیا گیا۔ جو آپریشن آرڈر انہیں جاری ہوئے تھے ان کی رو سے حملہ آور فوج کو سیالکوٹ کا دفاع کچل کر گوجرانوالا اور وزیر آباد کے درمیان جی ٹی روڈ کو کاٹ کر چناب تک کے علاقے پر قابض ہونا تھا۔

جنرل چوہدری اسی خوش فہمی کا شکار تھا کہ اول تو دو دن میں لاہور فرنٹ پر وہ پاکستانی فوج کی مدافعت مکمل ختم کر چکا ہو گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو سیالکوٹ کا حملہ آور ڈویژن ایک انفنٹری اور ماؤنٹین ڈویژن کی مدد سے لاہور کے دفاع پر عقب سے حملہ آور ہو گا۔

بھارتی کمانڈر انچیف جنگی نقطہ نگاہ سے ایسی سوچ میں حق بجانب تھا۔ دنیا کا کوئی جنگی مبصر بھی اس کی جگہ یہی رائے قائم کرتا، لیکن وہ یہ بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ گوشت پوست کے انسانوں سے نہیں، آہنی ارادوں کے مالک ان صف شکنوں سے ہے جو سرحدوں پر زندہ رہنے کی تمنا لے کر نہیں آئے تھے...... ورنہ اتنا زبردست حملہ اتنی قلیل تعداد اور نامکمل اسلحے کے ساتھ روک لینا کسی انسانی گروہ کے بس کی بات نہیں تھی۔

جنرل چوہدری نے سیالکوٹ پر تاخیر سے حملہ اس لیے کیا تھا کہ اپنی دانست میں وہ اس دوران پاکستانی ٹینک سکواڈرنوں کو لاہور، بیدیاں اور قصور کے دفاع پر بکھیر چکا ہو گا اور اس کے "آہنی ہاتھیوں" کے مقابلے میں پاکستان کی ایک آدھ ٹینک رجمنٹ کیا کرے گی؟ اس نے دوسری چال یہ چلی کہ جنگ کے میدان کو پھیلاتا چلا گیا اور سیالکوٹ کے شمال سے جسڑ تک لڑائی کو پھیلا دیا۔ یہ سارا میدانی علاقہ یوں بھی ٹینکوں کی جنگ کے لیے بڑا موزوں تھا۔ سیالکوٹ کے محاذ پر دشمن کے کلیجے میں خنجر گھونپنے کی سعادت جنرل ابرار حسین کے حصے میں آئی جن کی کمان میں بریگیڈیئر عبدالعلی، بریگیڈیئر نیازی، بریگیڈیئر مظفر الدین اور نامکمل بریگیڈیئروں کے ساتھ انٹیلی جنس کی اطلاعات پر دشمن کے استقبال کو موجود تھے۔

7 ستمبر کو اطلاع ملی کہ دشمن ساہیا کے علاقے میں اپنا بکتر بند ڈویژن جمع کر رہا ہے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی نے "ریکی پٹرول" رات کو اس طرف روانہ کر دی جس نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کے مورچوں سے گزرنے کے بعد واپس آ کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ انٹیلی جنس کی اطلاعات صحیح ہیں۔

فوراً پاک فضائیہ حرکت میں آئی اور دشمن کے ساہیا میں جمع ہونے والے بکتر بند ڈویژن کو وہیں دانوں کی طرح بھون کر رکھ دیا۔ یہ حملہ اتنا جارحانہ اور تیز تھا کہ دشمن بھونچکا رہ گیا اور شاہین اپنا کام کر کے واپس چلے آئے۔

اس دوران دشمن ظفر وال کے علاقے میں "حملے کا دھوکہ" دیتا رہا، لیکن جنرل نیازی اس کی چال میں آنے کو تیار نہ ہوئے۔

دشمن کو اس کی اصلیت کا احساس دلانے کے لیے بریگیڈیئر مظفر الدین کے سربلند اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور اس کی قلعہ بندیاں روندتے ہوئے جسڑ پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے جسڑ کا پل اڑا کر چوہدری کے سورماؤں کی "دھوکے کی چال" کو بھارتی علاقے میں ہی دفن کر دیا۔

اس بکتر بند ڈویژن کو اپنے ارادوں سمیت وہیں موت کی نیند سلا کر بریگیڈیئر مظفر نے سیالکوٹ اور لاہور سیکٹر کو ''دھوکے'' کی زد سے محفوظ کر لیا۔ اس دوران چھمب کی قلعہ بندیاں زمین بوس کرنے والے توپ خانے کا بڑا حصہ بریگیڈیئر امجد علی چوہدری کی کمان میں سیالکوٹ کی حفاظت کے لیے واپس آ گیا۔

چھ سو ٹینکوں کے ساتھ جنرل راجندر سنگھ کو سیالکوٹ پر بھیجا گیا جس نے صحرائے العالمین (دوسری جنگ عظیم) میں جنرل رومیل کی جنگی چالوں کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور خود کو ٹینکوں کی لڑائی کا چیمپئن سمجھتا تھا۔

یہ بیوقوف جنرل بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ جنرل ابرار حسین سے ہے جس کا ہیرو سعد بن ابی وقاصؓ ایسا جرنیل تھا جس نے قادسیہ کے میدان میں ایسے ہی ''اصحاب فیل کے لشکر'' کو روندتے ہوئے تاریخ حریت کا وہ باب لکھا تھا جو آج حربی تاریخ میں سنہرا باب ہے۔

دشمن کا پہلا ٹکراؤ بریگیڈیئر عبدالعلی سے ہوا جنہیں انٹیلی جنس رپورٹ ملی تھی کہ دشمن معراجکے پر چڑھ آیا ہے۔ بریگیڈیئر پچھلے تیس گھنٹوں سے مسلسل بیداری کی حالت میں تھے اور پچھلی ہی رات زبردست لڑائی سے ان کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی نے وائرلیس پر اپنے ٹینک کمانڈر کو چائے کی پیالی کا لمبا گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے حکم دیا تھا۔

''دشمن کا حملہ پھلورا کی طرف سے آ رہا ہے۔ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے آگے نکلو اور دشمن کو برباد کر دو۔''

اس دوران رینجرز اور فرنٹیئر فورس کے جوان دشمن کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو چکے تھے، لیکن آہنی قلعوں کی مدد سے دشمن اس دیوار میں شگاف ڈالتا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

عبدالعلی نے انٹیلی جنس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ ''حملے کی قوت'' کتنی ہے۔ انہوں نے دوسرا حکم کرنل جمشید کو دیا کہ وہ اپنی ٹینک رجمنٹ کے ساتھ پیچھے آ کر چونڈہ کو مرکز دفاع بنا لیں۔

یہ خودکشی کی حد تک دلیرانہ حکم تھا، لیکن سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

8 ستمبر کی صبح طلوع ہونے تک دشمن کے سیاہ ہاتھ معراجکے سے نخنال تک زمین پر حشرات الارض کی طرح پھیل چکے تھے۔ اس ٹڈی دل کا صفایا کرنے کے لیے بریگیڈیئر عبدالعلی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور دنیائے حرب کا دلیرانہ حکم جاری کیا۔ آرٹلری کے ساتھ انفنٹری کو بھی حکم جاری ہو گیا۔

''آگے بڑھو اور دشمن کو نیست و نابود کر دو۔''

25 کیولری کے تین سکواڈرن بھارتی آرمرڈ ڈویژن کا سر کچلنے کے لیے اپنی کمین گاہوں سے نکلے۔ اس کے ساتھ ہی 14 بلوچ رجمنٹ کرنل شنواری کی کمان میں کفن بردوش میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گئی۔

میجر محمد احمد کے سکواڈرن کو پھلورا کے قریب دشمن کے مست ہاتھیوں کی آنکھیں پھوڑنے کا حکم ملا اور جوش غضب میں وہ جنگی ترتیب کو بالائے طاق رکھ کر دشمن کے عین سامنے اس سے ٹکرا گیا۔ اس کے جان نثاروں نے اپنے سردار کے جذبہ شجاعت کی لاج رکھی اور دشمن کے سامنے

آگ، لوہے اور خون کی دیوار تان کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی شاہبازوں کی دھاڑیں گونجیں اور تین طیاروں کی پہلوؤں سے جھانکتی گنوں سے دشمن کے ٹینکوں پر راکٹ پھٹنے لگے۔

چونڈہ کے میدان کے سینے پر سرفروشوں کے خون سے دنیائے حرب وضرب کی انمٹ داستان رقم ہونے لگی۔ میجر احمد کا ٹینک ہٹ ہوا۔ وہ دوسرے میں پہنچ گئے...... پھر تیسرے میں! ان کا جسم زخموں سے چور چور اور وردی خون میں رنگین ہو رہی تھی، لیکن جیتے جی سکواڈرن کمانڈر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ میجر احمد کو بیہوشی کی حالت میں زبردستی پیچھے لے جایا گیا اور کیپٹن فرخ خان نے ان کی جگہ سنبھالی۔

میجر آفندی کے ٹینک ڈگری اور تھڑو سے دشمن پر نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے یلغار کر رہے تھے۔ انہوں نے دشمن کی 17 پونا ہارس کو وہ سبق سکھایا کہ انہیں اپنی ٹریننگ بدلنے پر مجبور کر دیا اور اس جنگ کے بعد سے دشمن نے اپنے ٹینک رسالوں کے تربیتی نظام کا ازسرنو جائزہ لے کر اس کی اصلاح کی تھی۔

تیسرا اسکواڈرن میجر رضا خان کی کمان میں نعرہ تکبیر بلند کرتا دونوں پہلوؤں سے مصروف جنگ سکواڈرن کی مدد کو پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ہی مورچہ بند 2 پنجاب رجمنٹ کے میجر محمد حسین نے جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، اپنے گوشت پوست کے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کی آہنی دیواروں میں راستہ بناتے ہوئے نکلیں اور اس کو بتا دیں کہ ہم بدر کے سپاہی ہیں اور تیرہ سو سال پرانی تاریخ دہراتے ہیں۔

اس حکم کو پاگل پن کی انتہا کہا گیا، لیکن خدائے وحدہ لاشریک کی قسم! اگر چونڈہ کے میدان میں ایسے پاگل موجود نہ ہوتے تو دشمن کے بھیڑیے معصوم پاکستانیوں کی رگوں سے خون نچوڑ لیتے۔

سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کے جیالے جیپوں میں آر آر گنیں لگا کر دشمن کے ٹینکوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ راکٹ لانچر کندھوں پر اٹھائے سربلند غازی میدان کارزار میں دشمن کے سامنے لیٹ گئے تھے۔

اس منظر نے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کا مقابلہ انسانوں سے نہیں، یہ تو کسی اور ہی عالم کی کوئی مخلوق ہیں۔

ملک وملت کے لیے قربانی کا یہ عظیم الشان مظاہرہ انسانی فہم وادراک سے بالاتر تھا۔

غنیم کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے آہنی قلعے زمین بوس ہونے لگے۔ گوشت پوست کے انسان ہاتھوں میں گرنیڈ پکڑے، دشمن کے انتہائی نزدیک پہنچ کر اس کے ٹینکوں پر گرنیڈ پھینکتے اور خود بھی واصل حق ہو جاتے۔

میجر حسین نے اس پر بس نہیں کی...... انہوں نے ٹینک سکواڈرن کے میجر رضا سے مشاورت کی اور بریگیڈئر عبدالعلی کی اجازت ملنے پر دشمن پر جوابی حملہ کر دیا۔ انفنٹری ایڈوانس کر رہی تھی اور میجر رضا کے ٹینک ان کے سروں پر سے دشمن پر گولہ باری کر رہے تھے۔

یہ معرکہ ہرگز انسانی نہیں تھا۔ اس لمحے ان غازیوں میں کوئی پراسرار قوت سما گئی تھی۔ دشمن اٹھارہ سال تیاری کرنے کے بعد اپنے بد باطن ارادوں کو عملی جامہ پہنانے آیا تھا، لیکن وہ بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ عام انسانوں سے نہیں۔

ایڈوانس کرتے تھرڈ بلوچ کے حوالدار نے گلا پھاڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''پاکستانیو! آج بے غیرت نہ ہو جانا۔''

ایک اور مورچے سے کوئی خدا کا شیر گرجا۔

''مسلمانو! جس نے آج پیٹھ دکھائی اس پر خدا کا غضب ہوگا۔ بخدا وہ اپنے باپ کا جنا نہیں۔''

اس للکار نے سربلندوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ وہ بے نام جیالے کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے جنہوں نے بدر و حنین کے جانبازوں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ہم نہیں جانتے...... لیکن وہ ہماری تاریخ کا مان ہے۔ ایک عالم نے ان کی سرفروشیوں کو نذر عقیدت کی۔

چونڈہ کے چپے چپے پر بکھرے خون کی ایک ایک بوند اپنے دامن میں ہزاروں شجاعت و حریت کی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ سیالکوٹ کے میدانوں کی ہریالی کو ان خدا کے پراسرار بندوں نے اپنے خون سے سیرابی بخشی تھی۔

نعرہ کبیر بلند کرتے یہ دیوانے معرا جلے میں اپنے خون سے طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک وہ کہانی لکھ گئے جو تاریخ کے سینے پر ہمیشہ جگمگ جگمگ کرتی رہے گی۔

انہوں نے ابتدا ہی میں دشمن کی کمر توڑ دی اور دنیا کے ماہرین حرب وضرب نے اپنی زبان دانتوں تلے دبالی کیونکہ وہ اس ''معجزے'' پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔

جنگ کے آخری لمحات تک غازیان صف شکن شجاعت و ہمت کی ایسی داستانیں رقم کرتے رہے اور انہوں نے ''آپریشن نیپال'' کو دہلی کے جی ایچ کیو کی فائلوں ہی میں موت کی نیند سلا دیا۔

..........☆☆☆..........

دوسرے محاذوں پر بھی دشمن کا یہی حشر ہوا۔

کھیم کرن، راجستھان کا ہزاروں مربع میل علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور عین ان لمحات میں جب یہ جیالے دشمن کی کمر توڑنے کے بعد اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے آگے بڑھنے والے تھے، پاکستانی سٹرائیک فورسز تیار کھڑی تھیں، سیاسی بازی گر میدان میں اتر آئے۔

ان سیاسی بندروں نے میدان کارزار میں جیتا ہوا معرکہ تاشقند کی میز پر ہار دیا اور وہ قربانیاں اپنا مول چکانے سے محروم رہیں جو شہیدوں نے اپنی ملت، مذہب اور ملک کے لیے دی تھیں۔

آخری حصار

سری نگر کے چپے چپے سے شیرو کی پرانی آشنائی تھی۔

......یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ زندگی میں دوبارہ اس جگہ آئے گا یا کبھی کشمیر کی جنگ آزادی میں حصہ بھی لے گا کیونکہ اس نے اپنی دانست میں اپنے اندر سوئے شیرو کو مار ڈالا تھا، لیکن آج جس طرح انگڑائی لے کر وہ دوبارہ بیدار ہوا...... یہ اس کے گمان میں نہیں آ سکتا تھا۔

کیپٹن اشرف خان اور اس کے پانچ ساتھیوں کی راہنمائی کے فرائض اسے سونپے گئے تھے۔

ان لوگوں نے بارہ مولا کے راستے سرحد عبور کی تھی اور سری نگر تک وہ بغیر کوئی فائر کیے پہنچ چکے تھے۔ کیپٹن اشرف خان کو جس ٹھکانے پر پہنچنے کی ہدایت ملی تھی، وہ ٹھکانہ ان لوگوں کی آمد سے پہلے ہی دشمن کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اب اسے تمام اقدامات اپنی فراست کے ساتھ انجام دینے تھے۔ وہ لوگ یہاں سبوتاژ کارروائیوں کے لیے آئے تھے۔ سری نگر کا محلّہ ''بٹ مالو'' ان کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔

یہاں آ کر شیرو کے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔ اسے علم ہوا تھا کہ نبی خان اور اس کے بہت سے پیارے اس معرکے میں جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ آسیہ کے بھائی سری نگر چھوڑ کر مہاراشٹر کی طرف نکل گئے تھے۔

وہ ان مقامات پر دیوانہ وار گھومتا رہا جو کبھی اس کی آماجگاہ رہے تھے۔ اس کی بے تاب نگاہوں نے اس زمین کے چپے چپے کو بوسہ دیا جہاں اس کی معصوم بچی اور بے گناہ بیوی کا خون بہایا گیا تھا۔

یہاں کی ہواؤں سے اسے اپنی بچی اور بیوی کے خون کی مہک آ رہی تھی، لیکن آج وہ مجبور اور بے کس نہ تھا۔ اس نے سوچا: ''آج وہ اکیلا نہیں۔ وہ آج پاکستانی فوج کے ایک سپاہی کی حیثیت سے یہاں آیا ہے۔ اب وہ گن گن کر اپنے پیاروں کی موت کا بدلہ لے گا...... اس نے سوچا: ''آسیہ، عاکفہ اور اس کی ماں اور دوسرے شہید ساتھیوں کی روحیں کتنی خوش ہوں گی آج۔''

ہر روز شیرو کی رہنمائی میں پاکستانی کمانڈوز کی ٹولیاں رات ڈھلتے ہی اپنے مشن پر نکلتیں اور صبح ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دے کر واپس آ جاتیں۔ یہ کام وہ اکیلے ہی نہیں، وہاں موجود حریت پسندوں کے بہت سے گروپ کر رہے تھے۔ ان کے کارناموں سے ایک عالم باخبر تھا۔ پاکستان کے جی ایچ کیو میں ان کی جان نثاریوں کی رپورٹیں مرتب ہو رہی تھیں۔ 5 ستمبر سے 23 ستمبر تک انہوں نے دنیائے حریت کے وہ انمٹ باب نقش کر دیے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

اسی رات فائر بندی ہو گئی اور جیالوں کو جنھوں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر ہر قسم کی مدد سے بے نیاز انتہائی سنگین حالات اور منافقانہ ماحول میں جنگ جاری رکھی ہوئی تھی اور جنھوں نے اب اپنے قدم خاصے مضبوط کر لیے تھے، اچانک حکم ملا کہ اپنے مستقر پر واپس آ جائیں۔ انہوں نے یہ کامیابیاں یونہی حاصل نہیں کی تھیں۔ بمشکل گنتی کے چند خوش قسمت ہی زندہ لوٹے تھے۔ ان کے تین چوتھائی ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ خود شیرو

اور اس کے ساتھیوں کا یہ عالم تھا کہ کیپٹن اشرف خان اور ایک نائیک زندہ بچے تھے۔ یہ نائیک بھی زخمی تھا۔ گولی اس کے بازو سے گزر گئی تھی۔ باقی تمام ساتھی مختلف مہموں میں اپنی جانوں کا نذرانہ کشمیر کی آزادی کو پیش کر چکے تھے۔

مقبوضہ کشمیر سے جو لوگ اس جہاد آزادی میں حصہ لے رہے تھے، ان کے متعلق سب کو علم تھا کہ وہ تو زندہ درگور ہو کر رہ گئے تھے...... پاکستانی انہیں دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا رہے تھے اور دشمن ان کے ساتھ جو سلوک کرنے والا تھا، اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

...........☆☆☆...........

جنگ بندی کے ساتھ ہی دشمن نے اپنی انتقامی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ سری نگر میں پاکستانی کمانڈوز کی جائے پناہ ''بٹ مالو'' شروع ہی سے ان کی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ 23 ستمبر کی رات کو بھارت کی 2 بٹالین فوج نے اس سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے کر مقامی لوگوں کو وارننگ دی کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں چھپے ہوئے تمام پاکستانی کمانڈوز اور ان کے حمایتیوں کو بھارتی فوج کے سامنے پیش کر دیں ورنہ اس سارے علاقے کو تہس نہس کر دیا جائے گا۔

آفرین ہے خدا کے ان پراسرار بندوں پر کہ انہوں نے کسی بھی پاکستانی کمانڈو کو پیش کرنے سے انکار کر دیا اور پاکستانی کمانڈوز کی مدد سے مکانوں میں مورچے قائم کر لیے۔ مطلوبہ مدت گزرنے پر بھارتی فوج حرکت میں آگئی۔ اس نے اس علاقے پر گولہ باری شروع کر دی۔

محصور سرفروش جی جان سے لڑے، لیکن یہاں مقابلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بھارتی سورماؤں نے بٹ مالو کو اس کے ہزاروں مکینوں سمیت، جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی، راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ انہوں نے کسی ایک شہری کو بھی زندہ بچ کر نکل جانے کا موقع نہ دیا اور جی بھر کے خون کی ہولی کھیلنے کے بعد اس علاقے پر بلڈوزر چلا کر زمین بوس کر دیا۔

بربریت کا یہ مظاہرہ دنیا کے پریس نے دیکھا اور اسے تصویروں سمیت شائع کیا، لیکن عالمی ضمیر نہ جاگا۔ سوائے اکا دکا بے بس آوازوں کے اور کوئی آواز ان کے حق میں بلند نہ ہوئی۔

شیرو اور اس کے ساتھیوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس رات ''بٹ مالو'' میں موجود نہیں تھے۔

...........☆☆☆...........

شیرو کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے ہر معرکے میں ان کا ساتھی رہا تھا۔ اس مرتبہ جس تیزی کے ساتھ سارے کشمیر میں جنگ کا شعلہ بھڑکا تھا، اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اس کے کشمیر کو غلام نہیں رکھ سکتی، لیکن اس مرتبہ اس کے خواب کی تعبیر اتنی بھیانک تھی کہ اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ وحشیوں اور دیوانوں کی طرح وہ اپنی بوٹیاں نوچ کر رہ گیا۔

......اس نے کئی بار شرفو کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں اسے دوبارہ کشمیر لے کر آیا تھا؟

شرفو کے پاس اس کے ان جلتے ہوئے اور جلا دینے والے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خود وہ دیوانوں کی طرح فضاؤں میں بے مقصد گھورتا رہتا اور شیرو کے بضد ہونے پر صرف ایک ہی بات کہہ دیتا۔ ''شیرو! ہم سپاہی ہیں۔ ہمارا کام سوچنا نہیں، عمل کرنا ہے۔ جیسا حکم ہمیں ملے گا ویسی ہی تعمیل ہم کریں گے۔''

''لیکن میں تو انسان ہوں۔ میرے احساسات تو زندہ ہیں۔ پتھر کا بت نہیں ہوں میں۔''

اور جواب میں شرفو اپنی لال انگارہ آنکھوں سے جو پچھلے ڈیڑھ ماہ کی شب بیداریوں، تھکا دٹوں ریاضتوں اور جان سپاریوں کا منہ بولتا ثبوت تھیں، اسے گھور کر رہ جاتا۔

وہ لوگ دن کو کہیں چھپے رہتے اور رات کو سفر کرتے...... تینوں آہستہ آہستہ پتھر کے انسان بن چکے تھے۔ ان کا تیسرا ساتھی تو بالکل ہی گونگا ہو گیا تھا۔ شرفو کو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ سانحہ جو اس نائیک کی موجودگی میں مقبوضہ کشمیر پر گزر رہا ہے، ایک نہ ایک دن اس کی جان لے کر ہی ٹلے گا۔ ان تینوں میں نارمل آدمی کسی حد تک اگر تھا تو کیپٹن اشرف خان۔

شرفو کے لاکھ بضد ہونے پر بھی روانگی سے پہلے وہ زہراں سے نہیں ملا تھا۔ اس نے یہ کام واپسی کیلئے رکھا ہوا تھا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زہراں کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا اور کیپٹن اشرف خان یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر شیرو اس کی بیوی سے ملنا کیوں نہیں چاہتا؟

وہ شیرو کی توجہ بٹانے کے لیے اکثر اس سے اپنے دونوں بیٹوں خالد اور طارق کی باتیں کرنے لگتا تھا۔ اس نے شیرو کو پونچھ سے بچھڑنے سے اب تک کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی تھی۔ اپنے اور زہراں کے متعلق ایک ایک بات اس نے شیرو کو بتا دی تھی۔ صرف شیرو کے زندہ ہونے کی اطلاع پر زہراں کے ردعمل سے اس نے شیرو کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ شیرو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

..........☆☆☆..........

بارہ مولا تک کا سفر عافیت سے طے ہو گیا۔ اب انہیں ''پل صراط'' عبور کرنا تھا۔

...... بھارتی سورما جانتے تھے کہ پاکستانی کمانڈوز کو اب واپس جانا ہے۔ انہوں نے تمام سرحدی علاقے پر چپل کران کے ''استقبال'' کی تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔

سدھائے ہوئے کتوں کی زنجیریں ہاتھوں میں تھامے وہ ان ''گھس پیٹھیوں'' (کمانڈوز) کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ حشرات الارض کی طرح پہاڑی سلسلوں کے چپے چپے پر رینگ رہے تھے۔ خون آشام بھیڑیوں کی طرح اپنی سرخ اور لمبی زبانیں باہر لٹکائے ان ''بدقسمت غازیوں'' کے منتظر تھے جو لاکھ خواہش کے باوجود ''مرتبہ شہادت'' سے سرفراز نہ ہو سکے تھے۔

انہیں مسلسل سفر کرتے آج تیسرا دن تھا۔ شام کے وقت ایک سرحدی علاقے میں تینوں ایک پہاڑی کھوہ میں چھپے ہوئے تھے۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔'' شیرو نے سورج کو پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوتے دیکھ کر کہا۔

اس کی بات کا جواب دیئے بغیر شرفو نے اپنے نائیک کی طرف دیکھا۔ ''او کے جوان تیار......؟''

''یس سر!'' نائیک نے مستعد فوجیوں کی طرح دونوں ایڑیاں بجائیں۔

اس کا ایک ہاتھ قریباً ناکارہ ہو چکا تھا، لیکن اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر وہ بالکل نارمل آدمیوں کی طرح ان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

''ایک بات ہے سر!'' اچانک ہی اس نے کیپٹن اشرف خان کو مخاطب کیا۔

''ہوں؟''

''سر! ادھر سری نگر میں اپنے سیکشن کے تمام جوان شہید ہو گئے۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے واپس جانا۔ ہم اپنی کمپنی کے سنگیوں (ساتھیوں) کو کیا منہ دکھائیں گے سر!'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''جوان! حوصلہ کرو۔'' وہ بہرحال اس کا کیپٹن تھا۔ ''سب اللہ کی مرضی کے مطابق ہوا۔ ممکن ہے قدرت نے ہمیں کسی اگلے معرکے کے لیے زندہ بچا رکھا ہو۔ ہم پھر آئیں گے۔ خدائے وحدہ لاشریک کی قسم! اگر ہماری مائیں بے غیرت نہیں تھیں اور ہم نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے تو ہم ''بٹ مالو کے شہداء'' کا انتقام ضرور لیں گے...... ہم کشمیر کو درندوں سے پاک کر کے دم لیں گے۔''

اور اس کے جوان نے سر جھکا کر اس کی بات پر صاد کر دیا۔

شیروان دونوں سے...... ماحول سے، حالات سے بالکل لاتعلق ان کی طرف پیٹھ موڑے خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے اپنا کھویا ہوا نشیمن تلاش کر رہا تھا۔

......اس کے عقب میں سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک پراسراری ہوا پورب کی سمت سے سیٹیاں بجاتی درختوں اور ماحول کا سینہ چھیدتی آہستہ آہستہ پچھم کی سمت بہنے لگی تھی۔ ان کے چاروں اطراف پھیلے چیڑھ اور دیودار کے درخت زور زور سے ان کی بربادی اور الم نصیبی کا ماتم کرنے لگے تھے۔ انسانیت کی بے حسی اور کشمیر کی بدنصیبی پر بوڑھا آسمان آنسو بہانے لگا تھا اور بادلوں کے وہ سیاہ ٹکڑے جوان کا مقدر بن کر تینوں کے سروں پر سایہ فگن ہو گئے تھے، اب بوند بوند لہو ٹپکانے لگے۔ پھر آسمان کا کلیجہ شق ہوا اور ایک کوندا لپکا۔ اس کے ساتھ ہی موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ انہوں نے اپنے لمبے کوٹ پہن لیے اور کھوہ کے منہ پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

''چلنا چاہیے۔'' شیرو نے زور دے کر یہ لفظ ادا کیے تھے۔ اس کے حلق میں کوئی پھانس سی اٹک گئی تھی اور اسے کئی مرتبہ اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

''جوان! اگر دشمن سے مقابلہ ہوا تو میں تمہیں کور دوں گا۔ تم لوگ پیچھے نکلو گے۔ میرا انتظار پندرہ منٹ کرنا ہے۔ اس کے بعد خود سرحد پار کرنے کی کوشش کرنا۔ گرفتار ہو جاؤ تو دشمن کو اپنا اور رینک کے سوا کچھ نہ بتانا۔'' کیپٹن اشرف فارمیشن میں آ گیا۔

شیرو اسٹین گن تھامے ان دونوں کے آگے چل رہا تھا۔ درمیان میں انہوں نے زخمی نائیک کو کور دیا ہوا تھا۔ جس نے اپنا زخمی بازو گلے میں بندھے گن سلنگ میں لٹکا رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ اپنے پوچ کے بالکل اوپر رکھا ہوا تھا تا کہ کسی بھی لمحے وہ ہینڈ گرنیڈ نکال کر پھینک سکے۔

اپنی دانست میں شیرو انہیں بہت محفوظ راستے پر لے جا رہا تھا۔ رات گہری ہونے لگی تھی۔ بارش کا سلسلہ اب تھم چکا تھا۔ آسمان کی سیاہیوں میں سے ڈرتے ڈرتے کبھی کبھی چاند ان کی طرف جھانک لیتا، لیکن پھر اپنا منہ اندھیروں میں چھپا کر روپوش ہو جاتا۔ اچانک ہی جیسے اس اندھیرے میں سورج نکل آیا۔ یکدم آٹھ دس زبردست دھماکے ہوئے اور فضاؤں میں آگ لگ گئی...... دشمن اچانک روشنی راؤنڈ فائر کر کے ماحول کو ننگا کر دیا تھا۔

''کم آن......دس وے۔'' کیپٹن اشرف خان نے دونوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں گن تھامے ہوئے بائیں ہاتھ ایک ٹیکری کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بندر کی سی پھرتی سے ایک دوسرے کے تعاقب میں اس کے پیچھے ہو گئے۔ ''تم دونوں آہستہ آہستہ پیچھے نکلو۔'' شرفو نے سرگوشی کی۔

''سر!'' اس کے نائیک نے سسکاری لی۔

''موو!'' اشرف خان کی سرگوشی میں تنبیہ بھی موجود تھی۔

''شیرو!!'' شیرو نے کچھ کہنا چاہا۔

''شیرو خدا کے لیے! وقت کم ہے...... بحث نہ کرنا۔''

''ہینڈز اپ! تم لوگ ہر طرف سے گھیرے میں آچکے ہو۔'' کسی نے ماؤتھ ایمپلی فائر سے کہا۔

''نکلو!!'' شرفو کے منہ سے بمشکل نکلا۔

دونوں بادل نخواستہ اس کی آڑ میں چھپتے ہوئے پیچھے نکلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مشین گن چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولیاں اس ٹیکری سے ٹکرا کر بڑی ڈراؤنی سیٹی بجاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

دونوں جھکے جھکے بھاگتے چلے آرہے تھے۔ ایک قدرے محفوظ مقام پر اسی طرح کی ٹیکری کے پیچھے وہ رک گئے کیونکہ اب فائرنگ کی آوازوں میں شرفو کی اسٹین گن کی ''ریٹ ٹٹ'' بھی سنائی دینے لگی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے دو زوردار دھماکے ہوئے، شاید شرفو نے ہینڈ گرنیڈ پھینکے تھے۔

دونوں بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ کچھ دیر کے لیے فائرنگ کا سلسلہ رک گیا تھا۔

...... دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد انہیں ایک سایہ اپنی طرف زمین سے چپکا رینگ رینگ کر آتا دکھائی دیا۔ شیرو نے دیوانہ وار اپنی جگہ سے جست لگائی اور سائے کے قریب جا گرا۔

''شرفو...... خیریت تو ہے......؟'' اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔'' کہتے ہوئے شرفو نے اٹھ کر کھڑے ہونا چاہا، لیکن چند انچ اوپر اٹھنے کے بعد ہی وہ منہ کے بل آگے کو جا گرا۔

شیرو نے بجلی کی سی پھرتی سے جھک کر اسے اٹھایا اور قریباً گھسیٹتا ہوا اسے اسی ٹیکری کے پیچھے لے آیا۔

نائیک اپنے کیپٹن صاحب کی حالت پر تڑپ اٹھا۔ شرفو کو کوئی کاری زخم لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوبارہ فائرنگ شروع ہوگئی۔

''آؤ نکلیں یہاں سے۔'' شیرو نے نائیک کو مخاطب کیا اور شرفو کے ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود اسے اپنے کندھے پر ڈال کر جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کے اس سلسلے میں جا گھسا جس کا اختتام سرحد پر ہوتا تھا۔

ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے شرفو کو زمین پر لٹا دیا۔ اس کے کوٹ کے بٹن کھولے تو سینے پر لہو کا دریا تیرتا دکھائی دیا۔

''سر......! سر......!'' اس کا نائیک سسک پڑا۔

''فیلڈ پٹی نکالو۔'' شیرو نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نائیک سے کہا۔

اس نے شرفو کی قمیض سامنے سے پھاڑ ڈالی۔ اس کے سینے پر ایک گہرا گھاؤ شیرو کا منہ چڑا رہا تھا۔ بڑے حوصلے سے کام لے کر اس نے شرفو اور نائیک دونوں کی فیلڈ پٹی اس کے زخم پر رکھ کر باندھ دی۔ نائیک بے بسی، جوش، غصے اور دکھ کے عالم میں اپنا سر اب تک کئی مرتبہ جھٹک چکا تھا۔

شرفو نے ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے جگری یار کی طرف دیکھتا رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ بولا۔ شیرو بھائی! اس مرتبہ میں تمہیں نہیں جیتنے دوں گا۔'' اس نے رک رک کر کہا اور تھوڑا سا کھانسا...... ''پانی......!'' اس کے منہ سے نکلا۔

نائیک نے اپنی بوتل اس کے منہ سے لگادی۔ شرفو نے دو تین گھونٹ پی کر بوتل پرے ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ گولیاں ان کے گرد اگرد انگاروں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ شیرو نے دوبارہ اسے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ بمشکل چند گز چلنے کے بعد ہی اس نے شرفو کی کراہ سنی۔

''مجھے ذرا لٹادو۔'' اس نے بڑی مشکل سے شیرو تک اپنی آواز پہنچائی۔

شیرو نے اسے ایک قدرے ہموار جگہ پر لٹا تھا۔ شیرو نے محسوس کیا کہ اس کا نائیک رونے لگا تھا۔ وہ ان سے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''شیرو! میرے بھائی! تم نے...... ایک روز...... تین امانتیں مجھے سونپی تھیں...... افسوس میں تمہاری ماں اور چاچا کو نہ بچا سکا مگر...... آج میں...... تین امانتیں تمہیں سونپتا ہوں...... شیرو! پانی۔''

پتھر کے انسان نے بوتل کھول کر اس کے منہ میں دو گھونٹ ٹپکا دیئے۔

''شیرو......!'' شرفو نے درد سے کراہتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''میں نے تم سے بہت باتیں کرنی تھیں۔ شاید ہماری قسمت میں اتنا ہی ملاپ لکھا تھا...... شیرو...... 47ء میں ہم اکیلے تھے، منتشر ہو کر لڑ رہے تھے۔ تب ہماری کوئی پہچان نہیں تھی...... مگر آج ہماری ایک پہچان ہے۔ ہم پاکستانی فوج کے سپاہی ہیں...... ہمارا گھر پاکستان ہے...... یہی ہے وہ گھر جہاں ہمیں امان میسر آ سکتی ہے۔ شیرو میرے بھائی! کشمیر کی پہاڑیوں سے نکلنے والے تمام دریاؤں اور ندی نالوں نے بالآخر یہیں اکٹھے ہونا ہے...... میری سانسیں ٹوٹ رہی ہیں شیرو...... وقت مختصر ہوتا جا رہا ہے...... خدا کے لیے یہ کبھی نہ بھولنا۔ اگر ہمارا یہ آخری حصار بھی ٹوٹ گیا تو روئے زمین پر ہمیں کوئی پناہ گاہ میسر نہیں آئے گی۔

شیرو! میری لاش کو اسی مقدس سرزمین میں پہنچانا جس کے لیے ہمارے اجداد اور ہم خون بہاتے آئے ہیں...... مجھے...... مجھے پاکستان پہنچا دو پاکستان...... شیرو...... اللہ...... پاکستان کو اپنی امان میں رکھنا......!''

اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اس کے بعد اس کے لب تو ہلتے رہے، مگر ان سے آواز نہ ابھری۔ شاید وہ قرآنی آیات پڑھ رہا تھا، پھر اس کے لب ساکت ہو گئے۔

نائیک بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا اس پر جھک گیا۔ شیرو نے ایک لمحے کے لیے اس کی ویران آنکھوں میں جھانکا، پھر کانپتی انگلیوں سے اس کے پپوٹے بند کر دیئے۔ شدت ضبط سے اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

فائرنگ اب اور تیز ہونے لگی تھی۔ اس نے سسکیاں لیتے نائیک کو کچھ کہنا چاہا، لیکن اس کا گلا رندھ گیا۔ اپنی ساری توانائیاں سمیٹ کر اس نے شرفو کو دوبارہ اپنے کندھے پر لادا اور چل دیا۔

اسے اپنے گرد اگرد والی فائرنگ کی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ بس وہ چپ چاپ چلتا رہا...... چلتا رہا۔ اس کے پیچھے ابھی تک نائیک کی کوئی نہ کوئی ہچکی ضرور سنائی دیتی تھی لیکن وہ ماحول سے بالکل بے نیاز چلتا رہا۔ کئی مرتبہ چلتے چلتے نائیک اس کے سامنے آ کر رک جاتا۔ ''ہم کو بتاؤ جوان ہم ادھر کیا بولے گا۔ ہمارا صاحب بھی نہیں رہا۔ ہمارا کپتان صاحب بھی ہم سے روٹھ گیا۔ سب اپنا ڈیوٹی پورا کر گیا۔ ہم کو بولو جوان۔ ہمارا ڈیوٹی کب پورا ہو گا۔ ادھر اپنا کمپنی والوں کو کیا بولے گا...... کیا بتائے گا۔ ہم کو بتاؤ جوان۔ ''بٹ مالو'' کے شہیدوں کی روحیں ہمیں کب چین کا نیند سونے دیں گے۔ ہم کو بتاؤ جوان...... ہم کو بولو!''

اور...... جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔

شیرو ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر کسی سحر زدہ معمول کی طرح چلنے لگتا۔ فائرنگ کی آوازیں اب کم ہوتے ہوتے دم توڑنے لگی تھیں، شاید انہوں نے ''حساس علاقہ'' پار کر لیا تھا۔

نائیک اب اس کی منتیں کر رہا تھا کہ وہ اپنا ''کپتان صاحب'' کی لاش خود اٹھا کر لے جائے گا، لیکن شیرو تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔

سرحد سے بمشکل چند گز دور فائرنگ پھر اچانک تیز ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر ان کی آنکھیں چکا چوند ہوئیں۔ ''ہالٹ...... ہالٹ!'' کی للکاریں گونجیں، لیکن...... وہ چلتا رہا، کسی سحر زدہ معمول کی طرح...... اپنی پناہ گاہ کی طرف بڑھتا رہا۔

اسے اپنے گرد اگرد ٹھائیں ٹھائیں کرتی گولیوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کے محسوسات کو تو شرفو کی موت کے ساتھ ہی موت آ گئی تھی۔ بس اچانک ہی اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگ میں انگارہ سا دھنس گیا ہو۔

لیکن...... وہ رکنے کو تیار نہ تھا۔

اس کے پیچھے چلنے والا نائیک پاگلوں کی طرح اپنے پوچ سے ہینڈ گرنیڈ نکال نکال کر پھینک رہا تھا۔ گرنیڈ پھٹنے سے زیادہ اونچی آواز میں اس کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دشمن کو کبھی جنونیوں کی طرح گالیاں دینے لگتا، کبھی زور زور سے نعرے مارنے لگتا۔

شیرو کے لیے اب قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں گھس آنے والی آگ اب اس کے خون کی گردش کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی سارے جسم میں گھوم رہی تھی، پھر اچانک اس کے سامنے فائرنگ ہونے لگی۔ شاید کسی پاکستانی او۔ پی نے اسے گھیرے میں دیکھ لیا تھا اور اب پاکستانی جوان اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے کورنگ فائر دے رہے تھے۔

...... وہ اچانک ہی لڑکھڑایا اور پہلو کے بل گر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی اس نے یہ احتیاط برتی تھی کہ اس کے کیپٹن اشرف خان کی لاش کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

اور پھر کچھ سائے پاکستانی سرحد سے اسے اپنی طرف بھاگتے نظر آئے۔ شاید وہ اپنے ان ساتھیوں کو بچانے کے لیے جہنم میں کود گئے تھے۔

تمام احتیاطوں پر لعنت بھیج کر......!

اس نے ایک سائے کو خود پر جھکتے دیکھا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

اس کی سماعت سے آخری آواز اسی نائیک کی ٹکرائی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے...... میں ان کافروں کو مار ڈالوں گا۔ میرے صاحب کو مار ڈالا۔ میرا سب سنگی ادھر سری نگر میں رہ گیا...... میں واپس نہیں جاؤں گا...... چھوڑ دو مجھے...... اللہ اکبر...... یا علی...... اللہ اکبر...... یا علی۔'' اس کے ساتھ ہی شیرو کی تمام حسیات کو موت آ گئی۔ پھر اسے ہوش ایک فوجی ہسپتال میں آیا تھا۔

مظفر آباد کے اس قصبے میں جب شیرو نے ویگن سے نیچے قدم رکھا تو اس وقت شام اس بستی میں اترنے لگی تھی۔ اسے ہسپتال سے قریباً ایک ماہ بعد صحت یابی پر رخصت ملی تھی۔ وہاں موجود ہر فوجی کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ کیپٹن اشرف خان شہید کو ہلال جرأت سے نوازا جا چکا تھا۔ ملک کی گراں قدر خدمات پر شیرو کے لیے ہر آنکھ میں احترام کے جذبات موجزن تھے۔ وہ لوگ اس کی ہر طرح خدمت کیلئے حاضر تھے،

لیکن شیرو نے ان سے کچھ نہ لیا، کچھ نہ کہا۔ بس کبھی کبھی کوئی بڑا افسر اس سے دوستانہ ماحول میں انٹرویو کرنے آجاتا تو وہ اسے پچھلے ڈیڑھ ماہ کی کارروائی لکھانے لگتا ورنہ سارا دن بستر پر لیٹے چھت کو گھورتا رہتا۔ اس کے تمام پرانے رفقاء اس سے ملنے آچکے تھے۔ فوجی جیپ اسے منزل مقصود تک چھوڑنے کے لیے تیار کھڑی تھی، لیکن اس نے ان لوگوں کی پیشکش قبول نہ کی۔

ویگن سے اتر کر وہ پیدل ایک طرف چلنے لگا۔ سورج اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس نے اب سرخ آگ کے گولے کا روپ دھار کر ماحول کو لہورنگ بنانا شروع کر دیا تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر لگے درختوں کی سرگوشیاں بڑی واضح اسے سنائی دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ رینگنے والی ہوا نے موسم کی خنکی اور ٹھنڈک میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ گرم چادر اس کے کندھے پر دھری تھی، لیکن اس نے اسے کندھے پر پھیلانے کا تکلف نہ کیا۔ ٹھنڈی ہوا میں وہ خاصا سکون محسوس کر رہا تھا۔

آبادی کے ایک کونے میں بنے مکان کی دہلیز سے لگی زہراں اور بوڑھے نور ولی کی بیوی نے اکٹھے ہی اس سمت دیکھا تھا۔ ''یہ شیرو ہے...... شیرو ہے زہراں...... میں بچوں کو بتاتی ہوں'' کہہ کر وہ بچوں کو آوازیں دیتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ شیرو سے ہسپتال میں مل چکی تھی۔

مکان کے دروازے کے باہر دو بچے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات لیے ''اجنبی چاچا'' کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر شیرو رک گیا۔ اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ دونوں بچوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہلے وہ جھجکے، لیکن پھر دونوں ایک ساتھ ہی دوڑتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سمٹ گئے۔

باپ کی وفات کے بعد سے وہ لاشعوری طور پر جو ایک خلا محسوس کرنے لگے تھے، ان بانہوں میں سمٹ کر انہیں اپنا ادھورا پن مکمل ہوتا محسوس ہوا۔ جیسے وہ کسی پناہ گاہ میں پہنچ چکے ہوں۔ شیرو کی چھاتی سے چمٹے ہوئے دونوں بچے نہ دیکھ سکے تھے کہ اس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔ وہ بڑے نامحسوس طریقے سے اس نے دونوں ہاتھوں کو الٹا کر کے بچوں کو سینے سے چمٹائے اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔

''تم بالآخر آ ہی گئے شیرو۔'' دروازے پر کھڑی زہراں آہستہ سے بڑبڑائی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

ساتھ والے مکان میں چلنے والے ریڈیو کی آواز خاصی بلند تھی۔ بہت سے لوگ کورس کی شکل میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔

وطن ہمارا آزاد کشمیر...... وطن ہمارا آزاد کشمیر۔

...........☆☆☆...........

ختم شد

...........☆☆☆...........